بُکل دے وچ چور
نجیبہ عارف

بکّل دے وچ چور

ممتاز مفتی کے متصوفانہ افسانے

انتخاب و تجزیہ

نجیبہ عارف

891.439301 Najeeba Arif
Bukal Day Wich Chor/ Najeeba
Arif.- Lahore: Al-Faisal Nashran, 2012.
217p.

1. Urdu Adab - Afsanay 1. Title.

ISBN 969-503-846-8

جنوری 2012ء
محمد فیصل نے
آر۔آر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔
قیمت:-/300 روپے

AL-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore, Pakistan
Phone: 042-7230777 & 042-7231387
http: www.alfaisalpublishers.com
e.mail: alfaisalpublisher@yahoo.com

ہر اس ''ایلی'' کے نام

جو بالآخر ''الکھ نگری'' پہنچ کر دم لیتا ہے!

فہرست

تعارف و تجزیہ

منتخب افسانے (ممتاز مفتی)

-☆-

تم کہاں کے صوفی تھے؟ کس طرح کے بابا تھے؟

ممتاز مفتی کے متصوفانہ افسانوں کا انتخاب کرتے ہوئے ،ان کے نقادوں کے اٹھائے ہوئے سوال بل کر اعتراضات بار بار دامن گیر ہوتے رہے۔

کیا ممتاز مفتی کا تصوف سے کوئی تعلق تھا؟

کیا انھیں متصوفانہ افسانے لکھنے کا حق حاصل تھا؟

کیا ممتاز مفتی صوفی تھے؟

اگر صوفی تھے تو کس قسم کے صوفی؟

علی پور کے ''ایلی'' کا تصوف سے کیا رشتہ؟

زندگی بھر انھوں نے ایسا کیا کیا کہ انھیں تصوف کا نام لینے کی اجازت دی جائے؟

وہ ممتاز مفتی ،جنھیں آخری عمر میں بھی پاک رہنا نصیب نہ ہوا اور پیشاب کی نلکی اکثر و بیشتر ان کے جسم کے ساتھ لٹکی رہتی تھی ،

جنھوں نے فرائیڈ اور ہیولاک ایلس کو امام بنایا اور 'بدمعاش' عورتوں کی کہانیاں لکھیں ، جو ایک بیوروکریٹ قدرت اللہ شہاب کے چمچے تھے اور ان کی خوشامد کر کے مراعات حاصل کرنے کے چکر میں انھیں پیر بنا چکے تھے ،

جنھوں نے پڑھے لکھے لوگوں کو پیروں فقیروں کی کرامات اور بے معنی باتوں کے جادو کا اسیر بنانے کی کوشش کی ،

جو حج کے سفرنامے میں خانہ کعبہ کو کالا کوٹھا لکھ کر اس کی توہین کے مرتکب ہوئے ،

جنھوں نے ایسے پاکستان کی آنے والی عظمت کے گن گائے ، جو دہشت گردی کا گڑھ

اور بے ایمانی، بداخلاقی اور بدعنوانی میں اپنی مثال آپ بن رہا تھا؟
ان میں آخر کون سی ایسی خوبی تھی کہ انھیں متصوفانہ افسانوں کا خالق تسلیم کیا جائے؟
دوسرا ڈر ادبی نقادوں کا تھا جو کہتے ہیں، ذاتی زندگی کچھ بھی ہو، کوئی مولوی ہو یا ملنگ، فری میسن ہو یا چشتیہ قادریہ، ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ ممتاز مفتی نے ادب میں کیا کیا۔
تو چلو ہم مان لیتے ہیں کہ وہ ایک اعلیٰ افسانہ نگار تھے۔
ان کی تحریروں میں ادبی چاشنی ہے،
ان کا ڈکشن بالکل تازہ اور منفرد ہے،
وہ کہانی بننے کے فن سے آشنا ہیں،
قاری کی دلچسپی کو ڈور کی طرح اپنی کہانی کے چرخے پر لپیٹ لیتے ہیں۔
انھوں نے اردو ادب کو کئی جاندار کہانیاں دیں،
علی پور کا ایلی جیسالازوال ناول دیا،
لبیک جیسی عجوبۂ روزگار کتاب دی، جس پر کفر کے فتوے بھی لگے اور جو آج تک اسلامی کتابوں کے خانے میں پڑی ملتی ہے،
سفرنامے لکھے اور دو کھری قسم کے خاکے بھی لکھے،
ان سب نکات پر تو بات ہوسکتی ہے مگر ممتاز مفتی اور تصوف؟
یہ کیا طرفہ تماشا ہے۔ نہیں نہیں! ہمیں یہ منظور نہیں۔
کچھ سنجیدہ اور ثقہ لوگوں نے البتہ تحمل کا ثبوت دیا اور نہایت خلوص، سنجیدگی اور مروت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سمجھایا: "دیکھو، پہلے تمھیں یہ دیکھنا چاہیے کہ تصوف کیا ہے؟ اس کی شرائط کیا ہیں؟ اس کے احوال کیا ہیں؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ پھر دیکھو کہ ممتاز مفتی کے افسانے اس معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں؟"
بات معقول تھی، دل کو لگی اور میں مطالعے کے ذریعے تصوف کو جاننے کی کوشش میں کھو گئی۔ مشرق و مغرب میں تصوف پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس انبار سے انتخاب کرنا بھی امر محال ہے۔ اسلامی ادب میں تصوف کی پانچ بڑی کتابیں ہیں جنھیں امہات الکتب سمجھا جاتا ہے۔ (کتاب اللمع، ۲۰۰۶، ص ۱) یہ شیخ ابونصر سراج طوسی (م۔ ۳۷۸/۹۸۷) کی کتاب اللمع سید علی بن عثمان ہجویری (م۔ ۲۔۳۔۱۰۷۲/۴۶۵) کی کشف المحجوب، امام ابوالقاسم القشیری (م۔ ۲۔۳۔۱۰۷۲/۴۶۵) کی الرسالۃ

القشیریة، شیخ عبدالقادر جیلانی (م۔۱۱۶۶/۵۶۱) کی فتوح الغیب اور شیخ شہاب الدین سہروردی (م۔۵۔۱۲۳۴/۶۳۲) کی عوارف المعارف ہیں۔

مغرب میں بھی تصوف کے مطالعات کی ایک لہر انیسویں صدی میں ابھری اور بیسویں صدی تک اس میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اس دوران ایولن انڈر ہل (۱۸۷۵۔۱۹۴۱)، لوئی میسنوں (۱۸۸۳۔۱۹۶۲)، آر۔ اے۔ نکلسن (۱۸۶۸۔۱۹۴۵ء)، اے۔ جے۔ آربری (۱۹۰۵۔۱۹۶۹)، توشی کوازت سو (۱۹۱۴۔۱۹۹۳)، این میری شمل (۱۹۲۲۔۲۰۰۳)، مارٹن لنگز (۱۹۰۹۔۲۰۰۵) اور ولیم چٹک زیادہ معروف ہوئے۔

مذہب سے بے نیازی اور سیکولر ازم کے غلبے کے باوجود، مغرب میں صوفی ازم کی مقبولیت کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتی جا رہی ہے[1] اور تصوف کے بنیادی ماخذ کو انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں میں ترجمہ کرنے کا رجحان روز افزوں ہے۔ پوسٹ ماڈرن دور کی روحانیت (spirituality)، جسے بعض لوگ مذہب کی نشاۃ ثانیہ بھی کہتے ہیں، ایک علیحدہ دائرۂ فکر متعین کرتی ہے۔ انٹرنیٹ پر اس ڈسکورس تک رسائی کے لیے ہزاروں لنک میسر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اکیسویں صدی کی ابتدا ہی سے، بل کہ اس سے بھی کچھ پہلے، مغرب میں ''صوفی ازم'' میں دلچسپی کی جو ایک نئی لہر پیدا ہوئی ہے اس نے ہم اہلِ مشرق کو بھی کچھ چونکا سا دیا ہے اور ہمارے ہاں اس ''تحریکِ احیائے تصوف'' کے دو طرح کے ردِعمل سامنے آئے ہیں۔ ایک منفی اور دوسرا مثبت۔ یہاں منفی اور مثبت کی اصطلاحات کچھ اضافی سی معلوم ہوتی ہیں، یعنی یہ ردِعمل اپنی ذات میں، مطلق طور پر، مثبت یا منفی نہیں بل کہ اثبات و انکار کا تعلق خود اس قضیے کے رد و قبول سے ہے۔

منفی سے مراد یہ ہے کہ دانشوروں، اور پڑھے لکھے افراد کا ایک گروہ اسے جھٹلاتا اور مغربی استعمار کی ایک سازش قرار دیتا ہے جو ایک طرح سے دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے رجحان سے نمٹنے کی ایک سیاسی چال سے زیادہ کچھ نہیں اور جس کا مقصد یہ ہے کہ پہلے سے پسماندہ مسلمان اقوام کو تصوف کی ''حشیش'' میں مست چھوڑ دیا جائے تا کہ ان کے تمام قدرتی وسائل پر مغرب بلا خوف و خطر قابض ہو سکے۔ چنانچہ یہ طبقہ اس چال کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے، جوش و خروش سے تصوف کو انسانی معاشروں کی ترقی اور روشن خیالی کے لیے زہرِ قاتل قرار دیتا ہے اور سائنس و ٹیکنالوجی کے حصول کے ذریعے معاشی خود مختاری اور مادی ترقی کو معاشرے کی بقا کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ اس طبقے کے طرزِ فکر کی بنیاد، مغربی نشاۃ ثانیہ اور اس کے بعد

یہ سوچ ہے کہ انسانی ترقی کا راز خارجی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کائنات کی تسخیر میں پوشیدہ ہے اور جتنے زیادہ وسائل پر وہ قابض ہو سکتا ہے، دوسرے لفظوں میں جتنی زیادہ اشیا کا مالک بن سکتا ہے، اتنا ہی کامیاب انسان ہے۔ گزشتہ تین چار صدیوں کے دوران دنیا بھر پر مغرب کی سیاسی برتری اور حصول اس کا بین ثبوت ہے کیوں کہ انھوں نے یہ حیثیت صرف اور صرف سائنس اور ٹیکنالوجی میں برتری کے ذریعے اور جدید ترین مشینوں کی مدد سے حاصل کی ہے۔ پچھلی تین صدیوں میں علم کا رخ زیادہ تر خارجی کائنات کے اسرار و رموز کی جانب رہا۔ اگرچہ نفس انسانی اور تاریخ انسانی کے متعلق بھی کچھ نظریات وضع ہوئے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر وجود کی سطح تک محدود رہے ہیں۔ چوں کہ مغرب کو اس دوران باقی دنیا پر سیاسی و معاشی اعتبار سے برتری حاصل رہی ہے، اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان معلوم ہوتا ہے کہ کامیابی مال و زر کی کثرت اور سیاسی غلبے کا نام ہے اور اس کے حصول کے لیے پہلے سے کامیاب افراد و اقوام کی راہ پر چلنا عین دانش اور فطرت کا تقاضا ہے۔ اس طبقے کا یہ طرز فکر دراصل نیک نیتی پر مبنی ہے۔ اپنی قوم کی بدحالی، مفلسی، کمزوری اور انتشار زدگی انھیں ملول کرتی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اقوام عالم کی صف میں انھیں بھی وہی مقام حاصل ہو جائے جو دیگر ترقی یافتہ اقوام کو حاصل ہے اور اس کے لیے وہی راستہ سب سے مناسب ہوگا جس پر چل کر دیگر اقوام یہاں تک پہنچی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''صوفی ازم'' اور روحانیت انھیں بھرے پیٹ کے چونچلے معلوم ہوتے ہیں جو انسان کو خوش حالی کی جدوجہد سے بھٹکا کر کسی نامعلوم منزل کی طرف دھکیل دیتے ہیں اور ان کی مثال اس پرجوش نوجوان کی سی معلوم ہوتی ہے جو ایک چلتے ہوئے ٹرک کی بتی کو اپنی منزل مقصود سمجھ کر سرپٹ اس کی طرف بھاگتا ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر، اس کے برعکس اور ان معنوں میں مثبت ہے کہ وہ مغرب سے آنے والی اس نئی لہر کو خوش آمدید کہتا ہے۔ تاہم یہ خیر مقدم کسی فکری دریافت کا نتیجہ نہیں بل کہ اس عادت کا نتیجہ ہے، جس کے تحت یہ طبقہ پہلے بھی تمام مغربی افکار و نظریات کو محض اس بنا پر قبول کرتا آیا ہے کہ انھیں اہل مغرب نے قبول کر کے اپنا رکھا تھا۔ اس طبقے میں، صدیوں کی غلامی نے، جو پہلے ملوکیت اور پھر نو آبادیاتی صورت حال کا نتیجہ تھی، جرئتِ فکر اور تخلیقی سوچ کے سرچشمے خشک کر دیے ہیں چناں چہ وہ مغرب کی جانب سے چلنے والی ہوا کے ہر جھونکے سے اپنے مشامِ جاں کو معطر کرنے کا آرزومند ہے۔ یہ طبقہ علم، ادب اور سماجیات، غرض ہر شعبے میں موجود ہے اور محض مغرب سے مرعوبیت کے باعث، خود کو ایک مرتبہ پھر ''صوفی ازم'' سے

وابستہ دیکھنے میں فخر و مسرت محسوس کرتا ہے اور ان تمام سرگرمیوں کے احیا میں مصروف، بل کہ یہ کہنا چاہیے کہ ان تک محدود ہے، جو متروک ہو چکی تھیں، مثلاً محافلِ سماع کا انعقاد یا صوفیانہ شاعری اور ادب سے دلچسپی کا اظہار وغیرہ وغیرہ۔

ردِعمل کی ان دونوں لہروں سے ہٹ کر ایک تیسرا طبقہ بھی ہے جو تعداد میں کم اور خاموش طبع ہے۔ اس طبقے کا طرزِ فکر و عمل، حالیہ مغربی دلچسپی کی لہر سے پہلے بھی تصوف سے وابستہ رہا ہے مگر یہ طبقہ نہ پہلے بھی بلند آہنگ نعرے بازی اور تحریک بازی کے نفسیاتی حربے آزمانے کا قائل رہا تھا، نہ اب ہے۔ اس کے لیے تصوف کسی معاشی یا سیاسی نصب العین کا نام نہیں، بل کہ چیزے دیگر است۔ اس طبقے میں بھی اپنے طرزِ فکر کو وسعت دینے کا کام ہوتا ہے مگر اس کا طریق کار مختلف ہے۔

تصوف اور ہمارے ذہنی تحفظات

مشرقی ممالک اپنے نوآبادیاتی عہدِ حکومت میں جس سیاسی و معاشرتی صورتِ حال سے دوچار ہوئے تھے، اس کے ردِعمل کے طور پر ان ممالک میں جو اصلاحی تحریکیں نمودار ہوئیں وہ زیادہ تر تصوف مخالف، عقلیت پسندی کے رجحان کی نمائندہ تھیں۔ ان تحریکوں کے نمایاں ترین اثرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم نے اشیا، تصورات یا نظریات کے بارے میں جاننے کا ایک عقلی اور معروضی طریقہ کار وضع کر لیا ہے۔ یہ طریق کار بنیادی طور پر جدید علمی یا سائنسی طریق کار سے ماخوذ ہے۔ سائنسی طریقہ یہ ہے کہ جب کسی شے کے بارے میں علم حاصل کرنا چاہیں تو اسے اجزا میں تقسیم کر لیں۔ پھر ہر ایک جزو کا علیحدہ علیحدہ تجزیہ و مطالعہ کریں اور ان تمام تجزیات و مطالعات کی بنا پر اس شے کے بارے میں کوئی حکم صادر کر دیں۔ اس طریق کار کو تخصیصی طریق کار یا Specialization کہتے ہیں۔ اس کا عملی مظاہرہ ہم ہر روز اپنے اردگرد دیکھتے ہیں۔ مثلاً علمِ طب میں سپیشلائزیشن کا کمال یہ ہے کہ معدے کا ڈاکٹر دل کا علاج نہیں کر سکتا اور دل کا ماہر، دماغ کی گتھی سے واقف نہیں۔ اسی طرح ادب میں بھی سپیشلائزیشن کا مرض کسی متعدی بخار کی طرح پھیل رہا ہے۔ چناں چہ، ادب کو، جو ایک نامیاتی کل ہے، مجموعی طور پر دیکھنے، جاننے اور سمجھنے کی بجائے، اس کے کسی ایک پہلو کو انفرادی طور پر تحقیق کا موضوع بنانے کا رجحان پھیل رہا ہے اور پی ایچ ڈی یا ایم فل کی سطح کے تحقیقی مقالوں کی صورت یہ ہے کہ ڈیڑھ دو سو صفحات پر مشتمل ناول کے کسی ایک فنی پہلو یا تکنیک پر پورا مقالہ

لکھ دیا جاتا ہے جس کے بعد محقق اس خاص تکنیک سے تو شاید واقف ہو جاتا ہو، لیکن ادب کے مجموعی فہم، قدر پیمائی اور لطف سے بے بہرہ ہی رہتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمارے پاس پورے متخصص (سپیشلسٹ) لیکن ادھورے انسان کثرت سے موجود ہیں۔ اس صورت حال کو ایک معاصر امریکی دانش ور پروفیسر ولیم پنک نے اپنی ایک کتاب میں اس طرح بیان کیا ہے:

> مغرب کی فکری تاریخ متضاد رجحانات سے مملو ہے۔ اگرچہ قرونِ وسطیٰ میں وحدت پیدا کرنے والی فکر کا غلبہ تھا لیکن اس کے بعد سے انتشار اور تکثیریت کا رجحان بڑھتا گیا۔ نشاۃ ثانیہ کا انسان، بیک وقت سائنس کے تمام شعبوں سے واقف، اور ایک مجموعی بصیرت حاصل کرنے کا اہل تھا۔ لیکن آج کل ہر ایک شخص علم کے ایک محدود سے حصے کا ماہر ہوتا ہے اور اس کی معلومات میں اسی نسبت سے اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ باہمی فہم کے فقدان اور عالمی سطح پر عدم ہم آہنگی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اب ایک دوسرے کو سمجھنا اور مختلف شعبوں کے ماہرین کے درمیان حقیقی ابلاغ کی کوئی صورت پیدا کرنا ناممکن ہو چکا ہے۔ چوں کہ لوگوں کے پاس باہمی ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کرنے کے لیے کوئی مشترکہ اصول باقی نہیں رہے، اس لیے نتیجہ یہ ہے کہ مقاصد اور خداؤں کی کثرت ہو گئی ہے اور انتشار بڑھتا جا رہا ہے۔[۳]

اس کے ساتھ ساتھ ایک اور مسئلہ بھی ہماری توجہ کا محتاج ہے۔ جدید عہد، خاص طور پر بیسویں صدی میں جہاں لسانیات کے علم نے بہت ترقی کر لی ہے اور ساختیات، پس ساختیات اور ردِ تشکیل جیسے نظریات نے الفاظ کی حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دی ہے وہاں یہ بھی ہوا ہے کہ سماجی مطالعات میں مخصوص الفاظ و اصطلاحات کا استعمال ضروری سمجھا جانے لگا ہے جن کے متعین اور قطعی معنی معلوم نہیں کیے جا سکتے بلکہ وہ ایک سیال تصور کی طرح سیاق و سباق کے ساتھ ساتھ نئے نئے مفاہیم میں ڈھلتی جاتی ہیں اور بیک وقت مختلف بل کہ بعض اوقات متضاد مفاہیم کی حامل بھی ہوتی ہیں۔ ایک جرمن دانش ور اور ماہر لسانیات Uwe Poerksen نے اپنی کتاب میں اس صورت حال کو ایک خطرناک رجحان قرار دیا ہے اور اس کی مثال میں اس نے Progress, Education, Information, Development, جیسے بظاہر بے ضرر الفاظ کا ذکر کیا ہے جنھیں سیاست دان، کارپوریٹ ملازمین، پروفیسر اور منصوبہ ساز افراد اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنی تحریر و تقریر میں اس طرح استعمال کرتے

ہیں جیسے بچوں کے مقبول کھیل "Lego" میں پلاسٹک کے چند ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر بالکل مختلف
شکلیں بنائی جاتی ہیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان الفاظ نے انسانی فکر کو اپنا مطیع و غلام بنالیا ہے اور
معنی کو محدود کر رکھا ہے۔

تصوف کو سمجھنے کی راہ میں یہ دونوں مسائل حائل ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو دین اور دنیا،
دل اور دماغ اور ظاہر و باطن کی ثنویت کے عادی ذہن کے لیے اسے کسی ایک خانے میں رکھ کر
سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے اس لیے کہ تصوف کا تعلق کسی ایک پہلو یا کسی ایک شعبے سے نہیں۔ یہ
انسان کی پوری زندگی کی فضا اور ماحول کو محیط ہے۔ یہاں تک کہ من و تو کی دوئی بھی مٹا ڈالنے
کی تمنا کا نام ہے۔ اس کلیت کو جس پہلو سے بھی دیکھیں گے وہ پوری نظر نہیں آئے گی بل کہ
محض ایک زاویۂ نظر کی حامل ہو گی۔ دوسری طرف الفاظ و اصطلاحات کا ایک سیل بے پناہ ہے
جو تفہیم کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے اور طالب علم اس چیستاں میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ یہ مشکل
اور بھی بڑھ جاتی ہے اگر اس طالب علم کی دلچسپی کی نوعیت محض تکنیکی اور تحقیقی قسم کی ہو یعنی وہ
تصوف کو دیگر علوم کی طرح ایک علم خیال کرتے ہوئے، اس کے این و آں سے واقف ہونا
چاہے اور مختلف صوفیا کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھ کر اس بارے میں حکم صادر کرنے کا خواہش مند
ہو، لیکن خود اس راہ میں قدم رکھنے اور اس کے نشیب و فراز سے گزرنے کا تجربہ تو کیا، خواہش
بھی نہ رکھتا ہو۔ پھر بھی اس کے لیے بھی رہنمائی کا ایک دروازہ تو کھلا ہی ہے اور وہ یہی کتابیں،
رسالے اور مقالے ہیں جو واقفانِ حال اور پیشرو محققین نے اس موضوع پر لکھ رکھے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تصوف کا تعلق دل و دماغ کی ان کیفیات و احوال سے ہے جنھیں
حواس خمسہ کی مدد سے جاننا یا سمجھنا ممکن نہیں۔ تصوف کی تفہیم میں سب سے بڑی رکاوٹ خود
تصوف کی ماہیت ہی رہی ہے۔ اس رکاوٹ کے دو پہلو ہیں۔ پہلا تو یہ کہ تصوف ایک تجربے کا
نام ہے۔ تجربہ بھی ان معنوں میں نہیں جن میں ہم عام روزمرہ زندگی میں لیتے ہیں، جیسے کھانا
کھانے کا تجربہ یا ٹھنڈا پانی پینے کا تجربہ یا درخت سے چھلانگ لگانے کا تجربہ۔ ان تمام افعال
میں انسانی وجود کی حرکت اور شمولیت لازم ہوتی ہے۔ تصوف ایک ایسا تجربہ ہے جس میں
انسان کی ذات کا جوہر شریک ہوتا ہے۔ اسے اس کا باطن کہہ لیں یا اس کی روح یا قلب۔ باطن،
روح اور قلب ایک دوسرے کے مترادف الفاظ نہیں ہیں اور راہِ سلوک میں یہ الگ الگ
مقامات کے حامل ہیں لیکن عامۃ الناس کی زبان میں ان سے انسان کا وہ پہلو مراد ہے جو
[illegible]

لیکن خواب میں پیش آنے والے تمام حالات و واقعات کو محسوس کر سکتا ہے۔ اسے درد یا مسرت کا ویسا ہی احساس ہوتا ہے جیسا حالت بیداری میں (البتہ خواب کے زمان و مکاں بیداری کے، یا حالتِ جسمانی کے زمان مکاں سے مختلف ہوتے ہیں)۔ مگر یہ تجربہ جسمانی وجود، اور حواس خمسہ کی حدود سے باہر ہوتا ہے۔

دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ اس تجربے کو بیان کرنے کے لیے جو وسیلہ استعمال میں آتا ہے، وہ ناقص ہے۔ یہ وسیلہ زبان ہے جو اپنے تمام تر کمال کے باوجود انسانی تجربات، احساسات اور جذبات کو بعینہ بیان نہیں کر سکتی۔ انتہائی خارجی نوعیت کے تجربات و کیفیات بھی، جن کا تعلق جسمانی وجود سے ہوتا ہے، زبان کے احاطۂ ابلاغ سے باہر ہی رہتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص اگر اپنڈکس کے درد کو بیان کرنا چاہے تو خواہ کتنا ہی بڑا ڈاکٹر ہو یا خود اس درد میں مبتلا زبان و بیان کا ماہر، درد کی کیفیت کو معروضی طور پر ٹھیک نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسے لازمی طور پر کسی استعارے یا تمثیل کا سہارا لینا پڑے گا جیسے سوئی چبھنے کا سا درد، کاٹنے والا درد، لہریں لیتا ہوا درد وغیرہ وغیرہ۔ اسی کیفیت کو کوئی دوسرا مریض کسی اور طرح، کسی اور تمثیل کی مدد سے بیان کرے گا۔ جب عام جسمانی تجربات کو بیان کرنے کے لیے زبان ناکافی اور ناقص محسوس ہوتی ہے تو ان تجربات کو بیان کرنے کے لیے جن کا تعلق جسم کے ٹھوس حقائق سے ماورا کسی تجریدی تجربے سے ہو، زبان کیسے کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تصوف کی ماہیت کو بیان کرنے کے لیے بلا تفریق تمام صوفیا نے تمثیل کا سہارا لیا ہے اور صوفیانہ واردات کو کبھی پرندوں اور جانوروں اور کبھی دیگر ٹھوس اشیا کی مدد سے، یا یوں کہیے ان کے پردے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ گویا تصوف پردے کی چیز ہے اور پردہ اٹھانے کا حق محرم کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ یہیں سے سارا مسئلہ جنم لیتا ہے۔ محرم تو پردہ اٹھا کر محوِ دیدار ہو جاتا ہے اور نامحرم اس انتظار میں رہتا ہے کہ کوئی اسے پردہ کے پیچھے کا احوال سنائے تاکہ وہ پردہ اٹھانے یا نہ اٹھانے کا فیصلہ کر سکے۔ تصوف دراصل اندر کی کہانی ہے۔ مگر اس کا تعلق اندر سے بھی ہے اور باہر سے بھی۔ یعنی اگرچہ یہ ایک باطنی تجربہ ہے مگر اس کے اثرات ظاہر پر بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ جیسے گرم چائے انڈیلنے سے پیالی بھی گرم ہو جاتی ہے یا شدید درد کے اثرات چہرے پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یوں یہ ظاہر اور باطن دونوں پر محیط ہے۔

لیکن یہ سوال کہ تصوف کیا ہے اور کیوں ہے، جوں کا توں ہمارے سامنے موجود ہے۔ البتہ تمثیل کی زبان میں بات کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ تصوف پردہ اٹھانے کی تربیت

ہے، اس کی ترغیب ہے اور اس کی ترکیب ہے۔ اب کون کتنا پردہ سرکا پاتا ہے یہ اس کے استاد، اور استعداد پر منحصر ہے۔ جتنا کوئی پردہ اٹھاتا ہے، اتنی ہی حقیقت اس پر روشن ہوتی ہے۔ یہاں اندھوں کے شہر میں ہاتھی والی تمثیل یاد آتی ہے۔ لیکن تمثیل سے ہٹ کر دیکھیں تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تصوف حقیقت کو دیکھنے کا نام ہے۔ رہا یہ سوال کہ حقیقت کیا ہے؟ تو یہ کوئی دیکھنے والا ہی بتا سکتا ہے اور وہ بھی اتنا ہی جتنا اس نے دیکھا۔ سب سے زیادہ جس نے دیکھا اس نے قاب توسین تک جا کر دیکھا اور یہی دید باقی دیکھنے والوں کی معراج بنی۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ تصوف کی کوئی ایک مسلمہ اور جامع و مانع تعریف نہیں کی جا سکتی۔ جن مستشرقین نے عربی کے بنیادی ماخذ کی مدد سے تصوف کو سمجھنے کی کوشش کی ہے انھوں نے اس کمی کی ایک وجہ عربوں کی لسانی عادات کو بھی ٹھہرایا ہے جنھیں الفاظ سے کھیلنا اور ایک ہی لفظ سے کئی مشتقات بنا کر اس کے معنی کی گہرائی میں کمی بیشی یا درجہ بندی کرنا پسند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین نے اس انداز بیان کو Poetico-Rhetorical کہا ہے[۵]۔ زبان کے اس مخصوص استعمال کے بارے میں، جو تاریخی طور پر تصوف سے منسوب روایات و تصورات کے اظہار کے لیے ہوتا رہا ہے، این میری شمل (۱۹۲۲-۲۰۰۳) اپنی ایک کتاب میں لکھتی ہیں:

> In interpreting Islamic mystical texts, one must not forget that many sayings to which we give a deep theological or philosophical meaning may have been intended to be suggestive wordplay; some of the definitions found in the classical texts may have been uttered by the Sufi Masters as a sort of ko'an, a paradox meant to shock the hearer, to kindle discussion, to perplex the logical faculties and thus to engender a non logical understanding of the real meaning of the word concerned, or of the mystical "state" or "stage" in question. The resolution of apparent contradictions in some of these sayings might be found, then, in an act of illumination. This is at least one possible explanation of the fact that the masters give many different answers to the same questions.[۶]

حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ محض عربوں کی لسانی عادات کا نہیں بل کہ موضوع کی پیچیدگی اور کثیر الجہتی کا ہے جس میں تمام تر تضادات اور نیرنگیاں اپنے امتیازات کھو بیٹھتی ہیں اور حقیقت کو کسی خاص شکل یا سانچے میں ڈھالنا ممکن نہیں رہتا۔ اس کے اظہار کے لیے زبان کا تخلیقی

استعمال لازمی ہو جاتا ہے اور اس استعمال کو اس کے سیاق و سباق میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ صوفی ادب میں ''تعبیر'' کا مسئلہ جو بعد کے صوفیا، خاص طور پر ابن عربی (۵۶۰ھ/۱۱۶۵ـ۶۳۸ھ/۱۲۴۰) کے معاملے میں بہت اہمیت رکھتا ہے، صوفیانہ متن کے اسی پہلو سے متعلق ہے۔

اس مشکل کو ایولن انڈر ہل نے ایک تمثیل کی مدد سے بیان کیا ہے:

All men at one time or another have fallen in love with the veiled Isis whom they call Truth. With most, this has been but a passing passion: they have early seen its hopelessness and turned to more practical things. But there are others who remain all their lives the devout lovers of reality; though the manner of their love, the visions which they make unto themselves of the beloved object, varies enormously. Some see Truth, as Dante saw Beatrice: a figure adorable; yet intangible, found in this world and yet revealing the next. To others she seems rather an evil yet an irresistible enchantress: enticing, demanding payment and betraying her lovers at the last. Some have seen her in a test tube and some in a poet's dream: some before the altar, others in the slime. The extreme pragmatists have even sought her in the kitchen: declaring that she may best be recognized by her utility. Last stage of all: the philosophic sceptic has comforted an unsuccessful courtship by assuring himself that his mistress is not really there.

Under whatsoever symbol, they may have objectified their quest, none of these seekers have ever been able to assure the world that they have found, seen face to face, the Reality behind the veil. But if we may trust the reports of the mystics--- and they are reports given with a strange accent of certainty and good faith--- they have succeeded where all these others have failed, in establishing immediate communication between the spirit of man, entangled as they declare amongst material things, and that "only Reality", that immaterial and final Being, which some philosophers call the Absolute, and most theologians call God. This, they say--- and here many who are not mystics agree with them---

is the hidden Truth which is the object of man's craving; the only satisfying goal of his quest.[۷]

اس اقتباس میں ایولن نے تصوف کو تلاشِ حقیقت قرار دیا ہے اور اس تلاش میں نکلنے والوں کے لیے ہزاروں لاکھوں راستوں کے امکانات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ بیشتر مغربی مفکرین کی توجہ اس بات پر مبذول رہی ہے کہ تلاشِ حقیقت کے اس سفر کی منزل مقصود کیا ہے؟ ایک صوفی، قطع نظر اس بات کے کہ لفظ ''صوفی'' کا مادہ ''صوف'' ہے یا ''صفا''، آخر کیا چاہتا ہے۔ نکلسن نے اس مسئلے کو اسلامی مآخذ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ایک انتہائی نجی صوفیانہ تجربے کو اس تلاش کا حاصل قرار دیا ہے۔ یہ تجربہ عشق ہے جس کے ذریعے وہ خدا کی بے کراں ذات سے ہم کنار ہوتا ہے[۸]۔ تاہم اسے Pantheism[۹] کے مماثل قرار دینے کی بجائے وہ اسے شخصی خدا کے تصور سے قریب ترین سمجھتے ہے[۱۰]۔ یہ خدا کی ایسی معرفت ہے جو خود کو خدا کی ذات میں ضم کر لینے اور فنا کے مقام سے گزرے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

قرونِ وسطیٰ کے معروف صوفی شاعر ابنِ فرید (۱۱۸۲ـ ۱۲۳۵) کی ایک نظم کے حوالے سے وہ اس تجربے کے تین مراحل بیان کرتے ہیں جنھیں صحو، سکر اور صحوِ ثانی کا نام دیا گیا ہے۔ پہلے مرحلے پر وہ ایک عام آدمی کے متنوع اور تغیر پذیر شعور کا حامل ہوتا ہے۔ دوسرے مرحلے پر وہ اس شعور سے بیگانہ ہو کر واصل ذاتِ خداوندی ہوتا ہے اور ایک گہرے انبساط کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے اور تیسرے مرحلے پر اس انبساط آفریں کیفیت کے نتیجے میں وہ ایک اعلیٰ و برتر مابعد الطبیعیاتی تجربے سے گزرتا ہے جس کے دوران خدا سے واصل رہ کر اس کا عرفان حاصل کرتا ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان موجود لامحدود فاصلے کو پاٹنے کی ہمت کسی انسان میں نہیں ہو سکتی۔ یہ کام صرف اور صرف خدا کی مرضی اور طاقت سے انجام پا سکتا ہے چنانچہ ایک صوفی یا سچے عاشق کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی مرضی کو مرضیِ الٰہی اور اپنی ذات کو ذاتِ خداوندی میں فنا کر دے اور وحدت کے اس بے کراں سمندر میں ڈوب کر ذاتِ الٰہی کا عرفان حاصل کرے۔ پہلے مرحلے پر صوفی کا شعورِ ذات موجود رہتا ہے اور وہ خود کو خدا سے علیحدہ، ایک فرد کی حیثیت سے شناخت کرتا ہے۔ دوسرے مرحلے پر خالق و مخلوق کے درمیان دوئی مٹ جاتی ہے اور عاشق یا صوفی کی اپنی ذات یا انفرادیت کا احساس فنا ہو جاتا ہے۔ تیسرے مرحلے پر اسے نہ صرف خدا کی ذات کا عرفان حاصل ہوتا ہے بلکہ خود اپنا بھی ایک نیا شعورِ ذات مل جاتا ہے اور وہ خالق و مخلوق کے درمیان تمیز کرتے ہوئے خود کو بندے اور

خدا کو معبود کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ یہ ''بقا'' کا مقام ہے۔ اس مرحلے پر صوفی اگرچہ خدائی صفات کا حامل ہو جاتا ہے مگر وہ خدا سے واصل ہونے کے باوجود اسے ایک برتر و فائق ہستی تصور کرتے ہوئے اس سے ایک شخصی تعلق قائم رکھتا ہے[۱۱]۔

اس کے شاگرد آربری نے، عربی ماخذ ہی کی بنیاد پر، تصوف کی حقیقت کو نزول قرآن یا وحی کے عمل سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسے خدا سے براہ راست کلام کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ صوفیا نے عشق الٰہی کی تکمیل کے لیے قرآن اور سیرت رسول کو مشعل راہ بنایا اور اسی نمونے پر تکمیل ذات کی کوشش کی[۱۲]۔

پروفیسر ولیم چٹک نے تصوف کی ماہیت کو حدیث جبریل کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اس حدیث قدسی سے عام طور پر لوگ واقف ہیں اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ جبریل علیہ السلام انسان کے روپ میں حضور اکرم ﷺ کی محفل میں تشریف لائے اور آپ ﷺ سے دین اسلام کے بارے میں چند سوال پوچھے۔ آپ ﷺ نے ان سوالوں کے جواب دیے جنھیں سن کر جبریل نے ان کی سچائی کی تصدیق کی[۱۳]۔ ولیم چٹک نے اس حدیث قدسی کی بنا پر اسلام کے تین اجزائے ترکیبی بیان کیے ہیں: اطاعت، ایمان اور احسان۔ بیرونی یا ظاہری سطح پر اسلام ایک نظام حیات ہے جو امر و نہی پر مشتمل ہے۔ یعنی انسان کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے، خیر کیا ہے اور شر کیا، درست کیا ہے اور غلط کیا؟ یہ گویا اسلام کا جسم ہے اور اصطلاح میں اسے شریعت کہتے ہیں جس کی بنیاد قرآن ہے۔ اس سے اگلی سطح ایمان کی ہے جس کا تعلق جسم سے نہیں ذہن سے ہے۔ اس سطح پر اسلام انسانوں کو معرفت عطا کرتا ہے اور کائنات اصغر و کائنات اکبر کی تفہیم سکھاتا ہے۔ عرفان ذات اور معرفت ذات الٰہی اس سطح پر انسان کا مطمح نظر قرار پاتی ہے۔ یہ الٰہیات کا میدان ہے۔ تیسری اور آخری سطح پر اسلام انسان کی قلب ماہیت کرنے کا نام ہے۔ اس سطح پر انسان اشیا کی حقیقت سے نہ صرف آشنا ہوتا ہے بلکہ ان سے ہم آہنگ بھی ہو جاتا ہے۔ گویا اسلام کی تکمیل نہ صرف عمل سے ہوتی ہے، نہ محض معرفت سے اور نہ دونوں سے۔ اسلام کی تکمیل ان دونوں اوصاف میں خود کو ڈھال لینے اور اپنی اصل فطرت کو پالینے سے ہوتی ہے۔ اس سطح پر عشق اور اخلاص کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کرنے یا سمجھنے کا نہیں، ''ہو جانے'' کا نام ہے۔ یہ تینوں منزلیں بالترتیب جسم، زبان اور قلب کا میدان ہیں۔ پہلی منزل شریعت کی ہے، اور یہ فقہا کا میدان ہے۔ دوسری منزل الٰہیات کی ہے اور یہ فلاسفہ اور متکلمین کا مقام ہے، تیسری منزل تکمیل ذات کی ہے اور یہ صوفیہ کا کام ہے[۱۴]۔

لیکن جب ہم مشرقی علما کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی توجہ اس آخری منزل سے زیادہ اس راستے پر مرکوز رہی ہے جس پر چل کر اس منزل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ چناں چہ انھوں نے راہِ سلوک کے آداب و شرائط کو بہت توجہ دی ہے اور اس آخری تجربے کے بیان و تجزیے کو کم۔ کشف المحجوب کے انتالیس ابواب میں اس صوفیانہ تجربے کے احوال اور تصوف کے نظری مباحث، چند صفحات سے زیادہ جگہ نہیں گھیرتے۔ یہی حال الرسالۃ القشیریہ اور کتاب اللمع فی التصوف کا ہے۔ ان صوفیا کی تصانیف کا اصل مقصد اپنے شاگردوں یا ارادت مندوں کی تربیت رہا ہے چناں چہ انھوں نے نظریاتی مباحث کو زیادہ قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ ان علما نے صوفی بننے کے لیے جن شرائط و مدارج کا ذکر کیا ہے ان سب کا تعلق انسانی فکر و ارادے کے ساتھ ساتھ اس کے اعمال و اشغال اور کردار و افعال سے ہے۔ صرف ابن عربی کے ہاں فلسفیانہ مباحث سب سے زیادہ ہیں۔ ان کی دو تصانیف، فتوحاتِ مکیہ (۱۲۳۸/۶۳۶) اور فصوص الحکم (۱۲۲۹/۶۲۷) اس ضمن میں خاص طور پر علما و صوفیا کی توجہ کا مرکز رہی ہیں۔ مگر انھوں نے بھی جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات کا نچوڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارٹن لنگز نے لکھا ہے:

> All doctrine is related to the mind but mystical doctrine, which corresponds to the lore of certainity, is a summons to the mind to transcend itself.[۱۵]

مشرقی اور مغربی علما کی تصوف پر تصانیف میں یہ فرق بہت نمایاں ہے کہ مشرقی علما، محض نقاد، شارح یا عالم نہیں تھے بلکہ خود بھی تصوف کے طریقے پر پوری طرح گامزن رہے تھے۔ ان سب کا شمار عظیم الشان صوفیا میں ہوتا ہے جو خود اس وارداتِ قلب سے گزرنے کے بعد مسندِ ارشاد پر فائز ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں جو کچھ بیان کیا ہے، وہ سنی سنائی پر مبنی نہیں بل کہ خود ان کا حال اور تجربہ ہے۔ وہ اس آگ سے گزرنے کے بعد اس کی شدت اور تپش کی کیفیت بیان کرنے کا استحقاق رکھتے ہیں جب کہ بیشتر مستشرقین اور خود ہم جیسے نقاد، محض مطالعے کے زور پر اس کیفیت کے اسرار و رموز کی تفہیم و تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے ان دونوں کے نتائج میں جو فرق ہو سکتا ہے، وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب اللمع کے مقدمے میں اس کے اردو مترجم اور محقق پیر محمد حسن لکھتے ہیں کہ کتاب میں بہت سی عبارتیں ایسی بھی ہیں جو نہایت دقیق ہیں اور انھیں صرف اہلِ حال ہی سمجھ سکتے ہیں۔[۱۶]

خود ہمارے ہاں کے بیشتر نقاد اور شارحین تصوف سے محض نظریاتی یا علمی نوعیت کی دلچسپی رکھتے ہیں اور یہ صورت حال کچھ نئی بھی نہیں۔ شیخ ابونصر سراج طوسی دسویں صدی میں لکھتے ہیں:

یاد رکھو، آج کل بہت سے لوگ اس گروہ کے علوم میں داخل ہو گئے ہیں اور ایسے لوگوں کی بھی کثرت ہو گئی ہے جو اپنی صورت اہل تصوف کی سی بنا لیتے ہیں اور (اپنی گفتگو کے دوران) اسی علم کی طرف اشارہ کرتے ہیں (اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں) جنھوں نے اہل تصوف اور تصوف کے مسائل سے متعلق بہت سے سوالات کے جوابات بھی دیے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص نے ایک آدھ کتاب بھی اپنی طرف منسوب کر رکھی ہے جسے انھوں نے خوب صورت الفاظ میں پیش کیا ہے۔ کچھ باتیں گھڑ لی ہیں اور کچھ جوابات بھی بنا رکھے ہیں۔ مگر یہ بات انھیں نہیں بھاتی کیوں کہ وہ قدیم صوفیاء اور مشائخ، جنھوں نے ان مسائل پر بحث کی ہے اور ان باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور حکمت کی باتیں انھوں نے کی ہیں، انھوں نے یہ سب کچھ تمام تعلقات منقطع کرنے، مجاہدات، ریاضت، منازلت، وجد، جلنے، پگھل کرنے اور ہر اس تعلق کو توڑنے کے بعد کیا ہے جو اللہ سے ایک لحظہ کے لیے بھی منقطع کر دے۔ انھوں نے پہلے اس علم کی شرائط کی پابندی کی، پھر اس پر عمل کیا۔ پھر عمل کرتے کرتے حقیقت تک پہنچے۔ چناں چہ ان میں تینوں باتیں پائی گئیں، علم، حقیقت اور عمل [۷]۔

ابن عربی نے بھی عالم اور عارف میں فرق بیان کیا ہے کیوں کہ متکلم یا محقق علم کو زائد از ذات سمجھتا ہے اور اہل اللہ صاحب کشف و وجدان علم کا منشا ذات کو گردانتا ہے اور یہیں سے دونوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے [۸]۔ اس بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تصوف کے مقام و منشا اور اس کے دائرۂ عمل کی وسعت اور گہرائی کو محض مطالعے یا تجزیے کی رو سے سمجھنا ممکن نہیں۔ نہ ہی ان اعمال پر ظاہری طور پر کاربند رہنا اس تجربے سے گزرنے کی ضمانت بن سکتا ہے، جن کا درس صوفیا نے اپنی کتابوں میں دیا ہے۔ باطنی طلب اور آرزو نہ صرف اعمال کی نوعیت و ماہیت پر شدت سے اثر انداز ہوتی ہے بل کہ خود بھی ایک عمل ہے [۹] اور باطن کا نظارہ کون کر سکتا ہے سوائے کسی روشن ضمیر کے۔ لہٰذا باطن پر حکم لگانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

ممتاز مفتی اور تصوف

سید علی ہجویری تصوف میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو تین مدارج میں تقسیم کرتے

ہیں: ایک صوفی، دوسرا متصوف اور تیسرا مستصوف۔ صوفی تو وہ ہے جو اپنے وجود سے فانی ہو کر باقی بالحق ہو جائے۔ متصوف وہ ہے جو اس درجے کی خواہش رکھتا ہو اور اسے پانے کی آرزو میں تکلف، مشقت اور مجاہدہ کرے، اور مستصوف وہ ہے جو دنیاوی مفادات اور اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے صوفیا کرام کے اعمال و افعال و کرامات کی نقل کرتا ہے اور ان کے اقوال دہراتا پھرتا ہے مگر خود بے خبر محض ہے۔[۲۲]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی شخص کے تصوف کے کسی درجے پر فائز ہونے کے بارے میں حکم صادر کرنے کا اختیار کس کو حاصل ہے؟ کون یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ فلاں شخص، صوفی ہے، متصوف ہے یا محض مستصوف ہے؟ اس مسئلے کے حل کے لیے اگر ہم دیگر علوم کی طرف رجوع کریں تو فوراً اس کا جواب مل جائے گا۔ یعنی کسی علم کے ماہرین یہ فیصلہ کریں گے کہ کوئی مبتدی یا طالب علم اس علم کے کس درجے پر فائز ہے؟ عمرانیات کے طالب علم کا علمی مقام معاشیات کا ماہر متعین نہیں کر سکتا اور فزکس کے طالب علم کی قابلیت جانچنا، لسانیات کے ماہر کے لیے ممکن نہ ہوگا بل کہ بالکل خلاف عقل سمجھا جائے گا، تو پھر ادبی نقادوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا کہ تصوف کو اپنے افسانوں کا موضوع بنانے کا حق کسے حاصل ہے اور کسے یہ جرأت کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے، کیوں کر ممکن ہے۔ لہٰذا یہ سوال تو بالکل بے معنی ہے کہ ممتاز مفتی نے، جو بعض نقادوں کی رائے میں اس کے اہل نہیں تھے، تصوف کو اپنے افسانوں کا موضوع کیوں بنایا۔ کسی عالم نقاد یا محقق کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی بھی انسان کو اس آرزو کے لیے نااہل قرار دے۔

البتہ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جو کچھ انھوں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا، کیا اس کا تعلق تصوف سے ہے یا نہیں؟ یعنی کیا ان کے افسانے کسی ایسی مابعد الطبیعیاتی جہت کے حامل ہیں جو ان کے معاصر معاشرے کو روحانیت کی طرف مائل کرنے کی اہل ہے؟ کیا ان افسانوں کی مجموعی فضا کسی ایسے نامعلوم خواب کا تعاقب کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو علائق دنیا سے پرے کسی اور بے نام منزل کا متلاشی ہے؟ کیا ان افسانوں کے بیانیے کا تعلق غیر شعوری طور پر انسان کی روحانی بالیدگی، یا کسی غیر مادی وجود سے نسبت پر قائم ہوتا ہے؟ کیا انھیں پڑھ کر عرفان ذات کی سمت قدم اٹھتا ہے؟ کیا یہ "میں" سے "تو" تک سفر کرنے پر مائل کرتے ہیں؟ کیا یہ انسان کو ذاتی اغراض اور عارضی لذات کے پس و پیش سے آگاہ کر کے ان سے بے نیاز ہو جانے کی ترغیب دیتے ہیں؟ کیا یہ انسانی نفس کے دھوکے اور فریب سے خبردار کرتے ہیں؟

پہلی نظر میں ممتاز مفتی کے افسانوی ادب کا جائزہ لینے سے اس میں ایک تدریجی ارتقا نظر آتا ہے۔ یعنی ابتدا میں انھوں نے جنس، نفسیات اور معاشرتی و تہذیبی اقدار کو اپنے فن کا موضوع بنایا، پھر ان کی توجہ روحانیت کی طرف مبذول ہوگئی اور انھوں نے تصوف سے دلچسپی کا اظہار کیا اور تیسرے مرحلے پر یہ دلچسپی قرآنی مطالعے میں بدل گئی اور وہ تصوف سے آگے بڑھ کر شریعت اسلامیہ کے وکیل بن گئے۔ یہاں ان کی زندگی کا سفر ختم ہوگیا ورنہ وہ اس موضوع پر اپنی کتاب "تلاش" کے بعد بھی کچھ لکھتے تو ان کے خیالات سے زیادہ واضح طور پر شناسائی ہو سکتی۔ لیکن یہ صرف پہلی نظر کا معاملہ ہے اور میں نے ممتاز مفتی کے فکری ارتقا پر یہ پہلی نظر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھتے ہوئے ڈالی تھی۔

اسی نظر کے نتیجے میں، جب میں نے ان کے ایسے افسانوں کا انتخاب کرنا چاہا جو تصوف سے متعلق ہوں تو مجھے یہ کام بہت آسان لگا اور میں نے اپنی ہی بنائی ہوئی زمانی تقسیم کے مطابق ان کے چھٹے افسانوی مجموعے روغنی پتلے سے افسانے منتخب کرنے شروع کیے اور آخری مجموعے کہی نہ جائے تک کا مطالعہ کر کے کل ۱۴ افسانے ایسے نکال لیے جنھیں میں "متصوفانہ" کی ذیل میں رکھ سکتی تھی۔ یہ انتخاب کرنے کے بعد میں اس کتاب کا مقدمہ لکھنے کی تیاری کرنے لگی اور تصوف پر لکھی گئی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔

اسی دوران کام کرتے کرتے یوں ہی مجھے خیال آیا کہ میں نے جو افسانے منتخب کیے ہیں، وہ اس بنیاد پر کیے ہیں کہ ان میں کوئی نہ کوئی ظاہری صوفیانہ علامت یا واضح صوفیانہ نظریہ پایا جاتا ہے۔ مجھے یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ وہ افسانے، جو بظاہر تصوف کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، کیا ان کے بطون میں کسی صوفیانہ کیفیات یا تجربے کی جھلک موجود ہے یا نہیں؟ ظاہری ہیئت میں نہیں تو خام مواد میں ہی سہی۔ یہ سوچ کر میں نے ممتاز مفتی کا پہلا افسانوی مجموعہ ان کہی (۱۹۴۳) اٹھایا اور ان کی کہانی "آپا" پڑھنی شروع کی۔ کہانی ختم ہونے کے بعد یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ "آپا" سراسر متصوفانہ کہانی ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ "آپا" دو تہذیبی ادوار کے تقابلی مطالعے پر مبنی ہے۔ 'آپا' قدیم، روایتی معاشرے کی نمائندہ ہے اور سا جو باجی جدید طرز زندگی کی دلدادہ۔ ممتاز مفتی نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ جدید طرز زندگی اگرچہ دلکش، رنگین اور پرکشش ہے مگر اس کی شوخی جلد ہی ماند پڑ جاتی ہے اور قدیم شعار زیست جو بظاہر پھیکا سا اور بے رنگ معلوم ہوتا ہے، تا دیر دلوں میں حرارت قائم رکھتا ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے نچلے متوسط طبقے کی روزمرہ زندگی سے

چند ایسی علامتیں منتخب کی ہیں جن کی مدد سے وہ اپنے نقطۂ نظر کو بہت کامیابی سے بیان کر پائے ہیں۔ ان میں سے مرکزی علامتیں دو ہیں: گوبر کا اپلا اور بجلی کا بلب۔ دونوں روشنی پیدا کرتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجلی کے بلب کی روشنی اپلے کی آگ سے نکلنے والی روشنی سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ نگاہوں کو چکا چوند کر دیتی ہے اور اس روشنی میں ہر چھپی ہوئی شے واضح نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن یہ روشنی ناقابلِ اعتبار ہے۔ جیسے بٹن دبا کر حاصل کی جا سکتی ہے، اسی طرح بٹن دبا کر، یا بغیر بٹن دبائے بھی، چلی جاتی ہے جس کے بعد اندھیرا اور گہرا ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اپلے کی آگ کی روشنی بہت مدھم اور ہلکی ہے۔ یہ منظر کو بالکل واضح نہیں کرتی بل کہ ہلکے ہلکے اندھیرے میں لپٹا رہنے دیتی ہے۔ اسرار کی دھند میں ملفوف ہو کر منظر اور بھی معنی خیز اور خیال انگیز ہو جاتا ہے۔ اب یہ محض خارجی منظر نہیں رہتا بلکہ اس میں ایک شدید داخلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ذات کا حصہ اور اس کی توسیعی صورت بن جاتا ہے۔ اس نیم اندھیرے نیم اجالے میں موجود اشیا محض روشنی کی مدد سے موجود نظر نہیں آتیں بلکہ دیکھنے والے کی قوتِ متخیلہ بھی سرگرم ہو جاتی ہے۔ یہ نیم اندھیرا انسان کی قوتِ تخلیق کو متحرک کرتا ہے۔ پھر اس روشنی میں حرارت بھی ہے۔ یہ ماحول کو محض روشن نہیں رکھتی، اس میں گرمی بھی پیدا کر سکتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس روشنی اور حرارت کو ایک بٹن دبا کر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ آگ بجھ جانے کے بعد بھی تا دیر سلگتی رہتی ہے۔

اپلے کی آگ کا یہ استعارہ جس تہذیبی قدر کی یاد دلاتا ہے، وہ محض قدیم ہونے کی بنا پر قابلِ تحسین نہیں ہے بل کہ اس کا رشتہ واضح طور پر ایک مابعد الطبیعیاتی ماحول سے جڑتا ہے۔ اس قدر کی تجسیم "آپا" کے کردار میں ہوتی ہے۔ وہی 'آپا' جس کے بارے میں حسن عسکری نے لکھا تھا: "آپا بہت پسند آئی لیکن از راہِ کرم کسی ساجو باجی کا پتا لکھ بھیجیے"[۴] "آپا در اصل زندگی بسر کرنے کے جس قرینے کی نمائندہ ہے وہی تصوف کا مطمح نظر ہے۔ وہ زندگی سے ضد نہیں کرتی، اصرار نہیں کرتی، انتقام نہیں لیتی، اس کی سرشت میں صبر، برداشت، تسلیم و رضا اور ایثار و قربانی کا جوہر ہے۔ وہ برملا اظہار اور اعلان کی قائل نہیں۔ اس کے اندر کی تپش اس کے ظاہر سے نہیں جھلکتی، جلے ہوئے اپلے کی طرح جو بظاہر بجھ چکا ہے، مگر اس کے اندر کی آگ زندہ ہے۔ وہ جلوت کی نہیں خلوت کی منتظر ہے۔ اس میں پیش قدمی اور چھیننے جھپٹنے کی صلاحیت نہیں بلکہ خاموشی سے منتظر رہنے کا حوصلہ ہے۔ یہ محض ایک محبت کرنے والی عورت کی تصویر نہیں، ایک صوفی اور ایک عارف کا روپ ہے۔ ممتاز مفتی نے لاشعوری طور پر یہ تصویر نہیں تراشی، بل کہ

اس افسانے کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں انھوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ یہ افسانہ ایک محسن کی فرمائش پوری کرنے کے لیے لکھا گیا تھا اور خود انھیں اس مقبولیت اور پسندیدگی کا اندازہ نہیں تھا جو اس افسانے کے حصے میں آئی [۲۲]۔ لیکن تخلیقی عمل، مصنف کے شعوری فیصلوں کا پابند نہیں ہوتا۔ افسانے میں غیر شعوری طور پر جس نقطۂ نظر کا غلبہ ہے وہ صوفیانہ طرز زیست کی نمائندگی کرتا ہے۔ صوفی کا عشق بھی اک آتشِ خاموش ہوتا ہے جو اندر ہی اندر اس کے باطن کو فروزاں رکھتی ہے اور وہ کسی تقاضے کے بغیر ایک غیر مشروط وابستگی پر قائم اور مطمئن رہتا ہے۔ اس کا محبوب اپنی تجلی کی برق سے اسے بھسم کر ڈالے یا لن ترانی کا پیغام بھیج کر تڑپتا چھوڑ دے، صوفی گلہ نہیں کرتا، نہ اپنی محبت سے دست بردار ہوتا ہے۔ روزمرہ کے دستورِ زندگی میں اس شعار کو دیوانگی اور فرسودہ پن سمجھا جائے تو اس کی بلا سے۔

اس افسانے میں ممتاز مفتی نے جو متصوفانہ فضا قائم کی ہے، اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ ان کے باقی افسانوں پر بھی نظر ثانی کروں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مجھے تین چار ایسی کہانیاں مل گئیں جن میں واضح طور پر متصوفانہ رجحانات کا عکس دکھائی دیتا ہے اور جو میرے پہلے انتخاب میں شامل نہیں تھیں۔

تیسرے مجموعے چپ (۱۹۴۷) کی کہانی ''پریم نگر'' تخلیق کائنات سے پہلے کا منظر پیش کرتی ہے۔ اس میں ایک ملکوتی منظر کی نقش گری کی گئی ہے، جو محض حسنِ فطرت کی تصویر نہیں، اس میں کسی خیال کی آنچ بھی ہے۔ اس کہانی کی منظر نگاری خارجی مرقعوں پر مبنی نہیں، یہ کسی مصور کی کھینچی ہوئی تصویریں معلوم ہوتی ہیں جن میں منظر کے ساتھ ساتھ مصور کی آنکھ بھی دکھائی دیتی ہے اور اس کا زاویۂ نظر بھی۔ پریم نگر کی فضا انتہائی خوبصورت ہے مگر اس پر ایک اداسی سی چھائی ہوئی ہے۔ کردار ایک دوسرے کو تلاش کرتے ہیں مگر کوئی کسی کو نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ فراق کا درد اس بستی میں نزول کرتا ہے اور اس کی مغموم فضا میں چہل پہل دوڑ جاتی ہے۔ یہی فراق ہے جو تخلیق کائنات کا سبب ہے۔ یہ خواجۂ اہلِ فراق کا کرب بھی ہے اور ہجر نصیب آدم کے اضطراب کا سبب بھی۔ اسی فراق کی بدولت دنیا بسی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ازل کے سرمئی اجالے میں اسی فراق کے طلوع ہونے سے زندگی کا بیج پھوٹا اور اس کی چشمِ ویراں میں نم آیا۔ فراق تخلیق کائنات کا موجب ہے اور 'پریم نگر' کی ساری رونق اسی کے دم قدم سے ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس دنیائے آب و گل کی ساری چہل پہل، ساری ہاؤ ہو حضرت انسان کے اس کربِ فراق کے دم سے ہے جو روزِ ازل اس کا مقدر رہا تھا۔ کہیں کہیں مصنف کے

قلم سے ایسے فقرے بھی نکل گئے ہیں جو اس تلازمے کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً:

بتوں نے سنا اور دو سمت سمٹ کر ایک دوسرے سے لگ گئے۔ ٹہنیوں نے ایک دوسرے کے شانوں پر سر رکھ کر آہیں بھرنا شروع کر دیا۔ جھٹ ٹپ ٹپ رونے لگے۔ کوئل نے بچھڑے باسیوں کو یوں آوازیں دینا شروع کر دیا، جیسے وہ آ جائیں گے۔ پگڈنڈیاں ادھر ادھر دوڑیں جیسے "کھوئے ہوئے" ابھی مل جائیں گے۔ آسمان نے اپنا پردہ اور بھی گاڑھا کر دیا، تا کہ گئے ہوئے باشیوں کی یاد آسمانوں پر نہ پہنچ جائے۔ کہیں فرشتے بھی نہ چاہنے لگیں کہ اللہ میاں چلے جائیں اور آسمانوں پر بھی جستجو کی رنگینی کا چرچا ہو۔ کہیں وہاں بھی ایک نگر نہ بس جائے۔"[۲۳]

اس افسانے میں مفتی نے مناظر فطرت کی مدد سے بیانیے کے تاثر کو گہرا کرنے کا کام لیا ہے۔ یہ ان کا ایک نمایاں فنی حربہ ہے۔ مناظر فطرت کے پس منظر کے ذریعے وہ نہ صرف اپنے معانی کی ترسیل و تبلیغ کا کام لیتے ہیں بلکہ بعض اوقات افسانے کے موضوع سے بالکل متضاد کیفیات کو جنم دے کر اس میں سہ ابعادی گہرائی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ "دودھیا سویرا" تو، جسے پورے اعتماد سے متصوفانہ افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے، اس حقیقت کو ایک نظریے کی صورت میں پیش کرتا ہے کہ مکانی صورت حال انسانی اعمال و افعال پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے:

"دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر"، اس نے پھر سلسلۂ کلام جاری کرتے ہوئے کہا، "فضا اس قدر لطیف ہوتی ہے اور عالم اس قدر نورانی ہوتا ہے جیسے صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے یہاں دودھیا سویرا پھیلا ہوتا ہے۔ اس بلندی پر یہاں صبح صادق کے دودھیا سویرے کو قیام اور دوام مل جاتا ہے۔ اس دودھیا سویرے میں نگاہیں ہمیشہ اوپر کو اٹھتی ہیں، اور انسان محسوس کرتا ہے جیسے وہ اڑ رہا ہو۔ انسانی کثافت کا بوجھ گویا اس کی پیٹھ سے اتر گیا ہو۔ اس کی آرزوؤں میں شدت کی وہ دھار نہیں رہتی، اس کے دکھوں اور حسرتوں میں تکلیف کا عنصر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بغض، دشمنیاں، نفرتیں سب یوں اپنی کثافت کھو بیٹھتی ہیں، جیسے مشین سے دبی ہوئی روئی کی گٹھڑی کو دھنک کر صاف کر دیا گیا ہو۔ وہاں روح سے بوجھ اتر جاتا ہے۔ وہاں کوئی ہوس کاری کا شکار نہیں ہو سکتا۔ وہاں کوئی جرم سرزد نہیں ہو سکتا۔ وہاں کوئی گناہ سے آلودہ نہیں ہو سکتا۔ جیسے یہاں صبح صادق کے وقت کوئی جرم نہیں کر سکتا۔ عیش و نشاط کی محفلیں چار بجے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ اس وقت محبوب کے لیے برہا کا راگ بھی نہیں گایا جا سکتا۔ صرف حمد و ثنا،

صرف کائناتی جذبہ ہی اس وقت قیام حاصل کر سکتا ہے۔ اس دودھیا سویرے میں وہاں عشق جسم کے بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اپنی انا، اپنی ذات سے نکل کر کائنات کے ذرے ذرے پر بکھر جاتی ہے۔ وہ بلندی اور پھر وہ پاکیزہ نورانی برف، وہ چاروں طرف پھیلا ہوا نور، اور وہ سکوت، گہرا، بے اتھاہ سکوت۔" وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے پر گویا دودھیا سویرا چھا گیا تھا۔"

اس اقتباس میں زمان و مکان دونوں کی مدد سے ایک روحانی کیفیت کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کیفیت میں وحدت الوجود کے تجربے کی جھلک ہے، شخصی انا کا بکھر کر کائنات کے ذرے ذرے سے ہم آہنگ ہو جانا اور چاروں طرف پھیلے ہوئے نور میں ایک اتھاہ سکوت میں ڈوب جانا۔۔۔ یہ کوئی خارجی واقعہ نہیں، بلکہ سراسر ایک داخلی تجربہ ہے لیکن اس داخلی تجربے کا محرک خارج میں موجود ہے۔ یعنی دس ہزار فٹ بلند مقام اور صبح صادق کا وقت۔ مفتی نے کئی بار زمان و مکان کو اپنے افسانوں کی کلیدی تقسیم کے بیان کے نہایت کامیاب آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کے کئی افسانوں میں وقت بھی دیگر کرداروں کے ساتھ ساتھ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اور افسانے کا ایک زندہ کردار معلوم ہوتا ہے۔ یہی تقسیم بعد میں ان کے افسانوں" سے کا بندھن" میں کلیدی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ مفتی نے اپنے ایک مضمون" پہاڑ" میں بھی بالکل یہی بات افسانوی تناظر سے باہر نکل کر، ایک نظریے کے طور پر بیان کی ہے۔

"چاہے آپ سوگوار محبت نہیں، چاہے آپ کو خسارہ نہیں رہا، چاہے آپ غم روزگار سے قطعی طور پر ناواقف ہیں، شام کے وقت جب ڈوبتے سورج کی کرنیں بادلوں میں آگ سی لگا دیتی ہیں۔ اور مشرق سے شام کا دھندلکا نکل کر چھائے جاتا ہے۔ اور ہوا در و دیوار میں سسکیاں بھرتی ہے، تو خواہ مخواہ آپ کا جی چاہتا ہے کہ آہیں بھریں، شعر گنگنائیں اور دنیا کو فانی سمجھیں۔

پھر جوں جوں رات بڑھتی جاتی ہے دل میں اک اضطراب پیدا ہوتا جاتا ہے۔ خواہشات کی بھیڑ لگنے لگتی ہے۔ گرد و پیش میں زندگی کی لہر دوڑنے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ آپ بابرِ بہ عیش کوش گنگنانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور زندگی ایک رنگین روپ دھار لیتی ہے۔ احساسات میں جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ آپ کا دل اور جسم مل کر سازش کرتے ہیں۔ اخلاق، سماج اور مذہب کے خلاف سازش۔۔۔۔۔ یہ وقت عیش و طرب کی محفل

سجانے اور گناہ کی لذتوں میں کھو جانے کے لئے کس قدر مناسب ہوتا ہے۔ پھر دو بجے جرم و سازش کا دور چلتا ہے۔ راگ رنگ کی آوازیں مدھم پڑ جاتی ہیں اور محبت بھری سرگوشیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور صرف محفلِ شب کی جلی ہوئی شمع سلگتی رہ جاتی ہے۔ عشق و محبت کی ملاقاتیں اپنی دلچسپی کھونے لگتی ہیں۔ تین بجے کے قریب توبہ اور عفو کی دعائیں شروع ہو جاتی ہیں، گزشتہ گناہوں پر آنسو بہائے جاتے ہیں، صفائی قلب کے لیے مناجاتیں پڑھی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ صبح صادق کے وقت حمد و ثنا کی کیفیت تمام عالم کو سرشار کر دیتی ہے۔۔۔ صبح صادق کے روپہلے دھندلے میں آپ گناہ نہیں کر سکتے، رنگ رلیاں نہیں منا سکتے، عیش و طرب کی محفل آراستہ نہیں کر سکتے۔۔۔۔ وقت اور روح کے تعلق کو سب سے پہلے راگ ودھیا والوں نے سمجھا۔۔۔۔ جملہ اوقات میں صبح صادق کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اور پہاڑوں کا مقصد صبح صادق کو لافانی کرنا ہے۔ دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر جا کر دیکھئے، جہاں ہر وقت صبح صادق کا عالم چھایا رہتا ہے۔۔۔۔۔ یہاں کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔۔۔ کوئی محفل طرب نہیں سجائی جا سکتی۔ یہاں صرف بھگتی کی جا سکتی ہے، یوگی یہاں دیوتاؤں کی بھگتی کے لئے آتے ہیں اور انجانے میں وحدانیت کی مالا جپنے لگتے ہیں، وہ کرشن مہاراج سے دھیان لگانے آتے ہیں اور اس دیوتا کی حمد و ثنا میں لگ جاتے ہیں جس کا نہ جسم ہے اور نہ شکل۔ وہ خالق ارض و سما، جس کا سب سے بڑا وصف عظمت ہے۔

پہاڑوں پر گھومتے پھرتے میں نے مختلف اثرات سے بھرے مقام دیکھے ہیں۔ ایسے مقام انسان کے دل پر خصوصی اثر رکھتے ہیں۔ اور خصوصی جذبات کے متحرک ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈلہوزی سے چنبہ جاتے ہوئے سڑک پر ایک مقام ہے کھجیار، یہاں فضا ہر وقت رومانی جذبات بکھیرتی رہتی ہے۔۔۔۔ ایسے مقامات بھی ملتے ہیں جہاں آپ محسوس کریں گے کہ زندگی ایک سوگوار حسینہ ہے جو آپ سے منہ موڑ کر بیٹھی ہے۔ فضا آہوں اور ہچکیوں سے بھری ہوئی ہے۔

ایسے مقامات جہاں خدائے قہار و جبار کا وجود مسلط ہے۔ جہاں قدرت کی جابرانہ طاقتوں کا دور دورہ ہے۔۔۔ اور ایسے مقامات جہاں اللہ تعالیٰ کی عظمت سے متاثر ہو کر انسان محبت، خلوص اور نیاز کے بے پناہ جذبے سر بسجود ہو جاتا ہے[۵۹]۔"

علی پور کا ایلی میں بھی انھوں نے مکانوں اور شہروں کی ظاہری حالت کے انسانی نفسیات پر شدت سے اثر انداز ہونے کا نظریہ پیش کیا ہے[۶۰]۔ اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے

کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں اپنے نجی احساسات و تجربات اور نظریات کو کس قدر شدت سے پیش کیا ہے۔

زمان و مکان کے اس تصور سے قطع نظر، افسانہ ''دودھیا سویرا'' کا مرکزی خیال بہت چونکا دینے والا ہے۔ یہ ایک انتقال پا جانے والی عورت کے گرد گھومتا ہے جس کی قبر پر چار مختلف مرد ایک ہی وقت میں دیا جلانے آتے ہیں اور ایک دوسرے کو اس عورت سے اپنے تعلق کی داستان سناتے ہیں۔ ہر ایک کا خیال ہے کہ اس عورت نے اس کی زندگی کو ایک نیا موڑ بخش دیا تھا اور وہ اسے اپنی دانست میں خود اپنی ہی محبوبہ یا ملکیت سمجھتا تھا۔ نذیر احمد اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ممتاز مفتی کے عورتوں سے متعلق کئی سارے افسانوں میں سے ''دودھیا سویرا'' بھرپور اور مکمل افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ فنی طور پر بھی اسے ان کے نمائندہ افسانے کی حیثیت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ عورت کا حسن و جمال اور مرد پر اس سحر کے متنوع اثرات ''دودھیا سویرا'' کا موضوع ہے۔۔۔ زمان و مکان کا خصوص اور افسانے میں شامل واقعہ و کردار کی تفصیل کے بیان میں تراش خراش، تزئین و ترتیب اور کسی حد تک تصنع کا عنصر دودھیا سویرا کے ایسے پہلو ہیں جو بیک وقت ممتاز مفتی کی فنی روش کی توانائی اور ناتوانی کو ظاہر کرتے ہیں۔۔۔ ابہام و اسرار جو کرداروں کے سلسلے میں پایا جاتا ہے وہ اتفاقی نہیں بلکہ ارادی معلوم ہوتا ہے''[۲۲]۔

لیکن کیا یہ افسانہ محض عورت اور مرد کے تعلق کا ظاہر کرتا ہے یا عورت یہاں زندگی کے اسرار کے استعارے کے طور پر ظاہر ہوئی ہے؟ اگر ایک لمحے کے لیے یہ بھول جائیں کہ وہ چاروں افراد ایک عورت کی قبر کے گرد کھڑے ہیں، اور یہ سوچ لیں کہ چار افراد، کائنات کے چار کھونٹ ہیں اور ان سب کو حقیقتِ عظمیٰ کی تلاش ایک دوسرے سے وابستہ کیے رکھتی ہے تو افسانے کی ایک نئی جہت نمایاں ہوتی ہے۔ نذیر احمد نے جسے تصنع کا عنصر قرار دیا ہے وہ دراصل کہانی کی مابعد الطبیعیاتی جہت ہے، جو ظاہر ہے کہ حقیقت نگاری سے مختلف تاثر قائم کرتی ہے۔ تاہم یہ بات تو نذیر احمد نے بھی محسوس کر لی کہ کہانی میں ابہام و اسرار کا پہلو اتفاقی نہیں بلکہ ارادی معلوم ہوتا ہے۔ دراصل یہ ابہام و اسرار کہانی کی تقسیم کا بنیادی جزو ہے۔ مفتی زندگی کی اصل حقیقت، جسے حقیقتِ واحدہ بھی کہا جا سکتا ہے، کے بارے میں انسانی اعتقادات اور اس کے ظن و تخمین کی نیرنگی کا بیان کرتے ہیں۔ ہر ایک خود اپنے نقطۂ نظر کو قطعی اور حتمی سمجھتا ہے لیکن

جب وہ "قبرستان" یعنی آخری منزل پر پہنچتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ اصل حقیقت تو ایک ہے۔ کائنات کی یہ تمام ترنیرنگی اور تنوع ایک ذات واحد میں ضم ہو جاتے ہیں اور ایک نیا عرفان جنم لیتا ہے۔ کہانی کے آخری جملے واضح طور پر اس طرف اشارہ کرتے ہیں:

"اونہوں! دوسروں کو ننگا نہ کرو۔ ہمیں پردہ اپنی عقل سے اٹھانا ہے۔ اپنی عقل سے۔"

"کتنا رنگین پردہ ہے" مونچھوں والے نے آہ بھری

"کتنی بڑی رکاوٹ ہے" نمدہ پوش نے کہا

"اچکن پوش انہماک سے دیا جلانے میں مصروف تھا۔ اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔ سورج کی آخری شعاعوں نے بادلوں سے چھن کر نور کی دھاریاں سی بنا دی تھیں، جیسے نور کا ایک مینار کھڑا ہو۔ اور چاروں طرف دودھیا سویرا پھیلا تھا۔[۲۸]"

یہاں دودھیا سویرا حقیقی معنی میں نہیں بلکہ استعاراتی انداز میں استعمال ہوا ہے کیوں کہ کہانی کے منظر میں یہ وقت صبح کا نہیں، شام کا ہے۔ اس استعارے کا سرا اس اقتباس سے جڑتا ہے جس میں مفتی نے دودھیا سویرے کی معنویت واضح کی ہے۔ یعنی وقت کا وہ حصہ جب انسان وجود کی کثافتوں سے بالاتر ہو کر کسی غیر معمولی مابعد الطبیعیاتی تجربے سے گزرتا ہے۔ گویا راہ سلوک کی ایک اور منزل طے کر لیتا ہے اور کسی مخفی حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ نور کا لفظ اس کہانی میں بار بار استعمال ہوتا ہے۔ نور کی بنی ہوئی پنڈلیاں، نور سے بھیگی ہوئی تنہائی، نور کا مینار اور نور کی دھاریاں محض ایک عورت کے عشاق کا تجربہ نہیں ہو سکتیں جب تک وہ اس تجربے کو ترفع عطا کر کے اس سے کوئی برتر معنی اخذ کرنے کے قابل نہ ہوں۔ کہانی کا لوکیل ایک قبرستان کے کنارے پر بنی مسجد کا چبوترہ ہے جو اپنی جگہ ایک معنی خیز اشارہ فراہم کرتا ہے۔

روغنی پتلے کے عنوان سے ممتاز مفتی کا چھٹا افسانوی مجموعہ ۱۹۸۲ء میں، انیس برس کے طویل وقفے کے بعد شائع ہوا[۲۹]۔ ان برسوں کے دوران ممتاز مفتی کی نجی اور ادبی زندگی میں کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ صوفیوں اور درویشوں سے ان کی ملاقاتیں اور قدرت اللہ شہاب سے خصوصی ربط نے ان کے موضوعات، اسلوب اور طرز فکر پر گہرا اثر مرتب کیا تھا۔ انھوں نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر لی تھی اور لبیک (۱۹۷۵ء) کے عنوان سے اس سفر کی یادداشتیں بھی تحریر کر چکے تھے۔ جنسی اور نفسیاتی موضوعات پر افسانے لکھنے والے ممتاز مفتی کی یہ کایا پلٹ ان کے قارئین کے لیے بہت حیرت انگیز تھی اور اس کتاب

پر مختلف قسم کے ردعمل ظاہر کیے جا رہے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ لبیک کی اشاعت نے ممتاز مفتی کو بہت مقبولیت عطا کی تھی اور وہ قارئین کی ایک بڑی تعداد کی عقیدت کا محور بن گئے تھے۔ اگرچہ نقادوں نے ان کی اس کایا پلٹ کو تشکیک کی نظر سے دیکھا تھا مگر عوامی سطح پر انھیں پہلے سے کہیں زیادہ پذیرائی حاصل ہونے لگی تھی۔

روغنی پتلے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں ان کے افکار پر روحانیت کی چھاپ نمایاں صورت میں سامنے آتی ہے۔ روغنی پتلے کی اشاعت سے ان کے افسانوی ادب کی متصوفانہ جہت کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور عکسی مفتی کا یہ کہنا کہ ''فرائیڈ سے متاثر ہو کر جنس پر لکھنے والا ممتاز مفتی تیس سال ہوئے فوت ہو گیا۔ انہیں تازہ روشنی اور قوت ملی ہے۔ اب دیکھیں۔۔۔[۲۳]'' کافی حد تک سچ ثابت ہو جاتا ہے۔ خود ممتاز مفتی اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''میرے نزدیک تحریر میں تاثر کو عطا سے تعلق ہے۔ میں نے حضرت رمزی شاہ کی خدمت میں حاضری دی۔ عرض کی' حضور آپ نے حضرت میاں محمدؒ کو قلم عطا فرمایا تھا۔ کچھ مجھے بھی عنایت ہو جائے!'
>
> دلّی میں حضرت نظام الدینؒ کے در پر دہائی دی تھی کہ حضرت امیر خسروؒ کی جھولی بھری تھی، کچھ مجھے بھی دان کر دیجئے۔ بیشک وہ اہل تھے میں نا اہل ہوں۔ لیکن عطا میں نہ اہل ہوتا ہے نہ نا اہل۔ بلکہ نا اہل ہو تو دین بھی دین بن جاتی ہے۔ اگر ان بزرگوں کی جانب سے عطا ہو جائے تو شاید مرنے سے پہلے میں وہ کہانی لکھ سکوں جو لکھنا چاہتا ہوں [۲۴]۔''

اس مجموعے کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ اپنے فنی و فکری ارتقا کے اس مرحلے پر ممتاز مفتی نے ادب کو اپنے پیغام کی ترسیل کے ایک وسیلے کے طور پر استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اور ان کا اصل مقصد پاکستان کی تہذیبی زندگی میں جدیدیت کے پیدا کردہ روحانی خلا کی نشاندہی کرنا ہے جس نے انسان کے قوائے ظاہری و باطنی کو ایک مسلسل انتشار میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس احساس کا سب سے شدید اور براہ راست اظہار ان کے افسانے ''روغنی پتلے'' میں ملتا ہے۔ یہ ان کے پہلے مجموعے ''ان کہی'' میں شامل افسانے ''اندھیرا'' ہی کا توسیعی روپ ہے۔ اندھیرا ہی کی طرح اس کہانی کا منظر نامہ بھی ایک دکان ہے۔ یہ پاکستان کے ایک بڑے شہر کا جدید ترین فیشن آرکیڈ ہے جو پورے شہر کی ثقافتی اقدار کا نمائندہ ہے۔ اس آرکیڈ میں مختلف لباس اور رنگ ڈھنگ کے پتلے موجود ہیں جو رات ہوتے ہی زندہ جیتے جاگتے

انسانوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ان کی آپس کی گفتگو افسانے کے مرکزی خیال کو اجاگر کرتی اور آگے بڑھاتی ہے۔ کہانی ایک ہمہ دان راوی کی زبانی بیان کی گئی ہے جو نہ صرف فیشن آرکیڈ کی تعمیر، تزئین اور ترتیب کو وضاحت سے بیان کرتا ہے بل کہ افسانہ نگار کی ترجمانی کرتا ہوا، اس کی ذاتی رائے اور تبصرے بھی پیش کرتا جاتا ہے۔ یہ افسانہ نگاری کی ایک روایتی اور گھسی پٹی تکنیک ہے مگر ممتاز مفتی کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے اسلوب، جملوں کی ساخت اور الفاظ کے در وبست سے کہانی کی مجموعی فضا میں تازگی، زندگی اور حرکت پیدا کر دیتے ہیں۔ ابتدائی بیانیہ فعل حال میں پیش کیا گیا ہے لیکن قاری جوں ہی خود کو راوی کے ہم راہ فیشن آرکیڈ کی رنگین زندگی میں پوری طرح محو محسوس کرتا ہے، گھڑی، رات کے دو بجاتی ہے اور بیانیہ کا صیغہ حال سے ماضی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ گویا اس سے پہلے جو معلومات فراہم کی گئی تھیں وہ مستقل نوعیت کی تھیں۔ فیشن آرکیڈ میں کسی بھی وقت، کسی بھی دن یہ مناظر دیکھے جا سکتے ہیں لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اس خاص دن، وقت اور لمحے کو ہی ظہور پذیر ہو سکتا تھا۔ فعل حال کا استعمال ایک طرح سے جاری عمل کی نشان دہی کرتا ہے اور فعل ماضی کے ذریعے ایک قصے کے رونما ہو کر ختم ہو جانے کی طرف اشارہ ہے۔ اب اگر کوئی اسی فیشن آرکیڈ میں رات کے دو بجے پہنچ بھی جائے تو ضروری نہیں کہ یہی تجربہ حاصل کر سکے۔

دراصل کہانی کا راوی رات دو بجے کے بعد فیشن آرکیڈ میں جو کچھ ملاحظہ کرتا ہے وہ ایک غیر معمولی تجربہ ہے۔ اسے راوی کا خیال یا وژن یا خواب بھی کہہ سکتے ہیں مگر افسانہ نگار نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ اس نے اس تجربے کو ایک امرِ واقعہ قرار دیا ہے۔ راوی کو فیشن آرکیڈ کے پتلوں کے اچانک بول پڑنے پر کوئی حیرت نہیں ہوتی بل کہ سچ تو یہ ہے کہ راوی انھیں قاری کے حوالے کر کے خود کہیں غائب ہو جاتا ہے اور دوبارہ کبھی نمودار نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوا ہے کہ قاری خود اس فیشن آرکیڈ میں موجود ہے اور پتلوں کے مباحث سن رہا ہے۔ راوی کا نقطۂ نظر، تبصرہ یا اس کی موجودگی کا ہر احساس زائل ہو جاتا ہے۔

کہانی کے اصل کردار فیشن آرکیڈ کے پتلے ہیں جو رات ہونے کے بعد، اور راوی کی موجودگی سے بے خبر، ایک دوسرے سے محو کلام ہوتے ہیں۔ یہ پتلے اپنے لباس اور حلیے کے اعتبار سے انسانوں کے مختلف طبقوں، اور فکری رویوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ سی تھرو لباس والی، منی سکرٹ والی، بیدنگ کاسٹیوم والی، ساڑھی والی، میکسی والی، لٹکتے بالوں والی، پتلون والی، ننگے پاؤں والی، پین نوکر ابالوں والی، اور انگلی سے لگے بچے والی پتلیاں۔ ان کے ساتھ ساتھ پتلے

کھڑے ہیں۔ شکاری جیکٹ والا، موٹر سائیکل والا، بلیک سوٹ، اچکن، پینٹ، کرتے پاجامے والا، سٹوڈنٹ، ڈینڈی، مصور، دانش ور۔ آرکیڈ ہال کے اوپر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک گیلری چلی گئی ہے جہاں نظروں سے اوجھل دکان کا کاٹھ کباڑ پڑا ہے۔ اسی کاٹھ کباڑ میں مشہدی لنگی اور رومی ٹوپی والے پتلے پٹے ہوئے مہروں کی طرح پڑے ہیں۔ پتلوں کی آپس کی گفتگو اس تضاد کو ظاہر کرتی ہے جو وقت اور اقدار کے بدلنے سے قدیم اور جدید کے درمیان ظاہر ہو رہا ہے۔ ممتاز مفتی نے اپنے قلم کا سارا زور صرف کر کے ان پتلوں کے مکالموں میں ایسی گہری طنزیہ شدت بھر دی ہے جو بڑی بے رحمی سے تہذیب کے زخم کریدتی اور اندر کے متعفن گھاؤ بے نقاب کرتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں کی مدد سے وہ کمال صناعی سے صورت حال کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ اس ساری گفتگو کا موضوع یہی جدید اور قدیم کی بحث ہے۔ جدیدیت کے متوالے قدیم طرزِ زندگی کو منافقانہ ماضی پرستی، رجعت پسندی اور دقیانوسیت کا الزام دے کر رد کر دیتے ہیں اور قدیم اندازِ فکر کے مالک عہدِ جدید کو عریانی، فحاشی، سطحیت اور حالات سے چشم پوشی کا مجرم گردانتے ہیں۔ بالآخر، افسانہ نگار کو فتح نصیب ہوتی ہے اور اگلے ہی روز، سیاسی صورت حال بدلتے ہی، وہ پتلے جو خود اس کے افکار کی ترجمانی کرتے ہیں، پس منظر سے نکل کر فیشن آرکیڈ کے نمایاں ترین مقامات پر ایستادہ ہو جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ فیشن آرکیڈ کا نام بھی بدل کر "پاکستان آرکیڈ" رکھ دیا جاتا ہے۔

یہ امر انتہائی دلچسپ ہے کہ راتوں رات یہ تبدیلی محض اس لیے رونما ہوتی ہے کہ "حکومت کے ایک معزز مہمان، جو دنیائے اسلام کے بہت بڑے سربراہ ہیں" آرکیڈ دیکھنے آ رہے ہیں اور وہ توقع رکھتے ہیں کہ پاکستان کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر پاکستانی رنگ میں رنگا ہو"۔ فیشن آرکیڈ کا ناظم اپنے کاریگروں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ چوں کہ اتنے مختصر نوٹس پر ہم نیا سامان مہیا نہیں کر سکتے، اس لیے اسی سامان کو رنگ و روغن کر کے گزارہ کرنا ہو گا"۔ چناں چہ رومی ٹوپی اور مشہدی لنگی والے پتلوں کو بدلتے ہوئے حالات میں ایک نئی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہاں دو باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔

کہانی کا ایک اہم کردار رومی ٹوپی والا پتلا ہے۔ رومی ٹوپی ممتاز مفتی کے نظامِ فکر میں ایک اہم علامت کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ یہ علامت پہلی بار ان کے افسانے "اندھیرا"[۳۳] میں استعمال کی گئی ہے جس میں ٹوپیوں کی ایک دکان میں مختلف قسم کی ٹوپیاں اوڑھے پتلے ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ اس افسانے میں رومی ٹوپی روایتی اسلامی نقطۂ نظر کی ترجمانی

کرتی نظر آتی ہے اور مصنف یا راوی کو اس علامت سے کوئی خصوصی شغف محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن "روغنی پتلے" میں یہ علامت مصنف کی فکری وابستگی کی آئینہ دار نظر آتی ہے۔ اس سے پہلے "علی پور کا ایلی" میں بھی رومی ٹوپی کی علامت ممتاز مفتی کے متصوفانہ رجحانات کی علامت کے طور پر نمودار ہو چکی ہے۔ ممتاز مفتی نے رومی ٹوپی کو پہلے اسلامی اور پھر متصوفانہ روایت کی علامت کیوں قرار دیا ہے، یہ سوال قابل غور ہے۔ رومی ٹوپی سے خیال مولانا روم کی طرف بھی جاتا ہے اور تحریکِ خلافت کی طرف بھی۔ یوں یہ صرف روحانی حیات نو کی بات ہی نہیں رہتی بل کہ سیاسی غلبے اور استحکام کی آرزو کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ اتحاد عالم اسلامی، مرکز کی طرف لوٹنے کی خواہش اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کا خواب اس علامت کا فکری تناظر فراہم کرتے ہیں۔ یہی بات متذکرہ افسانے میں بھی نمایاں ہے جس میں رومی ٹوپی والا دنیا کے تمام مذاہب اور نجومیوں کے حوالے سے ایک گولڈن ایج کی بشارت دیتا ہے جب انسانی ترقی کا رُخ مادی سہولتوں سے ہٹ کر روحانی مقاصد کی طرف مڑ جائے گا۔

ایک اور دلچسپ بات جو اس افسانے میں ضمنی طور پر اجاگر ہوتی ہے، ملکی حالات کے بدلنے میں بیرونی طاقتوں کا کردار ہے۔ یعنی جب مصنف پاکستان کی تہذیبی زندگی کا رخ بدلتے ہوئے دکھانا چاہتا ہے تو اسے اس کے سوا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا کہ وہ کسی بڑی اسلامی طاقت کے اثر رسوخ کو استعمال کرے۔ یوں یہ تبدیلی معاشرے کے اندر سے، فطری طریقے سے رونما نہیں ہوتی بل کہ خارجی قوت کے استعمال سے پیدا کی جاتی ہے۔ یہ نکتہ بڑا اہم ہے اور جنوبی ایشیا کی تہذیبی و سیاسی نشو و نما پر روشنی ڈالتا ہے۔ اگر چہ مصنف کے پیش نظر یہ مسئلہ نہیں ہے اور وہ محض اسے اپنے مطلوبہ نتائج تک پہنچنے کے لیے ایک وسیلے کے طور پر استعمال کرتا ہے لیکن یہ اس نفسیات کا عکاس ضرور ہے جو اپنے معاشرتی انقلابات کے لیے کسی بیرونی رہنما، مسیحا یا قائد کے انتظار کی قائل ہے۔ دوسری طرف یہ غیر شعوری طور پر اس احساس کی چغلی بھی کھاتا ہے کہ پاکستان کے عوام اپنی حالت خود بدلنے کے لائق نہیں اور جب تک کوئی تبدیلی ان پر لاگو نہ کی جائے، وہ اس کے لیے تگ و دو نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومتوں کا سیاسی مفادات کی حفاظت کے لیے مرغ باد نما کی طرح رُخ بدل لینا بھی واضح ہوتا ہے۔ غالباً اسی لیے مصنف کو مطلوبہ تہذیبی اقدار کو رواج دینے کے لیے کسی بیرونی طاقت کا سہارا لینا پڑا۔ یوں یہ افسانہ نہ صرف ممتاز مفتی کی فکری و روحانی ترجیحات کا اظہار کرتا ہے بل کہ غیر شعوری طور پر پاکستانی معاشرے کی عمومی سیاسی و معاشرتی صورت حال کا مبصر بھی ہے۔

اسی مجموعے کے تین اور افسانوں: "وہ"، بت، دیوتا اور سناتا" اور "ان پورنی"، میں ممتاز مفتی کے فن کی روحانی یا متصوفانہ جہت نمایاں ہوتی ہے۔ "وہ" میں مفتی نے اس مابعدالطبیعیاتی تجربے یا مشاہدے کو بیان کیا ہے، جس سے تصوف سے وابستہ لوگ یقیناً واقف ہوں گے۔ یہ ان کا ذاتی مشاہدہ ہے یا سنی سنائی کو افسانے کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے، یہ ایک الگ بحث ہے[33]۔ افسانہ "وہ" میں "ذات واحد" کی موجودگی کو حسی سطح پر محسوس کر لینے کا تجربہ بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے کے صرف دو کردار ہیں۔ ایک کہانی کا راوی جو صیغہ واحد متکلم میں اپنے تجربے کی شدت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سرشاری، مسرت اور بے پایاں حیرت کی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ دوسرا کردار "وہ" ہے جسے راوی پہچانتا تک نہیں مگر اس کی رفاقت اور محبت کا تیقن اس کے دل کو قوی کیے دیتا ہے۔ اس اپنی ازلی تنہائی میں کسی مہربان ساتھی، کسی گہرے دوست اور ہم درد رازدان کی موجودگی کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ شاید اسے وحدت الوجودی نقطۂ نظر سے، وہ صوفیانہ تجربہ نہ کہا جا سکے جس کا ذکر تصوف کی کتابوں میں ملتا ہے کیوں کہ اس تجربے میں فرد کی انفرادیت معدوم ہو جاتی ہے اور اسے اپنی ذات کا احساس تک باقی نہیں رہتا۔ جب طالب اور مطلوب ایک ہو جائیں تو "میں تاں ہی، سب تو" اور من تو شدم، تو من شدی کی کیفیت جنم لیتی ہے لیکن اس افسانے میں تو "میں" اور "وہ" دونوں بھرپور طریقے سے موجود ہیں۔ کہیں کہیں کہانی کا راوی "میں" واضح اشارے بھی دیتا ہے کہ جس ہستی کی موجودگی کو وہ ماں کی کوکھ جیسے 'تمک' سے تعبیر کر رہا ہے، کہیں وہی تو نہیں جس کا نام لے کر بچپن میں بڑے بوڑھے اسے ڈرایا کرتے تھے۔ مذہبی تعلیمات میں پیش کردہ خدا کا تصور، صوفی کے تجربے سے کس طرح مختلف ہوتا ہے، یہ ممتاز مفتی کا پسندیدہ موضوع ہے اور اس پر انھوں نے اپنی خودنوشت "الکھ نگری" میں بھی خاصی گفتگو کی ہے[34]۔

یہ سوال کہ کیا ممتاز مفتی نے اس افسانے میں وحدت الوجودی تصوف کے مرکزی تجربے کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے، بہت اہم ہے اس لیے کہ اگرچہ افسانے میں کہانی کا راوی اپنی ذات کے بھرپور احساس کے ساتھ موجود نظر آتا ہے لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس تجربے سے گزرنے اور انفرادی شعور کی بازیافت کے بعد، اسے بیان کرنے کی جسارت کی گئی ہو کیوں کہ عین عالمِ وصال میں تو وصال کی کیفیت بیان کرنا بالکل غیر ضروری اور بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ جب کوئی عاشق اپنے محبوب سے مل کر لوٹتا ہے تو بار بار اس ملاقات کی یاد سے اپنے دل کو گرماتا اور ایک ایک لمحے کو دوبارہ جینے اور [illegible] کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتا ہے

اس کوشش سے اس کا مقصود صرف اس لذت کی بازیافت ہی نہیں ہوتا، بل کہ وہ شعور کی سطح پر اس لذت کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ وہ اپنی ایک ایک کیفیت کے زیر و بم اور اس کے پس پیش کا تجزیہ کرتا ہے اور اس کوشش میں ماضی، حال اور مستقبل ایک ہو جاتے ہیں۔ یعنی گزشتہ کا احتساب، لمحۂ موجود کا انجذاب اور آئندہ کا خواب یک جان ہو کر ایک نئی عرفانی و وجدانی صورت حال کو جنم دیتے ہیں۔ افسانہ "وہ" اسی عرفانی و وجدانی لمحے کی داستان ہے جسے ممتاز مفتی نے بڑی فن کاری سے، پیراڈوکس اور Irony کی مدد سے پیش کیا ہے۔ ایک مثال دیکھیے:

> "بتوں کو توڑنے کے لیے تو غزنوی پیدا ہوتے ہیں۔ حملے کیے جاتے ہیں۔ ایک دو نہیں۔ سولہ سترہ۔ فوجیں چڑھائی کرتی ہیں۔ تہس نہس کرتی ہیں۔ یوں تو کبھی نہیں ہوتا کہ ایک بے نام انجانا "وہ" چپکے سے آئے۔ دھرنا مار کر بیٹھ جائے اور اس کی موجودگی سے بت خود بخود ٹوٹنے لگے۔"

جن بتوں کو توڑنے کی بات کہانی کا راوی کر رہا ہے، وہ پتھر یا مٹی کے بت نہیں، انسان کے دل میں بسے ہوئے اس کے شکوک و شبہات، ظن و تخمین اور حرص و ہوس کے بت ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بت بادشاہوں کی لشکر کشی سے نہیں توڑے جا سکتے۔ یہ دل میں اتر جانے والی کسی معتبر موجودگی سے ہی ٹوٹتے ہیں اور یہی ممتاز مفتی کا مطلب بھی ہے۔ مگر اس کے لیے وہ متضاد صورت حال کو بیان کر کے قاری کو موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ اس تضاد پر غور کرے اور اس سے حقیقت حال کو خود شناخت کر لے۔ یوں "وہ" بظاہر بالکل سادہ خود کلامی کی تکنیک میں لکھا جانے والا افسانہ معلوم ہوتا ہے لیکن مفتی نے اس میں گہرے فن کارانہ شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس افسانے میں پیراڈوکس اور Irony کو فنی حربے کے طور پر منتخب کرنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ دونوں ادبی حربے اس موضوع کی ماہیت سے گہرے طور پر وابستہ ہیں۔ وحدت الوجودی تجربے میں کثرت کو حقیقت واحد کی صورت شناخت کرنا اور پھر اس حقیقت واحد کو اس کے بے شمار اور متنوع اظہاری سانچوں میں پہچاننا، انسانی عقل کی فریب خوردگی اور خود اپنی ہی طمع کو حقیقتِ اولی کی تلاش قرار دینا اور اس پر ناز کرنا، یہ موضوعات پیراڈوکس اور Irony کے وسیلوں سے بڑھ کر کسی اور حربے کی مدد سے شاید اتنی شدت سے بیان نہ ہو سکتے۔ کم از کم اس افسانے کی حد تک اس تجربے کو افسانے کی فنی حدود میں بیان کرنے کا یہ بہترین انداز ہے۔ اسی کی بدولت یہ افسانہ نہ تو کسی صوفی کے احوال کا بیانیہ بنتا ہے اور نہ کسی دیوانے کی بڑ۔

اس میں ایک جانے پہچانے انسانی تجربے کا لمس بھی ہے اور کسی مابعد الطبیعیاتی کشف کی تحیر زدگی بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ سماجی وتاریخی کنائے کی مدد سے ایک ذاتی اور نجی تجربے کو ایک بڑے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔ چند ایک مثالیں دیکھیے:

''بت کا مطالبہ ہے کہ کوئی پجاری ہو۔ نہ ملے تو وہ خود اپنا پجاری بن جاتا ہے [۳۶]''

۔۔۔ نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تو بہت ڈراؤنا تھا۔ اس نے تو آگ کی ایک بہت بڑی بھٹی جلا رکھی تھی۔ ہاتھ میں سونٹا تھا، سونٹا چلاتا۔ لوگوں کو دھڑا دھڑ آگ میں ڈالتا جاتا۔ بس یہی اس کا کام تھا [۳۷]۔''

اس بے نام ذات کی موجودگی کو ظاہر کرنے کے لیے جو استعاراتی پیرائے استعمال کیے گئے ہیں انھیں بھی دیکھیے: ''ہونے والے بچے سے بھر جانے والا ماں کا وجود، ہر طرف پھیلی ہوئی ماں کی کوکھ، کنگن اور لاڈ سے بھیگی ہوئی فضا، ہوا میں تیرتی ہوئی لوری، ماں کا تھپکنے والا ہاتھ، گنڈولی کی شعاعیں بکھیرتا تبسم، مٹھاس کی پھوار۔'' ان میں سے بیشتر استعارے بظاہر حسی نوعیت کے ہیں مگر صاف ظاہر ہے کہ ان سے وابستہ کوئی نہ کوئی غیر مرئی کیفیت بھی نمایاں ہے۔ یعنی ایک سرے پر حسی تجربہ ہے تو دوسرے سرے پر ایک لطیف اور ماورائی احساس جو حواس کی زد سے باہر ہے اور اسی لیے تحیر اور اسرار کا احساس پیدا کر رہا ہے۔ دوسری طرف خدا کی ذات کے ماورانہ پہلو کو نمایاں کر کے ایک جدید ترین تانیثی جہت کی مثال بھی پیش کر دی ہے۔ عام طور پر صوفیانہ ادب میں خدا کا پدرانہ تصور غالب رہا ہے جس میں اس کے جلال و تمکنت کے سامنے عاشق نسائی سمجھی جانے والی فعالیت کی مثال بنا رہتا ہے۔ لیکن مفتی نے اس کے برعکس، خدا کے جمالی پہلو کی بازیافت کی ہے اور اسے ماں کے استعارے کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی ہے جس کے سامنے انسان ایک لاڈلے بچے کی طرح اپنی انا کے حصار میں مقید رہنے پر مصر ہے لیکن ماں اسے اپنی ممتا بھری شفقت سے محروم نہیں کرتی۔ کہانی کے آخری جملوں میں چھپی Irony دیکھیے:

''کب سے یہی ہو رہا ہے۔
وہ منتیں کر کر نہیں ہارا۔
میں دھمکیاں دے دے کر ہارتا جا رہا ہوں
مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے دکھوں کی گٹھڑی اس کے حوالے نہ کر دوں۔ مجھے
ڈر ہے کہ میں اس پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جاؤں۔

صاحبو! کیا وہ کبھی مجھ سے مایوس نہ ہوگا [۳۸]''

کہانی کا ''میں'' کبھی یہ نہیں چاہے گا کہ ''وہ'' اس سے مایوس ہو جائے کیوں کہ اس کی موجودگی کے احساس نے اسے عافیت وتحفظ سے آشنا کیا ہے لیکن وہ اپنی بے نیازی کا ڈھونگ رچانے سے باز نہیں رہتا۔ اس ڈھونگ سے انسانی فطرت کا تضاد اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے جو بظاہر خود کو عاشق سمجھتا ہے لیکن درحقیقت معشوقوں کے سے طور طریقے اپنائے رکھتا ہے۔ اس قسم کے تجربات کا اظہار کلاسیکی فارسی اور اردو شاعری میں تو عام رہا ہے لیکن اردو فکشن میں مکمل فنی کمال کے ساتھ اس کے ابلاغ کا تجربہ شاید ممتاز مفتی نے پہلی بار کیا ہے۔ یہ افسانہ یقینی طور پر اردو فکشن کو ایک نئی جہت فراہم کرتا ہے۔

اسی نوعیت کا ایک اور افسانہ ''بت دیوتا اور سناٹا'' ہے۔ اس افسانے کے ابتدائی اقتباس میں ہی کہانی کا راوی وجود کی سطح سے نکل کر عدم کے مقام تک پہنچتا دکھائی دیتا ہے اور اس سفر کے تمام مراحل یکے بعد دیگرے قاری کی نگاہوں کے سامنے آتے جاتے ہیں۔ کیا زندگی میں کوئی شخص موت کے تجربے سے گزر سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں بھی ہے اور انکار میں بھی۔ کیا ممتاز مفتی اس تجربے سے گزرے تھے؟ اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی لیکن انھوں نے ایسی کتابیں ضرور پڑھ رکھی تھیں جن میں ان لوگوں کے تاثرات درج تھے جو طبی حوالے سے مر چکے تھے لیکن چند لمحوں یا کچھ دیر بعد دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آئے اور انھوں نے ان چند لمحوں کی داستان کو بیان کیا۔ اب اس اقتباس کو دیکھیے:

> ''تڑاخ۔۔۔ ایک دھچکا لگا۔۔۔ جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔۔۔ گردوپیش کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں۔ مدھم پڑتی گئیں۔۔۔ ارے، میں تیر رہا تھا۔ بے لہر سمندر میں تیر رہا تھا۔ تیرتا رہا۔ تیرتا رہا۔۔۔ ایک گرداب مجھے کھینچ رہا تھا۔ نیلی سپیدی ختم ہوتی جا رہی تھی۔۔۔ کالا بولا اندھیرا۔۔۔ میں ایک کنویں میں گر رہا تھا۔ گرا جا رہا تھا۔ گرتا رہا۔ گرتا رہا۔۔۔ صدیاں بیت گئیں۔ وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں لاوقت ہو چکا تھا۔
>
> ہوش آیا تو میں ایک وسیع نیلگوں دھندلکے میں ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ حرکت کی سکت نہ تھی۔۔۔ پھر جیسے روشنی کی ایک کرن مجھ پر پڑی۔ اس میں نمو تھی۔ زندگی تھی۔ کرن قریب آتی گئی۔ اور قریب۔ اور قریب۔ میں نے آنکھ کھولی۔ میرے روبرو ایک چہرہ تھا۔ منور چہرہ۔۔۔ میں اٹھ بیٹھا۔ پھر سے بے لہر سمندر میں تیرنے لگا [۳۹]''

آٹھ دس سطروں میں کتنا طویل فاصلہ طے کر لیا گیا ہے۔ زندگی سے رشتہ کیسے تڑاخ

سے ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک جھٹکے کی سی کیفیت۔ حواس رفتہ رفتہ معطل ہو جاتے ہیں۔ انسان پہلے خود کو ایک بے لہر سمندر کی سطح پر تیرتا ہوا محسوس کرتا ہے، پھر کوئی گرداب اسے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور وہ روشنی سے تاریکی کی طرف بڑھتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک بے جہت اندھیرا اسے گھیر لیتا ہے اور پھر اس پر کسی کنویں میں گرنے کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ عام طور پر ادب اور شاعری میں موت کی کیفیت کو بلندی کی طرف پرواز کی تمثیل سے بیان کیا جاتا ہے مگر مفتی نے یہاں بھی بالکل الٹ منظر پیش کیا ہے۔ غالباً یہ منظر انھوں نے پیراسائکالوجی کے تجربات سے اخذ کیا ہوگا یا پھر کسی اور مشاہدے سے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مفتی نے موت کو داخل سے خارج کی بجائے خارج سے داخل تک کا سفر قرار دیا ہو اور موت ان کے نزدیک خود اپنے اندرون کی حقیقت تک رسائی کا سفر ہو۔ یہ کنواں اپنی ہی ذات کا کنواں ہو، جس میں انسان بالآخر گر ہی جاتا ہے۔ الفاظ کی تکرار سے وقت کے طویل تسلسل کو ظاہر کرنے کا انداز نثر کو شاعری کے مرتبے تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کنویں میں گرتے گرتے متکلم کو صدیاں بیت جانے کا احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس غالباً اس فاصلے کے سبب ہے جو اس میں اور گزشتہ زندگی میں پیدا ہو چکا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ "لاوقت" ہو جانے اور وقت کے ختم جانے کا ذکر بھی کرتا ہے۔ یہ دو متضاد باتیں ہیں جو مصنف نے یکجا کر دی ہیں۔ اگر وقت ختم چکا ہے اور وہ خود لاوقت ہو چکا ہے تو صدیاں گزرنے کا احساس باقی نہیں رہنا چاہیے۔ لیکن اس وقت تک متکلم ہوش میں نہیں تھا۔ ہوش آنے پر وہ خود کو بے حس و حرکت ایک وسیع نیلگوں دھندلکے میں ڈھیر پاتا ہے۔ کیا یہ وہی ڈھیر ہے جو تخلیق سے پہلے تھا۔ اسی مشتِ خاک کا ڈھیر، جس نے وجود پہن کر عالم امکانات کی سیر کی اور واپس لوٹ کر پھر اسی بے شکل و صورت ڈھیر میں تبدیل ہو گیا؟ اس اقتباس میں ایک گہرے روحانی تجربے کی بازدید جھلکتی ہے۔

افسانے کا دوسرا منظر میدان قیامت کا ہے جہاں دوسری زندگی کا خیال آتے ہی آواز آتی ہے کہ زندگی نہ پہلی ہے نہ دوسری بلکہ ایک تسلسل ہے۔ ساری زمینیں اور سارے آسمان اسی ایک جہان کا حصہ ہیں۔ اس ادراک کے بعد اسے اپنے اردگرد ہستوں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور پھر اسی حیرت کے عالم میں اس کا "نزائل" شروع ہو جاتا ہے۔ احتساب کا لمحہ۔ محاسبۂ نفس۔ اس محبت کا محاسبہ جو ٹوٹ کر کی گئی مگر اس میں تیاگ نہ تھا، شوکتِ نفس تھی، اس محبت کا محاسبہ جو انا کی تسکین کا ایک ذریعہ تھی، اور کچھ نہ تھی۔ اس محاسبے میں گواہ، خود متکلم کے اندر سے نکل کر آتا ہے اور سزا بھی ملزم کے اندر سے ہی سنائی جاتی ہے۔ بالآخر کہانی کا متکلم بھی

دوسرے بتوں کی طرح پتھر کے بت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں قیامت اور حیات بعد موت کے مذہبی تصورات کو انسانی نفس کی عیاری اور مکر وفریب کا راز فاش کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ بنیادی خیال ظاہری اور باطنی اعمال کے تقابل پر مبنی ہے۔ خیر وشر کا حکم ظاہری اعمال پر لاگو ہوتا ہے لیکن جزا وسزا کا تعلق باطنی اعمال سے ہے۔ یوں تو یہ خیال مذہب کی روح بھی ہے لیکن تصوف میں خاص طور پر اس بات کو اہمیت دی جاتی ہے کہ انسانی اعمال اس کی نیت اور ارادے سے اعتبار پاتے ہیں۔

اور اب ایک ایسی کہانی کا ذکر جو ان کی بہترین سمجھی جانے والی کہانی ''سے کا بند حسن'' کا ابتدائی روپ ہے۔ اس کہانی کا عنوان ''ان پورنی'' ہے اور اس کا مرکزی کردار ایک ایسی عورت ہے جو پیشے کے اعتبار سے طوائف ہے مگر روشن قلب کی مالک ہے۔ جسم کی کثافت میں آلودہ مگر روح کی تابانی اور درخشندگی کی چھوٹ سے دمکتا ہوا وجود لیے ایک ایسے فرد کی علامت ہے جو دنیا میں رہتا ہے مگر دنیا اس کے دل میں نہیں رہتی۔ یہ جسم کے تقاضوں سے روح کی پکار تک کا سفر نامہ ہے۔ سُر اس سفر کا رہنما ہے جو من کے اندر ادھورے پن کے احساس کا کانٹا سا چبھو دیتا ہے اور اسے تکمیل کی تلاش میں مضطرب و بے قرار کر دیتا ہے۔ اور پھر یافت کی ایک منزل ایسی آتی ہے کہ وہ اپنی تلاش اور اس کی منزل سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ ان پورنی اور آنند کمار کے ساتھ ساتھ اس افسانے کا ایک تیسرا غیر مرئی کردار بھی ہے اور وہ ہے سُر یعنی فن۔ فن سے رشتہ استوار ہو جائے اور فنی کمال کی تلاش کا چراغ من میں روشن ہو جائے تو زندگی کو ایک سمت اور جہت مل جاتی ہے۔ وجودی اور مجازی محبتیں فن سے رشتہ استوار کرنے کی راہ ہموار کر دیتی ہیں۔ اور فن مجاز سے حقیقت تک کا سفر طے کروا دیتا ہے اور یوں عرفان اور ادراک کا دائرہ مکمل ہو جاتا ہے۔ یہی اس افسانے کا مرکزی خیال ہے۔

''سے کا بند حسن'' ممتاز مفتی کی خوبصورت ترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔ یہ ''ان پورنی'' کی تکمیلی تمثیل ہے۔ مجاز سے حقیقت تک کا سفر جو فن کے سہارے مکمل ہو جاتا ہے۔ بظاہر ایک ناچنے والی کی کہانی جو جسم کا جھنجھنا نہیں بجاتی تھی، دکھ کی بھیگ میں خود بھی بھیگ جاتی اور سننے والے کو بھی بھگو دیتی۔ سنہری بی بی اس کہانی میں سر یعنی فن کی علامت ہے۔ سر، جو انجانے میں بھی قبلہ راست کر لے تو من کی جوت جگا دیتا ہے اور تن کے کھوٹ سے نکال کر لے اڑتا ہے، مجاز سے حقیقت تک کے اس سفر کا رہنما ہے۔ ظاہر سے باطن اور وجود سے ذات کی یہ مسافت فن کی پوترتا سے سپل ہو جاتی ہے۔ اور یہی جیون کا کارن ہے، یہی زندگی کا سب سے

بڑا مقصد ہے۔ مادے کی سطح سے اٹھ کر روح کی لطافت اور وسعت کو چھو لینا ہی زندگی کی معراج ہے۔

ممتاز مفتی نے اس خاص تھیم کے اظہار کے لیے ہندی دیو مالائی تناظر اور طوائف کے کردار کا بار بار سہارا لیا ہے۔ ''ان پورنی'' اور'' سمے کا بندھن'' کے علاوہ ''ایک ہاتھ کی تالی'' (سمے کا بندھن ۱۹۸۶) اور'' سیڑھی سرکار'' (سمے کا بندھن ۱۹۸۶) میں بھی مجاز سے حقیقت تک کا سفر بیان کیا گیا ہے۔ وجود کی کثافت سے نکل کر روح کی لطافت پا لینے کے لیے نفس کو ذلت اور پامالی کا امتحان دینا پڑتا ہے۔ انسان کا نفس اسے خود پسندی اور انا کی تسکین پر اکساتا ہے۔ انا پرستی ہی کو وہ کبھی محبت کا نام دیتا ہے تو کبھی ایثار و قربانی کا ڈھونگ رچاتا ہے لیکن انا کا سانپ پھنکارتا رہتا ہے۔ اس سانپ کا سر کچلنے کے لیے نفس کی تذلیل کا مجاہدہ ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی روح میں تب و تاب پیدا ہوتی ہے اور جب ایک بار بے غرضی اور نفس کشی کی منزل سر ہو جائے تو زندگی میں ہی نہیں، مرنے کے بعد، اس کی خاک میں بھی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ ''ایک ہاتھ کی تالی'' کے جمال اور کمال، کشتۂ عشق ہیں تو'' سیڑھی سرکار'' لذتِ درد فراق کے اسیر۔ سچی طلب، خواہ وہ مجازی محبوب ہی کی کیوں نہ ہو، ایسی منزل پر لے جاتی ہے کہ انسان بالآخر محبوب سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس کا دل کسی اور بے نیاز سے جا اٹکتا ہے۔ یہ ممتاز مفتی کا پسندیدہ موضوع ہے اور انھوں نے بار بار اسے پیش کیا ہے۔

گرو داس، داس گرو (سمے کا بندھن ۱۹۸۶) میں ممتاز مفتی نے ایک انوکھا خیال پیش کیا ہے۔ تصوف میں گرو اور بالکے یا مرشد اور طالب کا رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تعلق کامل اطاعت اور تسلیم و سپردگی کا طالب ہے۔ گرو یا مرشد کی نافرمانی خیال میں بھی ہو تو فیض رسانی متاثر ہو سکتی ہے۔ لیکن اس افسانے میں ممتاز مفتی نے اس تعلق کو الٹ کر رکھ دیا ہے۔ انھوں نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ بیسویں صدی میں گرو داس نہیں بلکہ داس گرو اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نئی نسل کسی کی اطاعت قبول کرنے کو تیار نہیں۔ جدیدیت نے اس کے ذہن کو آزادی کی ایسی لت لگا دی ہے کہ اسے کوئی پابندی منظور نہیں۔ وہ کسی کو اپنا مرشد نہیں مان سکتی۔ اب اگر اسے متاثر کرنا، اس کا رُخ بدلنا اور اسے سمت دینا مقصود ہو تو اس کے آگے نہیں، پیچھے پیچھے چلنا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح چرواہا، بھیڑوں کے پیچھے چل کر انھیں ایک خاص سمت میں سفر کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ گویا زمانے کی ہوا نے رسمیاتِ تصوف کو بھی بدل ڈالا ہے۔ اب صوفیا کو بھی اپنا طرز نئی نسل کی ذہنی و فکری سطح اور ضروریات کے مطابق

ڈھالنا ہوگا۔ راہ تو ایک ہی ہے، چاہے آگے چل کر دکھاؤ، یا پیچھے چل کر۔

''یچ ہے سادھنی! مدعا تو ایک ہی ہے پر ڈھونگ بدلتے رہتے ہیں۔ جیسا سمے ویسا ڈھونگ۔ پرانے سمے میں لوگ کہتے تھے، کوئی آگے چلے، راستہ دکھائے، گرو بنے۔ اب سمے بدل گیا ہے۔ پیچھے چلنے والے لوگ نہیں رہے۔ اب ایسا گرو چاہیے، جو پیچھے چلے گا۔''

دوسری نمایاں تقسیم جوان کے آخری دو مجموعوں میں بہ تکرار پیش کی گئی ہے، انسان کی خود آگاہی کی تمنا اور اس راہ میں درپیش خطروں، دھوکوں اور واہموں سے متعلق ہے۔ ''یتی اور عفریت'' (سمے کا بندھن ۱۹۸۶)؛ ''معروف فارانی'' (کہی نہ جائے ۱۹۹۲)، ''دکھن دکھن'' (کہی نہ جائے ۱۹۹۲) ''پھیلاؤ کی زیر لبی'' (کہی نہ جائے ۱۹۹۲) اور ''چوبا'' (کہی نہ جائے ۱۹۹۲) اسی تقسیم پر بنیاد رکھتے ہیں۔

''یتی اور عفریت'' کا کلیدی مسئلہ یہ ہے کہ انسان اپنی ''میں'' کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ ان کی زندگی اس بوجھ کے ہاتھوں ایک مسلسل عذاب بن جاتی ہے، مگر وہ اس سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہوتے۔ لیکن جوں ہی اس بوجھ سے نجات حاصل ہو جائے، ان کے سارے مسائل ہوا ہو جاتے ہیں۔ اس بوجھ سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان خود اپنی حقیقت کا سامنا کرے اور اس سے نظریں نہ چرائے۔ عرفان ذات انسان کو اس کے اندیشوں اور فکروں سے آزاد کر دیتا ہے اور یہی اس کا مقصود حیات بھی ہے۔ ایک یوٹریٹ کی مدد سے اس تجریدی حقیقت کو حسی تجربے کے طور پر بیان کر کے ممتاز مفتی نے اپنی فنی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ پلاٹ کی اٹھان، کشاکش اور کلائمکس کے مراحل افسانے کو ڈرامے کے فن کے قریب تر لے آتے ہیں۔

''معروف فارانی'' میں اسی حقیقت کو ایک اور انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بعض اوقات انسان اپنی ذات کی وحدت میں بھی کثرت کا روگ پال بیٹھتا ہے۔ اس میں دوولی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ چاہتا کچھ اور ہے، کرتا کچھ اور ہے۔ اس کی توانائیاں منتشر ہو جاتی ہیں اور اس کی ذات بٹ کر رہ جاتی ہے۔ اس افسانے کی بنت کمزور ہے اور پلاٹ کی تعمیر میں ممتاز مفتی کی گرفت ڈھیلی معلوم ہوتی ہے۔ کہانی مکالموں کے ذریعے آگے بڑھنے کی بجائے بکھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے موضوع کا انتشار اس کی ہیئت پر بھی اثر انداز ہو گیا ہے۔

''دکھن دکھن'' میں کائنات کی نیرنگی کو ایک پردہ کہا گیا ہے جو ذات واحد نے خود پر اوڑھ

رکھا ہے۔ اگر کوئی یہ پردہ اٹھا دے تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔ نہ دکھ، نہ سکھ، نہ روشنی نہ اندھیرا۔ کثرت کا کھیل ختم ہو جاتا ہے اور وحدت کی بے کرانی باقی رہ جاتی ہے۔ زندگی کے یہ سارے لوبھ، لالچ، پیار محبت، حرص و ہوس محض ایک فریب ہیں۔ انھی کی بدولت زندگی کے دیے میں لو باقی ہے۔

''پھیلاؤ کی زیربلی''میں''میں'' کے بوجھ سے آزاد ہونے کا یہ نسخہ بتایا گیا ہے کہ کسی پھیلاؤ میں جا رہو، چاہے وہ پھیلاؤ پانی کا ہو، ریت کا یا آسمان کا۔ اور''چوبا'' کا مرکزی خیال یہ ہے کہ دھیان خود سے ہٹا کر کسی دوسرے پر لگا دو چاہے وہ پیر ہو، فقیر ہو، یا چوبا۔ خود سے گزر کر ہی خود کو پایا جا سکتا ہے۔

بوتل کا کاگ (کبھی نہ جانے ۱۹۹۲) ایک مابعدالطبیعیاتی تجربے کا بیان ہے۔ کہانی کا مرکزی خیال یہ ہے کہ صوفیانہ وجد و مستی کی واردات کے دوران کسی ایک فرد کی قلبی حالت، اس کے اردگرد موجود لوگوں کے قلوب پر بھی اثرانداز ہوتی ہے اور ایک انفرادی جذبے کی شدت، اجتماعی حال بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مزاروں پر قوالیوں اور صوفیانہ مستی کے دیوانہ وار رقص کے دوران، وہاں موجود دیگر افراد کے دل و دماغ بھی اس چکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان پر بھی وہی سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو انھیں نفس کی سطح سے اوپر اٹھا کر لطیف ترین سطح وجود تک لے جاتی ہے۔ مگر اس کہانی کا فنی پہلو کچھ کمزور معلوم ہوتا ہے۔

ممتا کا بھید (کبھی نہ جانے ۱۹۹۲) میں انھوں نے خدا کو''جگت ماں'' کے روپ میں پیش کیا ہے۔ بظاہر یہ افسانہ عورت کی مادرانہ حیثیت کو اس کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں پر فائق ثابت کرتا ہے لیکن اس کی تہ میں خدا کی مادرانہ شفقت کا اظہار مقصود ہے۔ جگ ماں مندر کی گھنٹیاں افسانے کا مرکزی استعارہ ہیں۔ ایک نیم تاریخی، اساطیری نوعیت کا واقعہ، جدید زندگی کے کرداروں کے لیے ایک علامتی پیٹرن فراہم کرتا ہے جس کی مدد سے حال کی معنویت اجاگر ہوتی ہے۔ عورت بھی ماں بن کر، ناری سے بڑھ کر''نوری'' بن جاتی ہے۔ لیکن ماں بننا کوئی حیاتیاتی وقوعہ نہیں، یہ انا کی اسیری سے رہائی پا جانے کا نام ہے۔ یہ حرکت اور اضطراب سے نکل کر ٹھہراؤ اور سکون کی طمانیت کی طرف لوٹ آنے کا اقدام ہے۔ شہر جدید طرز زندگی کی علامت ہے جہاں کی گھڑیاں تیز تر ہوتی جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی شہر کی زندگی بھی اتنی ہی تیز رفتار ہو جاتی ہے۔ ناریاں اس رفتار کا ساتھ دینے کے لیے بھاگ کھڑی ہوتی ہیں لیکن جس میں ممتا جاگ اٹھے وہ محبت مانگتی نہیں، بانٹتی ہے۔ یہ محبت، یہ ممتا دراصل اسی جگت ماں کے نور

کی ایک کرن ہے جو اس نے ماں کو دان کر دی ہے۔ افسانے کی فضا پر اسماء و افعال کی علامتی حیثیت چھائی رہتی ہے اور کہانی کا ظاہری پیٹرن اس کے علامتی پیٹرن تلے دبا دبا نظر آتا ہے۔

اس کے مقابلے میں: "کہانی کی تلاش" سادہ بیانیہ تکنیک میں لکھا گیا ایک افسانہ ہے جس میں دو افراد کے درمیان مکالمے سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ اس مکالمے کی نوعیت بالکل ایسی ہے جیسی ٹیلی ویژن کی دستاویزی فلموں کے ساتھ ساتھ سنائی دینے والی آواز کی ہوتی ہے۔ ہر بدلتے منظر پر تبصرہ، رائے اور گفتگو اس کا حصہ ہے۔ ایک کہانی نویس اپنی کہانی کے لیے کسی موضوع کی تلاش میں ہے اور اس کا ایک دوست جس کا نہ کوئی نام ہے، نہ چہرہ، نہ شناخت، اسے مختلف موضوعات پر لکھنے کی دعوت دیتا ہے تاہم یہ مرکزی نکتہ، جسے مصنف نے "کہانی" کہا ہے، محض "کہانی" معلوم نہیں ہوتا۔ یہ تو کہانی کار کا نظریہ فن معلوم ہوتا ہے جو اس کی ذات کی توسیع کر کے اسے اپنی بات سے زیادہ دوسروں کی بات کہنے پر اکساتا ہے۔ کہیں کہیں یہ انسان کی باطنی شخصیت کی علامت بن جاتی ہے۔ گویا کہانی کار کو بظاہر کہانی کی تلاش ہے مگر کہانی کے پردے میں وہ خود اپنی ذات کو بے حجاب دیکھنا چاہتا ہے۔ کہانی کا فن اسے اپنی بازیافت کی سعی پر مامور کر دیتا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بازیافت خود اپنے آپ پر توجہ مرکوز کرنے سے نہیں ہوتی۔ خود کو پانے کے لیے اپنی توجہ اور دھیان کو دوسرے پر مرکوز کرنا پڑتا ہے۔ "میں" کو پانے کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ "تو" سے گزرتا ہے۔ بظاہر یہ الٹی بات معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہم سب یہی سنتے آئے ہیں کہ "تو" کا عرفان "میں" کی پہچان سے مشروط ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

اس افسانے میں اس کلیدی تقسیم کے علاوہ بھی ایک بات بہت توجہ طلب ہے۔ ممتاز مفتی کے فنی شعور کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی رہا ہے کہ وہ کہانی کی ظاہری چال کو متاثر کیے بغیر، اپنی بات کو ضمناً، کسی خود کلامی یا ثانوی راوی کے ادھر ادھر کے تبصروں کے ذریعے کہہ گزرتے ہیں۔ دراصل ان کے افسانوی ارتقا کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا فن ان کے ذاتی تجربات اور سوانح سے شدت سے متاثر ہوتا ہے۔ ممتاز مفتی نے جب بھی کوئی کہانی لکھی ہے وہ ان کے اس دور کی ذہنی کیفیت، سوچ اور جذباتی حالت کی ترجمان رہی ہے۔ اس بات کا اندازہ نہ صرف ان کی خود نوشت پڑھ کر ہوتا ہے بلکہ ان کے ذاتی روزنامچے بھی اس کے گواہ ہیں۔ کہانی ان کے لیے اپنی ذات کے اظہار کا براہ راست ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ اپنی اس عادات کو انھوں نے کئی جگہ پر تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ اس افسانے میں بھی کہانی کے

راوی کا ساتھی اسے تنبیہ کرتا ہے:

''اپنی ڈگڈگی بجاتا رہا؟ کہانی اپنی بات نہیں ہوتی'' وہ بولا'' دوجوں کی بات ہوتی ہے۔ کیا تم اپنی بات کرنے سے کبھی نہیں اکتاتے [۴۱]''۔

یہ خود احتسابی ان کے افسانوں میں بار بار ابھرتی رہی ہے۔ اس سے قطع نظر بھی انھوں نے اپنے افکار و خیالات کا اظہار کہانیوں کے پردے میں بار بار کیا ہے۔ اس افسانے ''کہانی کی تلاش'' کا انجام بھی کچھ ایسا ہی ہے جو ان کی ذہنی کایا پلٹ کی چغلی کھاتا ہے۔ کہانی کا راوی اپنی کہانی کے لیے کسی موضوع کی تلاش میں ہر طرف دیکھتا ہے لیکن ہر موضوع اسے پھیکا اور بے جان نظر آتا ہے۔ سچ بھی یہی ہے کہ عمر کی آٹھویں دہائی میں، آٹھویں افسانوی مجموعے کی کہانی کے لیے کوئی نئی بات تلاش کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن ممتاز مفتی بھی آخر ممتاز مفتی ہی ہیں۔ جب ان کا ساتھی ان کی توجہ جھلمل کرتے دربار کی طرف مبذول کرواتا ہے اور انھیں کسی صوفی بزرگ پر کہانی لکھنے کا مشورہ دیتا ہے تو وہ نہایت ادب سے اسے بھی رد کر دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ:

''یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ یہ داتا لوگ ہیں۔ بزرگ ہیں۔ اللہ والے ہیں۔ یہ چوتھی سمت میں جیتے ہیں۔ زیادہ دیکھتے ہیں۔ زیادہ سنتے ہیں۔ زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ زمان اور مکاں سے بے نیاز ہیں۔ ان کا میں احترام کرتا ہوں لیکن میں ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ ان کے بارے میں میں منھ کھولوں۔ نہ نہ نہ بھائی، چھوٹا منھ، بڑی بات [۴۲]''

اس پر راوی کا ساتھی غصے میں آ جاتا ہے اور اسے داتاؤں، سرکار قبلاؤں اور باباؤں کی کرامتوں کے چھنکنے چھنکانے کی بجائے، ان کے اندر چھپے ''بندے'' کی بات کرنے پر اکساتا ہے۔ باتیں کرتے کرتے وہ ایک درگاہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور درگاہ کا متولی زیر لب بڑبڑاتا ہے:

''وہ بندہ تو ایک ہی ہے۔ ایک ہی ہے جسے دو جہانوں کا مالک بنا دیا گیا پر وہ بندہ بن کر جیا۔ صرف بندہ بن کر۔ نہ بابا بنا، نہ سرکار قبلہ، نہ داتا بنا، نہ کرامتیہ بنا، نہ معجزاتی بنا، صرف بندہ۔ صرف بندہ۔ صرف بندہ۔ صرف بندہ۔ گنبد چلایا۔
صرف بندہ۔ صرف بندہ۔ باہر سے یوں آواز آئی جیسے آسمانوں میں گنبد کی آواز کی گونج تھرا رہی ہو۔ ساری کائنات اس گونج سے بھری ہوئی تھی۔ صرف بندہ۔ صرف بندہ [۴۳]''

اس اقتباس میں مستی اور سرشاری کی جو کیفیت ہے وہ صوفیانہ جذب سے مختلف ہے۔ عشق رسول اور ادب واحترام کے تقاضے دونوں اس سے جھلکتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس فکری تبدیلی کے آثار بھی نظر آتے ہیں جو بعد میں ان کی کتاب "تلاش" میں نمایاں ہوئی اور جس میں واضح طور پر انھوں نے متصوفانہ تجربے سے آگے بڑھ کر، قرآنی تعلیمات کو مقصود حیات بنانے کی تلقین کی ہے۔

کیا ممتاز مفتی کے ان افسانوں میں کسی صوفی منش انسان کی جھلک نظر آتی ہے یا نہیں، یہ فیصلہ کرنا اب آپ کا کام ہے لیکن اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ایک جدید نقاد، مرزا حامد بیگ کی صوفی کے بارے میں رائے بھی دیکھ لیجیے:

"۔۔۔ ماورائی سرحدوں کی حد بندیوں سے بے نیاز، ہر زمانے میں وہ بظاہر ایک باغی ہے جو ظاہرداری (کہ دلوں کو مردہ کر دیتی ہے) روا نہیں رکھتا۔ اس کی آواز معاشرے کے سخت گیر اصولوں کے خلاف ایک باغیانہ لحن ہے، اس کی نظر ظاہر اور باطن دونوں پر یکساں ہے، وہ لفظ کے مقابلے میں معنی پر زور دیتا ہے اور "شر" میں "خیر" کے پہلو ڈھونڈتا ہے۔ وہ دنیاداری سے دور رہتا ہے لیکن دنیا کی اصل اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں [۲۶]"

اور اس سے ذرا پہلے محمد حسن عسکری (۱۹۱۹۔ ۱۹۷۸) کا ایک مضمون بھی دیکھ لیجیے جس میں انھوں نے کرکیگور (۱۸۱۳۔ ۱۸۵۵) اور ابن عربی کا تقابل کر کے مغربی روحانیت اور مشرقی مابعد الطبیعیاتی تہذیب کا فرق بہت خوب صورتی سے نمایاں کیا ہے [۲۷]۔ ممتاز مفتی کے ان افسانوں کی فضا میں مشرقی تہذیب کی روح کی خوشبو بسی ہوئی ہے جس کی بنیاد مابعد الطبیعیات سے گہرے اور بنیادی رشتے پر استوار ہوتی ہے۔ شاید کچھ لوگ اسے مردہ ماضی کی بازیافت کا طعنہ دیں لیکن مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ مردہ ماضی نہیں بل کہ سائنس کا مستقبل ہے جس پر ہمیں تب یقین آئے گا جب مغرب اس کی بازیافت کر کے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دے گا۔ عکسی مفتی کی کتاب Allah: Measuring the Intangible اس حقیقت پر سائنسی انداز میں روشنی ڈالتی ہے۔

نجیبہ عارف

(اسلام آباد)

٭٭٭

حواشی

۱۔ نصر، ۲۰۰۵ء، Living Sufism، vii، ۱

۲۔ ایضاً، ۲

۳۔ چِٹک، ۲۰۰۷ء، Science of the Cosmos, Science of the Soul: Pertinence of Islamic Cosmology in the Modern World، باب دوم

۴۔ پَرکسن، ۱۹۹۵ء، Plastic Words: The Tyranny of Modular Language، ۸، ۳۵

۵۔ گَرڈنر، ۱۹۱۵ء، Al- Ghazali's "Mishkat al Anwar: The Niche for Lights، ۷۱

۶۔ شمل، ۲۰۰۶ء، Mystical Dimensions of Islam، ۱۲۔۱۳

۷۔ انڈرہل، ۲۰۰۳ء، Mysticism: A study in the nature and development of man's spiritual consciousness، ۳۰

۸۔ اقبال (۱۸۷۷۔۱۹۳۸) نے بھی تو یہی کہا تھا ۔ یا مجھے ہم کنار کر، یا مجھے بے کنار کر ۔ کلیات اقبال، ۲۹۹

۹۔ شخصی خدا کی بجائے ایک ایسی قوت تخلیق پر ایمان رکھنا جو پوری کائنات میں ایک تخلیقی قوت کی صورت جاری و ساری ہے۔

۱۰۔ نکلسن، ۱۹۶۴ء، The Idea of Personality in Sufism، ۱۷

۱۱۔ ایضاً، ۲۰۔۲۶، نیز ابن فرید کی شاعری کے مفصل تجزیے کے لیے نکلسن، ۱۹۷۸ء، Studies in Islamic Mysticism، ۱۶۲۔۱۹۹

۱۲۔ آربری، ۱۹۷۹ء، Sufism: An Account of the Mystics ofIslam

۱۳۔ مراد، چِٹک، ۲۰۰۸ء، اسلام اپنی نظر میں، ۲۵۔۲۷

۱۴۔ چِٹک، ۲۰۰۵ء، Sufism:A Short Introduction، ۴۔۸

۱۵۔ لنگز، ۱۹۸۳ء، What is Sufism، ۱۳

۱۶۔ طوسی، ۲۰۰۲ء، مقدمہ کتاب اللمع، مترجمہ پیر محمد حسن، ۱۴

۱۷۔ ایضاً، ۳۵

۱۸۔ ابن عربی، ۱۹۹۳ء، فصوص الحکم، ۶۱

۱۹۔ ایضاً، ۲۳۳۔۲۳۴

۲۰۔ ہجویری، ۱۹۷۸ء، کشف المحجوب، ۱۲۰

۲۱۔ مفتی،۱۹۸۶،مرام دہین، ۱۸۷
۲۲۔ ایضاً،۱۸۳۔۱۸۵
۲۳۔ مفتی۔۱۹۸۹،مفتیانے، ۳۳۸
۲۴۔ ایضاً،۱۰۱۰۔۱۰۱۱
۲۵۔ مفتی،۱۹۸۸،غبارے، ۹۸۔۱۰۳
۲۶۔ مفتی،۱۹۹۱،علی پور کا ایلی،۲۱
۲۷۔ احمد،۱۹۹۶،فکشن نگار. ممتاز مفتی،۲۳۳۔۲۳۸
۲۸۔ مفتیانے ،۱۰۱۳
۲۹۔ ان کا پانچوں مجموعہ گڑیا گھر ۱۹۵۶ء میں رائٹرز گلڈ اشاعت گھر، کراچی سے شائع ہوا تھا۔
۳۰۔ عکسی مفتی،۱۹۸۳،طلیپ، روغنی پتلے
۳۱۔ مفتی،۱۹۸۳،روغنی پتلے ۷۔۸
۳۲۔ مفتیانے ۶۹۔۸۵
۳۳۔ تمام نقاد اس امر پر متفق ہیں کہ کسی مصنف کے فن پارے یا ادبی تحریر کو اس کی ذاتی سوانح سمجھ کر نہیں پڑھنا چاہیے۔ ممتاز مفتی کا فن ان کی سوانح سے کس قدر متعلق یا غیر متعلق ہے، اس بات پر ایک علیحدہ مضمون میں بحث کی جاسکتی ہے کیوں کہ ان کی وفات کے بعد ان کے سامان سے، پچاس سالوں کے عرصے پر محیط ان کے جو ذاتی روزنامچے ملے ہیں ان میں انھیں پیش آنے والے ایسے بے شمار واقعات کا بیان ملتا ہے جنھیں انھوں نے اپنے افسانوی ادب میں جوں کا توں بیان کر دیا ہے اور یہ بات ان کے فن اور ذاتی زندگی کے غیر معمولی تعلق کو ثابت کرتی ہے۔ یوں تو کہا جا سکتا ہے کہ ہر لکھنے والے کا ادب اس کے ذاتی تجربات و مشاہدات کی دین ہوتا ہے لیکن ممتاز مفتی کے معاملے میں یہ تعلق قدرے غیر معمولی نوعیت کا ہے۔
۳۴۔ مفتی،۱۹۹۲،الکھ نگری،۱۵،۱۵،۳۷۱۔۳۷۲،۳۷۴۔۳۷۵
۳۵۔ مفتیانے، ۱۱۶۰
۳۶۔ ایضاً
۳۷۔ ایضاً
۳۸۔ ایضاً،۱۱۶۵
۳۹۔ ایضاً،۱۳۳۲
۴۰۔ ایضاً،۱۳۴۰
۴۱۔ مفتی،۱۹۹۲،کہی نہ جائے،۲۱
۴۲۔ ایضاً،۲۲
۴۳۔ ایضاً،۲۳
۴۴۔ بیگ،۱۹۸۶، اردو اور صوفی ازم،۸۰
۴۵۔ عسکری،۲۰۰۸،مجموعہ محمد حسن عسکری، ۵۷۴۔۶۰۲
۴۶۔ عکسی مفتی کی مذکورہ کتاب اور اس کا اردو ترجمہ زیر طبع ہیں۔ ۲۰۱۱

ماخذ

آربری، اے۔ جے۔ (A. J. Arberry)، ۱۹۷۹(۱۹۵۰)، Sufism: An Account of the Mystics of Islam، لندن: ان ون

ابن العربی، شیخ اکبر محی الدین، ۱۹۹۳، فصوص الحکم، مترجمہ مولانا عبدالقدیر صدیقی، لاہور: پروگریسو بکس

احمد ندیم، ۱۹۹۶، فکشن نگار ممتاز مفتی، لاہور: دستاویز مطبوعات

ارنسٹ، کارل ڈبلیو (Carl W. Ernst)، ۲۰۰۰(۱۹۹۷)، The Shambhala Guide to Sufism، نئی دلی: روپا اینڈ کمپنی

اقبال، محمد، ۱۹۸۸، کلیات اقبال (اردو)، لاہور، حیدرآباد، کراچی: شیخ غلام علی اینڈ سنز

انڈرہل، ایولن (EvelynUnderhill)، ۲۰۰۳(۱۹۱۱)، Mysticism: A study in the nature and development of man's spirtual consciousness، مونتانا: کسنجر پبلشنگ

بیگ، ڈاکٹر مرزا حامد، ۱۹۸۶، اردو اور صوفی ازم، لاہور، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

پورکسن، اووے (Uwe Poerksen)، ۱۹۹۵(۱۹۸۸)، Plastic Words، مترجمہ جوتا میسن، ڈیوڈ کیلی (Jutta Mason, David Cayley)، امریکہ: پنسلوینیا سٹیٹ یونیورسٹی

جہانگیری، محسن، ڈاکٹر، ۱۹۸۹، محی الدین ابن عربی: حیات و آثار، مترجمہ احمد جاوید، سہیل عمر، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ

چٹک، ولیم سی۔ (William C. Chittick)، ۲۰۰۵(۲۰۰۰) Sufism: A Short Introduction، لاہور: سہیل اکیڈمی

شمل، این میری (Annemarie Schimmel)، ۲۰۰۹، Mystical Dimensions of Islam، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز

طوسی، ابونصر سراج، ۲۰۰۲، کتاب اللمع فی التصوف، مترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی

عسکری، محمد حسن، ۲۰۰۸، مجموعہ محمد حسن عسکری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز

قشیری، ابوالقاسم، ۲۰۰۳، Principals of Sufism: Al- Risalah al Qushayriah، مترجمہ بی۔ آر۔ فان شلیگل (B.R. Von Schlegell)، لاہور: سہیل اکیڈمی

قشیری، ابوالقاسم، ۲۰۰۹، رسالہ قشیریہ، مترجمہ پیر محمد حسن، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی

اسلامی یونی ورسٹی

گرڈنر، ڈبلیو۔ ایچ۔ ٹمپل (W.H. Temple Gairdner)، ۱۹۱۵ء، Al- Ghazali's "Mishkat al Anwar: The Niche for Lights، لندن

لنگز، مارٹن (Martin Lings)، ۱۹۸۳ء (۱۹۷۵)، What is Sufism?، لاہور: سہیل اکیڈمی

مراتا، ساچیکو (Sachico Murata)، چٹک، ولیم۔ سی۔ (William C. Chittick)، ۲۰۰۸ء، اسلام اپنی نگاہ میں، مترجمہ محمد سہیل عمر، اسلام آباد، ادارۂ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، لاہور: اقبال اکادمی، پاکستان

مفتی، عکسی، ۲۰۱۱ء، مسودہ Allah: Measuring the Intangible، مملوکہ عکسی مفتی، اسلام آباد

مفتی، ممتاز، ۱۹۸۶ء، رام دین، لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ

______، ۱۹۸۸ء، غبارے، لاہور: مکتبۂ اردو

______، ۱۹۸۹ء، مفتیانے، لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ

______، ۱۹۹۱ء، علی پور کا ایلی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز

______، ۱۹۹۲ء، الکھ نگری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز

______، ۱۹۹۲ء، کہی نہ جائے، لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ

نصر، سید حسین، ۲۰۰۵ء، Living Sufism، لاہور: سہیل اکیڈمی

نکلسن، آر۔ اے (R. A. Nicholson)، ۱۹۷۹ء (۱۹۱۴)، The Mystics of Islam، لاہور، اسلامک بک سروس

__________، ۱۹۷۸ء (۱۹۲۱)، Studies in Islamic Mysticism، لندن، نیو یارک، میلبورن: کیمبرج یونی ورسٹی پریس

__________، ۱۹۶۴ء (۱۹۲۳)، The Idea of Personality in Sufism، لاہور: شیخ محمد اشرف

ہجویری، علی بن عثمان، ۱۹۸۰ء، کشف المحجوب، مترجمہ مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری، لاہور، اسلامک بک فاؤنڈیشن

☆

آپا

جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے سامنے ایک چھوٹا سا بلوری دیا آ جاتا ہے جو مدھم لو سے جل رہا ہو۔

مجھے یاد ہے ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے تھے میں آپا اور امی جان کہ چھوٹا بدو بھاگتا ہوا آیا۔ ان دنوں بدو یہی چھ سات سال کا ہو گا کہنے لگا:

''امی جان میں بیاہ کروں گا۔''

''واہ ابھی سے؟'' اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگیں ''اچھا بدو تمہارا بیاہ آپا سے کر دیں گے۔''

''اونہوں'' بدو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اماں کہنے لگیں ''کیوں آپا کو کیا ہے؟''

''ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔'' بدو نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگیں ''کیوں دیکھو تو آپا کیسی اچھی ہیں۔''

''میں بتاؤں کیسی ہیں؟'' وہ چلایا۔

''ہاں بتاؤ تو بھلا'' اماں نے پوچھا۔ بدو نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ چولھے پر آ رکی۔ چولھے میں اُپلے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ بدو نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا ''ایسی'' پھر بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگا ''اور چھاجو باجی ایسی۔''

اس بات پر ہم سب دیر تک ہنستے رہے اتنے میں تصدق بھائی آ گئے۔ اماں کہنے لگیں ''تصدق بدو سے پوچھو تو کہ آپا کیسی ہیں'' آپا نے تصدق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا تو منہ موڑ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ہنڈیا پکانے میں منہمک ہو۔

"ہاں تو کیسی ہیں آپا بدو؟" وہ بولے۔

"بتاؤں" بدو چلایا اور اس نے اُپلے کا ٹکڑا اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اسے ہاتھ میں لے کر ہمیں دکھانا چاہتا تھا مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی: "اونہوں" بدو رونے لگا تو اماں کہنے لگیں۔ "بچے اسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے اس میں چنگاری ہے۔"

"وہ تو جلا ہوا ہے اماں" بدو نے بسورتے ہوئے کہا۔ اماں بولیں "میرے لال تمہیں معلوم نہیں اس کے اندر تو آگ ہے۔" اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ "میں کیا جانوں" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی اور پھکنی اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں بے مصرف پھونکیں مارنے لگی۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جیتی تھی اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق تھیں کہ بات اُبھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز بدو نے کیسے پتے کی بات کی تھی۔ مگر میں کہا کرتی تھی "آپا تم تو بس بیٹھو رہتی ہو" اور وہ مسکرا کر کہتی "پگلی" اور اپنے کام میں لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی اُسے کسی نہ کسی کام کو کہہ دیتا اور ایک ہی وقت میں اسے کئی کام کرنے پڑ جاتے۔ ادھر بدو چیختا "آپا میرا دلیہ" اُدھر ابا گھورتے سجادہ ابھی تک چائے کیوں نہیں بنی۔ بیچ میں اماں بول اٹھتی "بیٹا دھوبی کب سے باہر کھڑا ہے" اور آپا چپ چاپ سارے کاموں سے نپٹ لیتی۔ یہ تو میں خوب جانتی تھی مگر اس کے باوجود جانے کیوں اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا کام کرتی ہے مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی ہی رہتی ہے اور اسے ادھر سے اُدھر گردن موڑنے میں بھی اتنی دیر لگتی ہے اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مسکرا دیا کرتی تھی اور بس۔ البتہ وہ مسکرایا اکثر کرتی تھی۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ہاں تو میں سمجھتی تھی کہ آپا چپکی بیٹھی ہی رہتی ہے۔ ذرا نہیں ہنستی اور بن چلے لڑھک کر یہاں سے وہاں پہنچ جاتی ہے جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ کتنے مزے میں چلتی تھی جیسے دادرے کی تال پر ناچ رہی ہو اور اپنی خالہ زاد بہن ساجو بجی کو چلتے دیکھ کر تو میں کبھی نہ اکتاتی۔ جی چاہتا تھا کہ باجی ہمیشہ میرے پاس رہے اور چلتی چلتی اسی طرح گردن موڑ کر چھم آواز میں کہے، ہیں جی کیوں جی؟ اور اس کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگیں۔ باجی کی بات مجھے کتنی پیاری تھی۔

ساحرہ اور ثریا ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں دن بھر ان کا مکان ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا۔ جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بس میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں کے گھر جا رہوں۔ ہمارے گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ایک بیٹھو رہنے والی آپا، ایک یہ کردو وہ کردو والی اماں اور دن بھر حقے پر گڑگڑ کرنے والے ابا۔

اس روز جب میں نے ابا کو امی سے کہتے ہوئے سنا سچ تو یہ ہے، مجھے بے حد غصہ آیا۔ ابا کہنے لگے
''سجادہ کی ماں معلوم ہوتا ہے ساحرہ کے گھر میں بہت سے برتن ہیں۔''
''کیوں'' اماں نے پوچھا۔
کہنے لگے ''بس تمام دن برتن ہی بجتے رہتے ہیں اور یا قہقہے لگتے ہیں جیسے میلہ لگا ہو۔''
اماں تنگ آ کر بولیں ''مجھے کیا معلوم، آپ تو بس لوگوں کے گھر کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔''
ابا کہنے لگے ''افوہ، میرا تو مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی برتن بجنے لگے۔ بازار کے اس موڑ تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ فلاں گھر میں لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ مگر دیکھو تا ہماری سجادہ میں یہ بات نہیں۔'' میں نے ابا کی بات سنی اور میرا دل کھولنے لگا۔ بڑی آئی ہے سجادہ جی ہاں۔ اپنی بیٹی جو ہوئی۔ اس وقت میرا دل چاہتا تھا کہ جا کر باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا منہ چڑاؤں۔ اسی بات پر میں نے دن بھر کھانا نہ کھایا اور دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ آخر ابا جانتے ہی کیا ہیں، بس حقہ لیا اور گڑ گڑ کر لیا یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور گنگنانے لگے۔ جیسے کوئی بھٹیارن مکی کے دانے بھون رہی ہو۔ سارے گھر میں لے دے کے صرف تصدق بھائی ہی تھے جو دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے اور جب ابا گھر پر نہ ہوتے تو وہ بھاری سی آواز میں گایا بھی کرتے تھے۔ جانے وہ کونسا شعر تھا۔۔۔۔ ہاں،

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں نمی سی ہے
نازک سی نگاہوں میں نازک سا افسانہ ہے

آپا انہیں گاتا ہوا سن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی تو وہ بدو کو ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی ''بدو رونا'' اور پھر آپ ہی آپ بیٹھی مسکراتی رہتی۔
تصدق بھائی میرے پھوپھا کے بھائی تھے۔ انہیں ہمارے گھر آئے یہی دو ماہ ہوئے ہوں گے۔ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ بورڈنگ میں رہا کرتے تھے پھر ایک دن جب پھوپھی آئی ہوئی تھیں تو باتوں میں ان کا ذکر چھڑ گیا۔ پھوپھی کہنے لگیں بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں، لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اماں اس بات پر خوب لڑیں کہنے لگیں، اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب، پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اماں کی تو عادت ہے کہ اگلی پچھلی تمام باتیں لے بیٹھتی ہیں۔ غرض یہ کہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر ہمارے ہاں آ ٹھہرے۔
تصدق بھائی مجھ سے اور بدو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ

ہوتیں۔ بدو سے تو وہ دن بھر نہ اُکتاتے۔ البتہ آپا سے وہ زیادہ باتیں نہ کرتے، کرتے بھی کیسے۔ جب بھی وہ آپا کے سامنے جاتے تو وہ آپا کے دوپٹے کا پلو آپ ہی آپ سرک کر نیم گھونگھٹ سا بن جاتا اور آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں شدت سے مصروف دکھائی دیتی۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپا ان کی باتیں غور سے سنا کرتی تھیں گو کہتی کچھ نہ تھیں۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپا کے متعلق پوچھتے رہتے لیکن صرف اسی وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوتے۔ پوچھتے ''بدو تمہاری آپا کیا کر رہی ہے؟''

آپا بدو لاپروائی سے دہراتا بیٹھی ہے۔ بلاؤں؟

بھائی صاحب گھبرا کر کہتے ''نہیں نہیں، اچھا بدو آج تم ہی یہ دیکھو اس طرف تمہیں دکھائیں۔'' اور جب بدو کا دھیان اِدھر اُدھر ہو جاتا تو مدھم سی آواز میں کہتے ارے یار تم تو ڈھنڈورا ہو۔ بدو چیخ اُٹھتا۔ کیا ہوں میں؟ اس پر وہ میز بجانے لگتے۔ ڈگمگ ڈگمگ ڈھنڈورا، یعنی یہ ڈھنڈورا ہے۔ دیکھا جسے ڈھول بھی کہتے ہیں۔ ڈگمگ ڈگمگ سمجھے اور آپا اکثر چلتے چلتے ان کے دروازے پر ٹھہر جاتی اور ان کی باتیں سنتی رہتی اور پھر چولہے کے پاس بیٹھ کر آپ ہی آپ مسکراتی۔ اس وقت ان کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا۔ بالوں کی لٹ پھسل کر گال پر آ گرتی اور وہ بھیگی بھیگی آنکھیں چولہے میں ناچتے ہوئے شعلوں کی طرح جھومتیں۔ آپا کے ہونٹ یوں ہلتے گویا گا رہی ہو مگر الفاظ سنائی نہ دیتے ایسے میں اگر اماں یا ابا باورچی خانے میں آ جاتے تو وہ ٹھٹھک کر یوں اپنا دوپٹہ، بال اور آنکھیں سنبھالتی گویا کسی بے تکلف محفل میں کوئی بیگانہ آ گھسا ہو۔

ایک دن میں آپا اور اماں باہر صحن میں بیٹھی تھیں۔ اس وقت بھائی اندر اپنے کمرے میں بدو سے باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے بھائی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم باہر بیٹھے ہوئے ان کی باتیں سن رہے ہیں۔ بھائی صاحب بدو سے کہہ رہے تھے ''میرے یار ہم تو اس سے بیاہ کریں گے جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے، شطرنج، کیرم اور چڑیا کھیل سکے، چڑیا جانتے ہو! وہ گول گول پروں والا گیند بلے سے یوں ڈرن ڈن ڈما اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزیدار کھانے پکا کر کھلا سکے، سمجھے۔''

بدو بولا ''ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔''

''اُونہوں'' بھائی نے کہا۔

بدو چیخنے لگا ''میں جانتا ہوں تم آپا سے بیاہ کرو گے۔'' ہاں'' اس وقت اماں نے مسکرا کر آپا کی طرف دیکھا۔ مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اس قدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے ''واہ تمہاری آپا فرنی پکاتی ہے تو اس میں پوری طرح شکر بھی نہیں

دالتی، بالکل پھیکی، آخ تھو۔"

بدو نے کہا ابا جو کہتے ہیں فرنی میں کم میٹھا ہونا چاہیے۔

"وہ تو اپنے ابا کے لیے پکاتی ہے نا۔ ہمارے لیے تو نہیں۔"

"میں کہوں آپا سے؟" بدو چیخا۔

بھائی چلائے "اوہ پگلا، ڈھنڈورا، تو ہمیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں یہ دیکھو اس طرف ڈھمک ڈھمک" بدو پھر چلانے لگا۔ میں جانتا ہوں تم میز بجا رہے ہو نا؟ ہاں ہاں اسی طرح ڈھنڈورا پٹتا ہے نا۔" بھائی کہہ رہے تھے۔ کشتیوں میں، اچھا بدو تم نے کبھی کشتی لڑی ہے، آؤ ہم تم کشتی لڑیں۔ میں ہوا گاما اور تم بدو پہلوان لو، اور ٹھہرو۔ جب میں تین کہوں اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے مدھم آواز میں کہا ارے یار تمہاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے۔"

میرا خیال ہے کہ آپا ہنسی نہ روک سکی اس لیے وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا اور اماں نے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا کہ آواز نہ نکلے۔

میں اور آپا کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بھائی صاحب آ گئے۔ کہنے لگے۔

"کیا پڑھ رہی ہو جیجا؟" ان کے منہ سے جیجا سن کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد نفرت تھی۔ نور جہاں کیسا پرانا نام ہے۔ بولتے ہی منہ میں باسی روٹی کا مزہ آنے لگتا ہے، میں تو نور جہاں سن کر یوں محسوس کیا کرتی تھی جیسے کسی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے بوڑھی اماں سونٹا ٹیکتی ہوئی آ رہی ہو۔ مگر بھائی صاحب کو نام بگاڑ کر اسے سنوار دینے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے منہ سے جیجا سن کر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی اور میں محسوس کرتی گویا ایران کی شہزادی ہوں۔ آپا کو وہ سجادہ سے سجدہ کہا کرتے تھے مگر وہ تو پرانی بات تھی۔ جب آپا چھوٹی تھی۔ اب تو بھائی جان اسے سجدہ نہ کہتے بلکہ اس کا پورا نام تک لینے سے گھبراتے تھے۔ خیر میں نے جواب دیا سکول کا کام کر رہی ہوں۔ پوچھنے لگے "تم نے کوئی برنارڈ شا کی کتاب پڑھی ہے کیا؟"

میں نے کہا "نہیں۔"

انہوں نے میرے اور آپا کے درمیان دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تمہاری آپا نے تو ہارٹ بریک ہاؤس پڑھی ہوگی۔ وہ انکھیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

آپا نے آنکھیں اٹھائے بغیر ہی سر ہلا دیا اور مدھم سی آواز میں کہا "نہیں" اور سویٹر بننے میں لگی رہی۔

بھائی بولے "اوہ کیا بتاؤں جیجا کہ وہ کیا چیز ہے نشہ ہے نشہ خالص شہد، تم اسے ضرور پڑھو۔ بالکل آسان ہے یعنی امتحان کے بعد ضرور پڑھنا۔ میرے پاس پڑی ہے۔

میں نے کہا میں ضرور پڑھوں گی۔

پھر پوچھنے لگے" میں کہتا ہوں تمہاری آپا نے میٹرک کے بعد پڑھنا کیوں چھوڑ دیا؟" میں نے چڑ کر کہا" مجھے کیا معلوم، آپ خود ہی پوچھ لیجیے"۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ آپا نے کالج میں جانے سے کیوں انکار کیا تھا۔ کہتی تھی۔ میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا وہاں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی نمائش گاہ ہو۔ درس گاہ تو معلوم ہی نہیں ہوتی۔ جیسے مطالعے کے بہانے میلہ لگا ہو مجھے آپا کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ گھر بیٹھ رہنے کے لیے کالج جانا نہیں چاہتی بڑی آئی تھی نکتہ چیں۔ اس کے علاوہ جب بھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو میں خواہ مخواہ چڑ جاتی۔ آپا تو بات کا جواب تک نہیں دیتی۔ اور یہ آپا آپا کر رہے ہیں اور پھر آپا کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب؟ میں کیا ٹیلی فون تھی۔ خود آپا سے پوچھ لیتے اور آپا بیٹھی ہوئی گم سم آپا بھیگی بلی۔

شام کو ابا کھانے پر بیٹھے ہوئے چلا اٹھے۔" آج فرنی میں اتنی شکر کیوں ہے؟ قند سے ہونٹ چپکے جاتے ہیں۔ سجادہ، سجادہ بیٹی، کیا کھانڈ اتنی سستی ہوگئی ہے ایک لقمہ نگلنا بھی مشکل ہے۔"

آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھوم رہی تھیں۔ حالانکہ جب بھی ابا جان خفا ہوتے تو آپا کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ مگر اس وقت اس کے گال تمتمار ہے تھے کہنے لگی۔ شاید زیادہ پڑ گئی ہو یہ کہہ کر وہ تو باورچی خانے میں چلی گئی اور میں دانت پیس رہی تھی۔ شاید کیا خوب شاید۔

اُدھر ابا بدستور بڑبڑا رہے تھے۔ چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں کہ فرنی میں قند بڑھتی جا رہی ہے۔ صحن سے اماں دوڑی دوڑی آئیں اور آتے ہی ابا پر برس پڑیں جیسے ان کی عادت ہے۔" آپ تو ناحق بگڑتے ہیں۔ آپ ہلکا میٹھا پسند کرتے ہیں تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں، اللہ رکھے گھر میں جوان لڑکا ہے۔ اس کا خیال تو کرنا چاہیے۔" ابا کو جان چھڑانی مشکل ہوگئی۔ کہنے لگے" اوہ یہ بات ہے مجھے بتا دیا ہوتا۔ میں کہتا ہوں سجادہ کی ماں"۔۔۔ اور وہ دونوں کھسر پھسر کرنے لگتے۔

آپا ساحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی تو میں بڑی حیران ہوئی۔ آپا ان سے ملنا تو کیا تکنا پسند نہیں کرتی تھی بلکہ اس کے نام پر ہی ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا ضرور کوئی بھید ہے۔ اس بات میں کبھی کبھار ساحرہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کر کے اس پر چڑھ کر ہماری طرف جھانکتی اور کسی نہ کسی بہانے سلسلہ گفتگو دراز کرنے کی کوشش کرتی تو آپا بڑی بے دلی سے دو ایک باتوں سے اُسے ٹال دیتی۔ آپ ہی آپ بول اٹھتی تھی تو اتنا کام پڑا ہے اور میں یہاں کھڑی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھتی۔ خیر اس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی مگر آپا جب لوٹ چکی تو کچھ عرصے کے بعد چپکے سے میں بھی ساحرہ کے گھر جا پہنچی۔ باتوں باتوں میں میں نے ذکر چھیڑ دیا، آج آپا آئی تھی؟"

ساحرہ نے ناخن پر پالش لگاتے ہوئے کہا" ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے نہ جانے کیا نام ہے اس کا، ہاں" ہارٹ بریک ہاؤس۔"

آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی۔ اُسے یوں مضطرب دیکھ کر میں دو ایک چھوٹی انگڑائیاں لیتی اور پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں پڑ جاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب اُسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا۔ آپا یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے۔ دل توڑنے والا گھر اس کا کیا معنے ہوئے؟ پہلے تو آپا ٹھٹھک گئی پھر وہ سنبھل کر اٹھی اور بیٹھ گئی۔ مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی خاموشی سے جل کر کہا۔ اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے۔ کہنے لگی" میں کیا جانوں؟"

میں نے اسے جلانے کو کہا" ہاں ہماری آپا بھلا کیا جانے" میرا خیال ہے یہ بات ضرور اسے بری لگی۔ کیونکہ اس نے کتاب رکھ دی اور بتی بجھا کر سو گئی۔

ایک دن یوں ہی پھرتے پھراتے میں بھائی جان کے کمرے میں جا نکلی پہلے تو بھائی جان ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر پوچھنے لگے۔" جبینا اچھا یہ تو بتاؤ کیا تمہاری آپا کو فروٹ سلاد بنانا آتا ہے۔" میں نے کہا" میں کیا جانوں جا کر آپا سے پوچھ لیجیے۔" ہنس کر کہنے لگے۔" آج کسی سے لڑ کر آئی ہو۔"

" بولتے نہیں ابھی تو لڑکی ہو شاید کسی دن لڑکا ہو جاؤ۔" اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگے۔ دیکھو جبینا مجھے لڑنا بے حد پسند ہے میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کروں گا جو باقاعدہ صبح سے شام تک لڑ سکے۔ ذرا کتائے نہیں۔ جانے کیوں میں شرما گئی اور بات بدلنے کی خاطر پوچھا" فروٹ سلاد کیا ہوتا ہے بھائی جان۔"

بولے" وہ بھی کچھ ہوتا ہے، سفید سفید، لال لال، کالا کالا، نیلا نیلا سا، میں ان کی بات سن کر بہت ہنسی۔ پھر کہنے لگے۔ وہ مجھے بے حد پسند ہے۔ یہاں تو ہم فرنی کھا کر اکتا گئے۔ میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور سن لی ہوگی۔ چونکہ اُسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی" نعمت کدہ" پڑھ رہی تھیں۔ اس دن کے بعد روز بلاناغہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاد بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی ان کے پاس چلا جاتا تو وہ جھٹ فروٹ سلاد کی کشتی چھپا دیتی۔ ایک روز آپا کو چھیڑنے کی خاطر میں نے بدو سے کہا" بدو بوجھو تو وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے اس میں کیا ہے؟"

بدو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدو کو دینی ہی پڑی۔ پھر میں نے بدو کو اور بھی

چمکا دیا۔ میں نے کہا "بدو جاؤ تو۔ بھائی جان سے پوچھو۔ اس کھانے کا کیا نام ہے؟"

بدو بھائی جان کے کمرے کی طرف جانے لگا تو آپا نے اٹھ کر وہ کشتی اس سے چھین لی اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس روز پہلی مرتبہ آپا نے مجھے یوں گھورا تھا۔

اس رات آپا شام ہی سے لیٹ گئی مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رضائی میں پڑی رو رہی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی بات پہ بہت افسوس ہوا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں اور اسے خوب پیار کروں مگر میں ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی، اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی۔

انہی دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ جسے ہم سب ساجو باجی کہا کرتے تھے میٹرک کا امتحان دینے کے لیے ہمارے گھر آ ٹھہری۔ ساجو باجی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہو گئی۔ ہمارا گھر بھی قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ساحرہ اور ثریا چارپائیوں پر کھڑی ہو کر باجی سے باتیں کرتی رہتیں۔ بدو چھاجو باجی، چھاجو باجی چیختا پھرتا اور کہتا ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔

باجی کہتی شکل تو دیکھو اپنی پہلے منہ دھو آؤ۔ پھر وہ بھائی صاحب کی طرف یوں گردن موڑتی کہ کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگتے اور وہ ترنم تان میں پوچھتی "ہے نا بھئی جان کیوں جی۔"

باجی کے منہ سے "بھئی جان" کچھ ایسا بھلا سنائی دیتا کہ میں خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ اس کے برعکس جب کبھی آپا بھائی صاحب کہتی تو کیسا بھدا معلوم ہوتا۔ گویا وہ واقعی انہیں بھائی کہہ رہی ہو اور پھر "صاحب" جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو مگر باجی صاحب کی جگہ "جا آن" کہہ کر وہ اس سادے سے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی۔ "جا آن" کی گونج میں بھائی دب جاتا اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ انہیں بھائی کہہ رہی ہے۔ اس کے علاوہ "بھئی جا آن" کہہ کر وہ اپنی کالی کالی چمکدار آنکھوں سے دیکھتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتی تو سننے والے کو قطعی یہ گمان نہ ہوتا کہ اسے بھائی کہا گیا ہے۔ آپا کے بھائی صاحب اور باجی کے "بھائی جان" میں کتنا فرق ہے۔

باجی کے آنے پر آپا کا بیٹھو رہنا بالکل بیٹھو رہنا ہی رہ گیا۔ بدو نے بھائی جان سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ باجی کے گرد طواف کرتا رہتا اور باجی بھائی جان سے کبھی شطرنج کبھی کیرم کھیلتی۔

باجی کہتی بھائی جان ایک بورڈ لگے گا یا بھائی جان باجی کی موجودگی میں بدو سے کہتے کیوں میاں بدو کوئی ہے جو ہم سے شطرنج میں پٹنا چاہتا ہو؟ باجی بول اٹھتی "آپا سے پوچھیے۔" بھائی کہتے اور تم، باجی جھوٹ موٹ کی سوچ میں پڑ جاتی۔ چہرے پر سنجیدگی پیدا کر لیتی بھنویں سمٹا لیتی اور تیوری چڑھا کر کھڑی رہتی پھر کہتی "اونہہ مجھ سے تو آپ پٹ جائیں گے۔ بھائی جان کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور کہتے "کل جو پٹی تھیں بھول گئیں کیا؟" وہ جواب دیتی میں نے کہا چلو بھئی جان کا لحاظ کر دو، ورنہ دنیا کہے گی کہ مجھ سے ہار

گئے۔ اور پھر یوں ہنستی جیسے گھنگھرو بج رہے ہوں۔

رات کو بھائی جان باورچی خانے میں ہی کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ آپا چپ چاپ چولہے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدو چھاجو باجی، چھاجو باجی کہتا ہوا باجی کے دوپٹے کا پلو پکڑے اس کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ باجی بھائی جان کو چھیڑ رہی تھی۔ کہتی تھی، بھئی جا آن تو صرف ساڑھے چھ پھلکے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فرنی کی پلیٹ مل جائے تو قطعی مضائقہ نہیں، کریں بھی کیا، نہ کھائیں تو ممانی ناراض ہو جائیں۔ انہیں جو خوش رکھنا ہوا، ہے نا بھئی جا آن۔" ہم سب اس بات پر خوب ہنسے پھر باجی ادھر اُدھر ٹہلنے لگی اور آپا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ آپا کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی پڑی تھی۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر دیکھا اور کشتی کو اٹھا لیا۔ پیشتر اس کے کہ آپا کچھ کہہ سکے۔ باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی لیجیے بھئی جا آن، اس نے آنکھوں میں ہنستے ہوئے کہا۔ آپ بھی کیا کہیں گے کہ ساجو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں۔

بھائی جان نے دو تین چمچے منہ میں ٹھونس کر کہا " خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے، کس نے بنایا ہے۔" باجی نے آپا کی طرف انکھیوں سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا " ساجو باجی نے اور کس نے بھئی جا آن کے لیے۔" بدو نے آپا کی طرف غور سے دیکھا آپا کا منہ لال ہو رہا تھا۔ بدو چلا اٹھا۔ میں بتاؤں بھائی جان۔ آپا نے بڑھ کر بدو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گود میں اٹھا کر باہر چلی گئی۔ باجی کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا اور بدو کی بات آئی گئی ہو گئی۔ بھائی جان نے باجی کی طرف دیکھا پھر جانے انہیں کیا ہوا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں باجی کے چہرے پر گڑ گئیں جانے کیوں۔ میں نے محسوس کیا جیسے کوئی زبردستی مجھے کمرے سے باہر گھسیٹ رہا ہو۔ میں باہر چلی آئی۔ باہر آپا انگنی کے قریب کھڑی تھی اور بھائی صاحب نے مدھم آواز میں کچھ کہا۔ آپا نے کان سے دوپٹہ سرکا دیا۔ پھر باجی کی آواز آئی۔

"چھوڑیئے"۔۔۔ اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ہم صحن میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔ بدو بھی کہیں اُدھر ہی کھیل رہا تھا۔ باجی حسب معمول بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی، کہنے لگی۔ " آج ایک دھندنا تا بورڈ کر دکھاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟ بھائی جان بولے۔ " واہ یہاں سے کک لگاؤں تو جانے کہاں جا پڑو" غالباً انہوں نے باجی کی طرف زور سے پیر چلایا ہوگا۔ وہ بناوٹی غصے میں چلائی۔ واہ آپ تو ہمیشہ پیر ہی چھینتے ہیں! بھائی جان معاً بول اٹھے۔ " تو کیا ہاتھ سے"۔ چپ خاموش باجی چیخی۔ اس کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ تک پکڑ دھکڑ سنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں کہیں سے بدو بھاگتا ہوا آیا کہنے لگا " آپا اندر بھائی جان باجی سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ چلو دکھاؤں تمہیں۔" چلو بھی وہ آپا کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ آپا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور وہ بت

بنی کھڑی تھی۔ بدو نے آپا کو چھوڑ دیا۔ کہنے لگا اماں کہاں ہے اور وہ اماں کے پاس جانے کے لیے دوڑا۔ آپا نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ آؤ اور اسے باورچی خانے میں لے گئی۔

اُسی شام میں نے اپنی کتابوں کی الماری کھولی تو اس میں آپا کی ہارٹ بریک ہاؤس پڑی ہوئی تھی۔ شاید آپا نے اسے وہاں رکھ دیا ہو۔ میں حیران ہوئی کہ کیا بات ہے مگر آپا باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی خالی پڑی تھی۔ البتہ آپا کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

بھائی تصدق اور باجی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار اُن کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب باجی وہ باجی نہ تھی۔ اس کے وہ قہقہے بھی نہ تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور ماتھے پر شکن چڑھی تھی۔ بھائی کہنے لگے بدو ساجو باجی سے بیاہ کرو گے۔

''اُونہوں'' بدو نے کہا'' ہم بیاہ کریں گے ہی نہیں۔''

میں نے پوچھا بھائی جان یاد ہے جب بدو کہا کرتا تھا'' ہم تو چھاجو باجی سے باہ کریں گے۔'' اماں نے پوچھا آپا سے کیوں نہیں تو کہنے لگا بتاؤں آپا کیسی ہے پھر چولہے میں جلتے ہوئے اُپلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا ایسی۔ عین اُسی وقت بجلی بجھ گئی اور کمرے میں انگاروں کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا۔ ہاں یاد ہے۔ بھائی نے کہا۔ پھر جب باجی کسی کام کے لیے باہر چلی گئی تو بھائی کہنے لگے۔'' نہ جانے اب بجلی کو کیا ہو گیا ہے، جلتی بجھتی ہی رہتی ہے۔'' آپا چپ چاپ بیٹھی چولہے کی راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کو کریدر ہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم سی آواز میں کہا'' کتنی سردی ہے'' پھر اٹھ کر آپا کے قریب چولہے کے سامنے جا بیٹھے اور ان سلگتے ہوئے اپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے۔ بولے'' ممانی سچ کہتی تھیں کہ ان جلے ہوئے اپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے اُوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔ کیوں سجدے''۔ آپا پرے سرکنے لگی تو چھن سی آواز آئی جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوند پڑی ہو۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے'' اب اس چنگاری کو تو نہ بجھاؤ سجدے دیکھو تو کتنی ٹھنڈک ہے۔''

-☆-

پریم نگر

شاید آپ نے پہلے بھی پریم نگر کی کہانی سنی ہو، کچھ مضائقہ نہیں۔ کیونکہ آپ اسے بار بار سننا پسند کریں گے۔ یہی اس نگر کا جادو ہے۔ بڑا جادو ہے اس نگر کا۔ آپ کی آنکھیں کنوروی کھل جاتی ہیں، اٹھ بیٹھتے ہیں۔ ''ہوں۔ پھر کیا ہوا'' واقعی اس نگر پر جادو کا اثر ہے۔ اس بارے میں لوگ کچھ نہ کچھ کہتے ہیں۔ لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ آیا وہ سادھو نگر کے باشیوں سے ناراض ہو کر سراپ دے گیا تھا۔ اس لیے وہ اندھے ہو گئے۔ یا خوش ہو کر آشیرباد دے گیا تھا۔ ''جیو''۔ اور وہ جینے لگے جب ہی سے وہاں کا سبزہ اور بھی مخملی ہو گیا۔ پھول مہک اور رنگ سے اور بھی لد گئے۔ ٹہنیوں نے بال کھول کر خوشی کے مارے حال کھیلنا شروع کر دیا۔ ان کے تلے چشمے خوشی سے ٹپ ٹپ رونے لگے۔ اور ان پر بیٹھ کر کوئل نے پی کو بلانا شروع کر دیا۔ اور پگڈنڈیاں دوڑ دوڑ کر نگر کو آ نکلیں۔ اور آسمان نے بڑھ کر اسے ستاروں بھرے نیلے دامن میں چھپا لیا۔ کہ فرشتوں کی عبادت میں خلل نہ پڑ جائے۔ چاہے یہ بات سچی ہو یا وہ۔ کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بہر حال جادو نگری ہے وہ۔۔۔۔۔!

ذونو اس نگر کا باشی تھا۔ اس کا گھر ایک چشمے کے کنارے تھا۔ جو ہر سے ٹپ ٹپ رویا کرتا۔ جس پر ٹہنیاں بال جھٹکائے سوگ مناتیں۔ جن پر کوئل بیٹھ کر ''زی۔ زی۔ زی۔ زی'' کوکتی۔ ذونو پڑے پڑے ان کی آوازیں سنتا۔ کروٹ بدلتا۔ ٹھنڈی آہ بھرتا۔ اور پھر سننے لگتا۔ ذونو کو زی زی سے محبت تھی۔ وہ دن بھر شعر گنگناتا ٹھنڈی آہیں بھرتا۔ اور دنیا کی ساری چیزوں کو فانی سمجھنے میں وقت کاٹتا۔ رات کو کروٹیں بدلتا۔ اور سوچتا۔ اب وہ بیٹھی ہو گی۔ بال کھلے ہوں گے، ہونٹ کھلے ہوں گے۔ اف وہ گھور کالی آنکھیں اُف۔۔۔! حتیٰ کہ اس کی آنکھ لگ جاتی۔ اور وہ بھی آنکھ دیکھنے لگتی۔ کھلے بال کھلے ہونٹ، گھور کالی آنکھیں اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ تصویر کھو جاتی وہ تڑپ کر ادھر دیکھتا۔ چشمہ ٹپ ٹپ روتا۔ ٹہنیاں

لنگ لنگ کر فریاد کر رہی ہو تیں دور گھاٹی میں ہوا کراہتی اور کوئل با با کر جتاتی۔ کہ وہ نہ آئے گی۔ نہ آئے وہ۔ کتنی محبت تھی اسے نزی سے لیکن نزی کو اس سے محبت نہ تھی۔ بچپنے ہی میں وہ آجو سے کھیلا کرتی تھی۔ اور کھیل ہی کھیل میں آجو کی ہو گئی تھی۔ جب اسے ہوش آیا تو پتہ چلا کہ وہ تو کسی کی ہو چکی ہے۔ بیچاری۔ اب کیا کرتی وہ۔ اس لیے اس نے آجو کو اپنا لیا۔ لیکن اسے اپنا نہ بنا سکی۔ اور آجو نگر چھوڑ کر شہر چلا گیا، اور وہاں سے "اپنی کیٹ" پسند کرنا سیکھ آیا۔ اور اسے اپنی کیٹ اتنا بھایا۔ کہ نزی اور اس کے کھیل دل سے اتر گئے۔ نزی کو تو ذرا اپنی کیٹ نہ آتا تھا۔ لیکن مس فلی کیا تھی گویا اپنی کیٹ میں جان پڑی ہوئی تھی۔ آجو اسے دیکھ دیکھ کر جیتا اور مر جانے کی آرزو کرتا۔ اس میں کوئی ہرج نہ تھا۔ اس لیے آجو کے گھر والے آجو پر نگاہ نہ رکھتے تھے کیونکہ مر جانے کی آرزو کرنے کے لیے جیتے رہنا ضروری ٹھہرا۔ اس لیے وہ اس کی رکھوالی نہ کرتے تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ وہ جیتا رہے عمر دراز ہو۔ آپ جانتے ہیں گھر والے بیری نہیں ہوتے۔

آجو فلی کو ماڈل گرل سمجھتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ مس فلی کو اس بات کا ذرا لحاظ نہ تھا کہ آجو اسے کیا سمجھتا ہے۔ پڑا سمجھے! سمجھے نہ سمجھے!! بات یوں تھی۔ کہ ہر ماڈل گرل کی طرح اسے بھی ماڈرن گرل بننے کا شوق تھا۔ اور ماڈرن گرل بننے کا شوق نہ جانے کیا کیا بننے کا شوق ہوتا ہے۔ فی الحال فلی کو وائلن بجانے کا شوق تھا۔ اس لیے وہ وائلن بجاتی رہتی۔ لیکن وہ بجتی نہ تھی۔ جبھی تو وہ اور بھی شدت کے ساتھ بجاتی تھی۔

وائلن کے سُر وادی میں گونجتے۔ آجو کے دل پر تیر سا لگتا۔ اور وہ لحاف میں منہ ڈال کر "آئی لو یو" گنگناتا۔ اور نزی چھم چھم روتی۔ اور ذونو آہ بھرتا اور کروٹ بدلتا اور جنگل کے درخت پر سر لٹکا لٹکا کر سنتے۔ اور پھر ایک دوسرے کے شانوں پر سر رکھ کر آہیں بھرتے۔ اور چشمے دبے دبے پاؤں آ کر انہیں دیکھتے اور سرک جاتے۔ دیکھتے اور سرک جاتے۔ ان کی باتوں کو دیکھ کر کوئل اونچی ٹہنیوں پر بیٹھ کر بتا دینے کی دھمکی دیتی۔ لیکن کوئل کی بات کون سنتا ہے۔ لوگ تو پیہو پیہو سنتے ہیں اور پیہو تو ورد ول ہے دھمکی نہیں۔

یہ سب پریم نگر کے باسی تھے۔ ذونو، نزی، آجو فلی اس کی وائلن، درخت، چشمے اور کوئل۔

ان کے علاوہ اور لوگ بھی رہتے تھے وہاں نگر میں۔ مثلاً ذونو کی منگیتر دینا تھی۔ جسے نگر کی وینس سمجھا جاتا تھا۔ ایسی حسین تھی وہ۔ اس کا حسن دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر بیراگی ہو جائیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ سب کچھ تو چھوٹ جاتا تھا پر دینا نہ چھوڑی جا سکتی تھی۔ مگر وہ ظالم تو آپ بھی کچھ تھی۔ بلکہ بھی کچھ اسی سے تھا۔ اور وہ آپ سے بھی زیادہ۔ ایسا حسن تھا اس کا اداس اداس رویا رویا اور وہ آپ چپ چپ سی تھی۔ نہ جانے وہ سب کی بیماری ہونے کی وجہ سے چپ ہو گئی تھی۔ یا چپ ہونے کی وجہ سے

پیاری۔ بہرحال نگر کے سبھی لوگ اسے چاہتے تھے۔
کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ کسے چاہتی ہے کچھ لوگ کہتے وہ کسی کو نہیں چاہتی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جوان لڑکی ہو اور کسی کو نہ چاہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ پھر اسے چپ کیوں لگی تھی۔ اور وہ روئی روئی سی کیوں تھی۔ کوئی کہتا اسے ڈونو سے محبت ہے۔ جبھی تو اس نے ڈونو کے گھر کے سامنے گھر بنوایا ہے۔ اور ڈونو کی کھڑکی کے سامنے کھڑکی رکھی ہے۔ کوئی کہتا۔ اُونہوں محبت نہیں اسے تو صرف یہ چڑ ہے کہ جب نگر کے سب جوان اسے دیکھ دیکھ کر دیوانے ہوئے جا رہے ہیں۔ تو بھلا ڈونو کیوں بالا بالا رہتا ہے۔ بہرحال چاہے اسے ڈونو سے محبت تھی یا نہ تھی۔ نگر کے جوان واقعی دینی کی محبت میں دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ اور اس قدر دیوانے کہ دنیا کی بات بات کا ہوش تھا انہیں۔ اب کھڑکی میں بیٹھی ہے۔ اب سیر کے لیے تیار ہو رہی ہے۔ اب سبز سوٹ پہنا جا رہا ہے۔ اُف۔ وہ سبز سبز کونپلوں میں دودھیا سا پھول۔ شبنم سے بھیگا بھیگا سا۔ اُف۔ وہ گلیوں میں نکل جاتے۔ اور دینا کے گیت گاتے پھرتے۔ اور بالآخر کھاڑی میں جا کر مرلی بجا بجا کر دردِ دل کا اظہار کرتے۔ اگرچہ مرلی اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر سناتی۔ لیکن کون جانتا تھا۔ کہ وہ سنا جاتا تھا یا نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ دردِ دل کا اظہار جبھی ہوتا ہے۔ جب کوئی اسے سنے۔ چاہے سن کر مسکرا ہی کیوں نہ دے "ہونہہ" یہ ہونہہ تو اور بھی ابھار رہتا ہے۔ اتنا تو پتہ چل جاتا ہے کہ بات پہنچ گئی ان تک، لیکن دُنیا کو تو چپ لگی تھی۔ اگر وہ ہنسنا شروع کر دیتی تو شاید کھاڑی میں دردِ دل کا اظہار ہی نہ ہوتا۔ اور مرلی رونے کی بجائے گانا شروع کر دیتی۔ لیکن انجانی باتیں کون جان سکتا ہے۔
بہرحال یہ تو سبھی جانتے تھے کہ ہر کوئی چاہتا تھا۔ کہ دینا اسے چاہے۔ اور ہر کوئی ڈونو کی خوش قسمتی پر جلتا تھا۔
لیکن ڈونو اپنی بدقسمتی پر روتا تھا۔
جب اس نے سنا کہ دینا اسے اس قدر چاہتی ہے۔ تو اسے اور بھی دُکھ ہوا۔ کہ نزی اسے کیوں نہیں چاہتی۔ اور نزی کو اپنی محبت کی شدت جتانے کے لیے اس پر لازم ہو گیا کہ وہ دینا کی چاہت کو نزی کی محبت پر قربان کر دے۔ جس قدر وہ قربانی کرتا اسی قدر اسے نزی پر گلہ بڑھ جاتا۔ نزی کے بے وفائی اس میں اور بھی وفا پیدا کر دیتی۔ اور اس کی وفا سے نزی اور بھی چڑ جاتی۔ لاپروا ہو جاتی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وفا جبھی قابلِ قدر ہوتی ہے۔ جب وہ دوسرے کی بے وفائی کے باوجود قائم رہے۔ تو ڈونو نزی سے اور بھی محبت کرنے لگا۔ اور دینا سے اور بھی بالا بالا رہنے لگا اور دینا اس بات پر اور بھی چڑنے لگی۔ اور نگر کے نوجوان کے اظہارِ دردِ دل میں اور بھی درد بڑھا۔ اور مرلی کے بین اور بھی لمبے ہوتے گئے۔
جس روز دینا سے ڈونو کی منگنی ہوئی اس دن وہ کھاڑی میں بیٹھ کر اس قدر رویا اس قدر رویا کہ

گھگھی بندھ گئی۔ پھر اپنے دوست منّو کے شانے پر سر رکھ کر بولا۔ ''ہائے منّو اب کیا ہوگا؟'' منّو نے دلاسا دیا بولا ''ہوگا کیا۔ بیاہ ہوگا'' ''لیکن منّو۔ ڈوڈو بولا میں تو جیتے جی مر جاؤں گا۔ نہیں نہیں منّو یہ کبھی نہ ہو گا۔ میں دینا کی زندگی کو تباہ نہ ہونے دوں گا۔ بیچاری دینا۔'' ''لیکن ڈوڈو'' منّو نے کہا۔ ''دینا کو تم سے اتنی محبت ہے''۔ ''یہ اس کا پاگل پنا ہے منّو۔'' ڈوڈو چیخنے لگا۔ میں نزی کا ہو چکا ہوں۔ چاہے وہ جانے نہ جانے منّو۔ کاش کہ وہ جانتی منّو۔ کاش!!! پھر جاننے کا کیا فائدہ جب میں نہ رہا۔ منّو۔ اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''ڈوڈو'' منّو بولا۔ ''کیا دینا سے بیاہ کرنے سے انکار کر دو گے۔'' ''اُف۔ یہی تو میں سوچتا ہوں منّو۔ کتنی بدنامی ہوگی میری نزی کی۔ اُف۔ نہیں نہیں میں دینا سے بیاہ نہ کروں گا۔ میں بیاہ کروں گا ہی نہیں مجھے بربادر ہنا ہی راس ہے۔ منّو۔'' ''لیکن''۔۔ منّو نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ڈوڈو نے اسے کاٹ دیا۔ میں مجبور ہوں۔ ڈوڈو میں مجبور ہوں۔ اور وہ زار زار رونے لگا۔

نزی کو پتہ نہ تھا کہ ڈوڈو اتنا مجبور ہو چکا ہے اور یوں رو رو کر اپنی جان ہلکان کر رہا ہے۔ شاید وہ جانتی بھی ہو لیکن جاننا چاہتی نہ ہو۔ اس لیے ان جانا کر دیتی ہو۔ کون جانتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔ بہر حال کیسی بُری تھی وہ سارا قصور تو نزی کا تھا۔

نزی سے کوئی پوچھتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے سب ڈوڈو کی غلطی تھی۔ اسے نزی سے محبت نہیں کرنا چاہیے تھا۔ چونکہ بچپنے میں وہ آپ نزی کے رقعے آجو تک پہنچایا کرتا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا۔ کہ وہ آجو کی ہو چکی ہے۔ اگر نزی سے محبت کرنی ہی تھی۔ تو اتنی دیر کیوں لگائی اس بات میں اگر شروع شروع میں نزی کو محبت جتا دیتا یا کم از کم آپ ہی جان لیتا۔ اس بات کو تو بات نہ بگڑتی، اور کچھ نہ کرتا تو کم از کم رقعہ لے جانے سے ہی انکار کر دیتا۔

پتھر کا دل ہو تو کوئی ڈوڈو سے اس بارے میں بات کرے۔ وہ ایک آہ بھر کر آپ کی طرف یوں دیکھے گا۔ کہ آپ کا دل خون ہو کر بہہ جائے گا۔ اور جی چاہے گا۔ کہ اس کے گلے لگ کر رو دیں۔ اور آپ معاً سمجھ جائیں گے۔ کہ وہ نزی کا رقعہ کیوں نہ آجو کے پاس لے جاتا۔ جبکہ اس کی خوشی نزی کی خوشی سے وابستہ تھی اور وہ کیسے جانتا کہ اسے کیا ہے۔ یہ بات بھی جانی جاتی ہے کیا۔ یہ تو انجانے میں آ کر زوئیں، زوئیں میں بس جاتی ہے۔ اور بس پھر ہوش آ جاتا ہے۔ جب ہوش نہیں رہتا۔ اور جان بھی لیتا تو کیسے کہتا نزی سے۔ جب جان لو تو کہنے کو زبان بھی ملے۔ اور زبان مل جائے تو کیا وہ دل سے جڑی ہوتی ہے۔ اُونہوں۔ کہاں دل، کہاں منہ دونوں کا میل بھی ہو۔ پھر جب آپ رو رو کر تھک جائیں گے تو اسے تسکین دینے کی خاطر بات بدلنا چاہیں گے۔ مگر آنسوؤں کے روبرو بات بدلنا، آخر آپ دل والے ٹھہرے۔ پھر آپ کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ کہ کیا کریں۔ اور آپ کسی بہتر صورت کو نہ جانتے ہوئے از سر نو اسے گلے

لگا کر رو پڑیں گے۔ اور نزی کو گالیاں دینے لگیں گے۔ گالی دینے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ آخر ہر کسی کو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی نزی سے واسطہ پڑتا ہی ہے۔ آپ کا دل بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ چاہے وہ پھر سے گرم ہونے کے لیے ہی ٹھنڈا ہو۔ آخر اس بے ثبات دنیا میں دل کے ٹھنڈے اور گرم ہونے کے علاوہ کس بات کو ثبات ہے۔

ادھر نزی اس بات پر روتی کہ آجو نے کس کے لیے سب کچھ بھلا دیا۔۔۔ وہ بالپن کے کھیل۔۔۔۔ جب وہ خوشی خوشی دولہا بنتا تھا۔ اور وہ شرما شرما جاتی تھی۔ اور پھر منہ بنا کر رخ بدل کر کھڑی ہو جاتی۔ نا بھئی ہم نہیں کھیلیں گے۔ تاکہ وہ منائے تو مان جائے۔ کس کی خاطر سب کچھ بھلا دیا۔۔۔ اس کے لیے۔۔۔۔ اللہ ماری جو سارا سارا دن سارنگی چھاتی سے لگا۔ "آئی لو یو" چلاتی رہتی ہے بے حیا کہیں کی۔ محبت نہ ہوئی اشتہار ہوا۔ نہ جانے کیا سمجھا ہوا ہے اس نے۔ آخر ایک نہ ایک دن وہ سمجھیں گے ہی آجو کو سمجھاتا کون۔ سمجھاتا بھی تو کیا سمجھا دیتا اسے۔ جو آپ ہی نہ سمجھے تو کون سمجھائے۔

آجو کو دکھ تھا تو صرف یہ کہ فلی سمجھتی نہیں۔ بھلا درد دل کے بغیر لفظ پیدا ہوا ہے کبھی۔ اور درد دل محبت کے بغیر۔۔۔۔ کبھی سنا ہے۔ ہو بھی جائے تو کیا وہ محبت پیدا کرے گا۔ لیکن ہر ماڈرن گرل کی طرح فلی سمجھتی کہ وہ سب کچھ سمجھتی ہے۔ ایک دن وہ بولی۔ "جیون ناؤ میں پریم لاد کر چوار پھینک دینا۔ اونہوں۔ مسٹر آجو یہ بات نہیں چلے گی"۔ آجو بولا۔ "مس فلی جب کنارا ہی پرے سرکتا جائے، پرے سرکتا جائے تو چوار کس کام کے۔" فلی بولی۔ "مسٹر آجو ہر موج کنارا ہو جائے اور ڈوبنا منزل تو خوامخواہ ساحل کو بدنام کرتے پھرنا"۔ "بدنام" آجو مسکرا دیا۔ "مس فلی کیا دیوی، پجاری کے سجدوں سے بدنام ہوتی ہے"۔ "دیوی" وہ طنز سے مسکرائی۔ "دیوی کا کیا ہے۔ پتھر سے بنی ہوئی دیوی"۔ "ہاں" وہ گنگنایا۔ "پتھر سے نہ بنی ہوتی تو ایسی سنگدل نہ ہوتی"۔ "مسٹر" آجو فلی تڑپ کر مڑی۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں چپ ہو گئی۔ دراصل اسے آجو کی باتیں پسند نہ تھیں۔ کیسی عام باتیں تھیں اس کی۔ اور آجو کی نگاہیں اُف وہ نگاہیں۔ یوں منڈلاتی تھیں۔ چمٹس جاتی تھیں توبہ! جان چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ ایسا مشکل ہو جاتا کہ پھر جان چھڑانے کو جی نہ چاہتا۔ بلکہ جی چاہتا کہ دیکھتا ہے تو پڑا دیکھے اور جی چاہتا کہ اسے اور دکھائیں اور دکھائیں۔ خدانخواستہ اگر وہ دیکھنا بند کر دیتا تو کیا ہوتا۔ بہر حال بڑی ہی عام نگاہیں تھیں اس کی۔ آجو منت سے چلایا۔ "مس فلی۔ خدا کے لیے۔ خدا کے لیے مس فلی۔ مس فلی یوں نہ تڑپاؤ۔ یوں مر مر جینا مس فلی۔" نہ جانے کیا ہوا۔ ایک خوشی کی لہر دوڑی۔ "ہم نے تو کسی کو مرتے نہیں دیکھا"۔ اس نے ایک آہ بھری۔ "مر گیا تو ایک دن تم ہی بیٹھ کر رو دو گی"۔ وہ جلال میں آ گیا تھا۔ "اس میں کیا ندا ہے"۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "آپ ہی کا کہنا ہے نا۔ بچانے والا روئے تو واہن بخشی ہے۔ نہیں تو نہیں۔ پھر تو

میری وائلن بجے گی وہ ڈسی۔ اور آجو کا جی چاہا کہ چیخیں مار مار کر رووے۔

وہ گھر جا کر رو رو کر نڈھال ہو گیا۔ پھر دفعتاً مسکرا دیا۔ ہنسنے لگا۔ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ "ہاں اس کی وائلن بجے گی۔ دینا اسے سنے گی۔ اور سر دھنے گی۔ ہاں میں اسے نغمہ سناؤں گا۔ میں آپ اس کی وائلن میں راگ بن کر رہوں گا۔ میرا دل تار بن کر لرزے گا۔ اور وہ اسے چھیڑے گی۔ اپنے ہاتھوں سے چھیڑے گی۔ ہاں اس کی وائلن بجے گی۔ وہ پھر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ سانس اکھڑ گئی اور وہ لیٹ گیا۔ بالکل ہی لیٹ گیا۔ حتیٰ کہ فلی کی وائلن بجی تو بھی اسے خبر نہ ہوئی۔

لوگوں کو اس کی موت کی خبر ہوئی تو وہ حیران رہ گئے۔ "نہیں نہیں وہ مرا نہیں"۔ وہ تو چلا گیا۔ گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ گھر میں سنسنی دوڑ گئی۔

گھر کو چھوڑ کر چلا جانا گھر کے قانون کے خلاف تھا۔ اور آپ مر جانا گھر چھوڑ جانے کے برابر تھا۔ چاہے کوئی روز مر جانے کی دھمکی دیتا اس میں کوئی ہرج نہ تھا لیکن واقعی چلے جانا یا مر جانا بالکل ہی مر جانا گھر کا قانون اسے جرم سمجھتا تھا۔ اس لیے آجو کے گھر والوں نے یہ بات چھپا رکھی۔ لیکن پتہ نہیں فلی کو کس نے بتا دیا۔ شاید وہ جانے سے پہلے رقعہ لکھ کر آپ ہی بتا گیا ہو۔ ورنہ فلی کو کیسے معلوم ہوا۔ کہ وہ اس کی وائلن میں نغمہ بن کر رہنے کے لیے چلا گیا ہے اس کے دل میں درد بن کر رہنے کے لیے۔ ایسا درد جو انگ انگ میں بستا ہے اور جان بن جاتا ہے۔ اور پھر انگلیوں کی راہ تاروں میں بکھر کر فضا میں لہریں لیتا ہے۔

نہ جانے فلی کو کیا ہوا وہ وائلن کو چھاتی سے لگا کر بیٹھ گئی۔ اور وہ بجنے لگی۔ رونے لگی۔ بین کرنے لگی۔ اور آسمان نے اپنے نیلے دامن کو دوہرا کر دیا۔ تا کہ آواز اوپر نہ نکل جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آواز فرشتوں کے کان میں پڑ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ فرشتے گھبرا کر سجدوں سے اٹھ جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ خدا کرشن مہاراج بن کر از سرِ نو گوکل کے بن میں آنے پر مچل جائے۔

جب لوگ پوچھنے آئے تو فلی غصہ میں اٹھ بیٹھی۔ "کون کہتا ہے وہ آپ مرا ہے کون کہتا ہے وہ مرا ہے۔ جھوٹ۔ سب جھوٹ۔ وہ جیتا ہے وہ ہمیشہ جئے گا۔ وہ کبھی نہ مرے گا۔ ہاں وہ میری وائلن میں نغمہ بن کر جیتا ہے۔ اب میں جانتی ہوں اس نے کہا تھا اپنے چاہنے والے کو جانو۔"

نہ جانے دینا نے اس کی بات کہاں سے سن لی۔ "اپنے چاہنے والوں کو جانو۔" یہ بات اس کی نس نس میں دھنس گئی۔ وہ بھاگ اٹھی۔ اور معاً اپنے چاہنے والوں کو جاننے لگی۔ کھاڑی میں روتی ہوئی مرلی کے بین گونجے۔ اس نے انہیں سنا اور سن سی رہ گئی۔ پھر اسے مزید جاننے کے لیے وہ چل کھڑی ہوئی۔ منجو نے اسے آتے دیکھا اور مرلی بجانا بند کر دیا۔ بولا۔ "دھن بھاگ تیں میرے۔" دینا شرما گئی۔ اس

نے اسے جان لیا تھا نا۔ اس لیے وہ دونوں بانہوں میں بانہیں ڈال کر چلے گئے۔ ایک دوسرے کو اور جاننے کے لیے یا اپنے آپ کو بھولنے کے لیے۔ نگر چھوڑ کر چلے گئے۔

دینی چلی گئی۔ دینی نگر چھوڑ کر چلی گئی۔ نگر میں چرچا ہوا۔ کھاڑی میں مرلیوں نے بڑھا چڑھا کر دینا کے چلے جانے کا دکھڑا رو دیا شاید بڑھا چڑھا کر نہ رویا ہو۔ دکھ کو کون بڑھا چڑھا سکتا ہے۔

ادھر تڑی نے اپنے آجو کا آخری پیغام سنا۔ "اپنے چاہنے والے کو جانو۔" وہ گویا چونک کر بھاگ اٹھی۔ کس کے لیے جان سے چلے گئے۔ کس کی خاطر اپنی جوانی لٹا دی۔ اپنا بلیدان دے دیا ہائے کیا ہو گیا۔ اب کیا ہوگا۔ نہیں نہیں وہ گئے نہیں۔ وہ تو مجھے پریم کرنا سکھا گئے ہیں۔ پریم اپنا بلیدان ہے مٹ کر جینا۔ "اپنے چاہنے والے کو جانو"۔ میں پالن کروں گی میں ڈونو سے پریم کی بھیک مانگوں گی۔ وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ نہ کریں تو میں پرائسچت کروں گی۔ میرا سر نہ اٹھے گا۔ اور وہ چھم چھم رونے لگی۔ چھم چھم روتی رہی۔

ڈونو نے سنا کہ دینا چلی گئی نگر چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ ہاں میں جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا۔ وہ میری خاطر نگر چھوڑ گئی ہے۔ میرے لیے اپنا آپ کھو دیا۔ ہاں میرے لیے۔ اسے مجھ سے پریم تھا نا۔ ہائے میں کس قدر اندھا رہا۔ میں نے اسے نہ جانا وہ چلی گئی۔ تاکہ مجھے بیاہ سے انکار نہ کرنا پڑے۔ میری تڑی بدنام نہ ہو۔ اس نے اپنا آپ قربان کر دیا۔ واقعی وہ دیوی تھی اور میں اندھا دیوانہ۔ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور اس چلی گئی دیوی کے سامنے محبت کی جوت جلا کر بیٹھ گیا۔

فلی اپنی وائلن اٹھا کر آجو کی قبر پر جا بیٹھی۔ اسے اپنے مرے ہوئے پریمی سے محبت ہو چکی تھی نا۔ اس کی وائلن سے ہائے بین نکلے۔ تڑی نے یوں محسوس کیا جیسے وہ گیت اس کے اپنے آجو کا سندیس ہو۔ میں پالن کروں گی۔ وہ بڑبڑائی۔ میں نے ڈونو کو جان لیا۔ اور وہ از سر نو ڈونو کے لیے چھم چھم رونے لگی۔ ڈونو کو ایسا محسوس ہوا جیسے دینا جاتے ہوئے اپنا دل کا درد ہوا میں بکھیر گئی ہو۔ جو دینی کی قربانی کا شاہد تھا۔ نہیں نہیں وہ گئی نہیں وہ بھی نہیں بے جسم کے جانے سے بھی کوئی جاتا ہے بلکہ وہ تو نگر میں آ گئی ہے میرے من کے نگر میں۔ میرے من کی دیوی۔ اور دینا کی خاطر وہ کروٹیں بدلنے لگا اور آہیں بھرنے لگا۔

پتوں نے سنا اور وہ سمٹ سمٹ کر ایک دوسرے سے لگ گئے۔ ٹہنیوں نے ایک دوسرے کے شانوں پر سر رکھ کر آہیں بھرنا شروع کر دیا ٹپ ٹپ رونے لگے۔ کوئل نے بچھڑے ہاسیوں۔ کو یوں آوازیں دینا شروع کر دیا۔ جیسے وہ آ جائیں گے۔ پگڈنڈیاں ادھر ادھر دوڑیں جیسے "کھوئے ہوئے" ابھی مل جائیں گے۔ آسمان پر اپنا پردہ اور بھی گاڑھا کر دیا تاکہ گئے ہوئے باشیوں کی یاد آسمانوں پر نہ پہنچ جائے۔ کہیں فرشتے بھی نہ جاننے لگیں کہ اللہ میاں چلے جائیں اور آسمانوں پہ بھی جستجو کی رنگینی نہ

جے چاہو تیں وہاں بھی ایک نگر نہ بس جائے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں یہ سب جھوٹ ہے۔ مبالغہ ہے۔ حقیقت یوں ہے کہ دامن سے بہ باکے بین نکلتے ہیں۔ ٹہنیاں سر دھن دھن کر رہتی ہیں۔ غنچے چھن چھن ناچتے ہیں۔ نگر کے باشی خوشی کے آنسو روتے ہیں۔ ڈنڈیاں ادھر اُدھر ناچتی ہیں۔

لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ چاہے کوئی سی بات سچی ہو۔ بہر حال نگر اور بھی بستا ہے اور نگر کے باشی اور بھی جیتے ہیں۔

☆

ڈودھیا سویرا

شہر سے دُور گرینڈ ٹرنک روڈ کے کنارے پر درختوں کے جھنڈ کے نیچے وہ ایک مختصر سا قبرستان تھا۔ اس میں صرف بیس پچیس قبریں تھیں۔ جن میں بیشتر کچی تھیں۔ پکّی قبروں میں صرف دو یا تین نئی معلوم ہوتی تھیں، اور ان میں سے ایک سفید ٹائیلوں کی بنی ہوئی تھی اس مختصر سے قبرستان کے غربی کنارے پر ایک مسجد تھی جس کے باہر چبوترا سا بنا ہوا تھا مشرقی کنارے کی سڑک کے پاس بس سٹینڈ کا بورڈ آویزاں تھا۔ جس کے پاس ایک کچے کمرے میں چائے کا سٹال تھا۔

قبروں پر درختوں کے سوکھے پتے بکھرے پڑے تھے۔ آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔ اور قریب ہی پہاڑی نالہ جو جانی کے نام سے مشہور ہے شور مچاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ان ٹنڈ منڈ درختوں کے قبرستان میں وہ چاروں اپنے اپنے خیال میں کھوئے ہوئے تھے۔

چھڑا وبلا نوجوان منہ میں پائپ دبائے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے اضطراب بھرے انداز سے سوکھے پتوں پر ٹہل رہا تھا ٹہلتے ٹہلتے وہ رک جاتا اور ایک نظر غور سے قبروں کی طرف دیکھتا۔ اس کا ہونٹ ڈھلک جاتا۔ پائپ اوور کوٹ کی اوپر والی جیب پر جا لگتا۔ پھر وہ آنکھیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا اور ایک لمبی آہ بھر کر پھر سے اضطراب بھرے انداز سے ٹہلنے لگتا۔

موچھوں والا ادھیڑ عمر کا شخص درخت سے ٹیک لگائے آسمان پر تیرتے ہوئے بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی جاذب آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹ یوں بند تھے جیسے ڈرتا ہو کہ انھیں کھولا تو اس کا راز فاش ہو جائے گا۔ اس کے ماتھے پر کرب بھری تیوری چڑھی ہوئی تھی جیسے بند ہونٹوں کی وجہ سے دل کا تمام تر دکھ سمٹ کر پیشانی پر آ گیا ہو۔ ہر چار پانچ منٹ کے بعد شدت جذبات سے جھرجھری سی لیتا اور پھر چونک کر مڑتا اور غور سے قبروں کی طرف حسرت سے دیکھتا اور اس کے گالوں

پر ایک آنسو ڈھلک آتا تو اسے چھپانے کے لیے وہ پھر سے آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔

گٹھے ہوئے جسم کا نوجوان کھدر کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس تھا اور ایک بڑے سے پتھر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ آنکھیں گویا انگاروں کی طرح روشن تھیں۔ چھاتی تنی ہوئی تھی جیسے اسے سانس لینے میں بھی لذت محسوس ہو رہی ہو۔ اس کے انداز میں ایک عجیب بے نیازی تھی۔ ایک بے نام سی انبساط۔ اور وہ چپ چاپ گویا بے تعلقی سے قبروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آ جاتی، اور اس کے چہرے پر دودھیا سویرا اچھل جاتا۔

مسجد کے چبوترے پر اچکن میں ملبوس ایک پاکیزہ صورت معمر آدمی دوزانو بیٹھا زیر لب بڑے خشوع سے کچھ پڑھ رہا تھا۔

قبرستان کے پیچھے شمال میں دور ٹیلے پر ایک گاؤں کے چند مکانات شام کے دھندلکے میں لپٹے ہوئے تھے اور اس سے پرے شہر کے مینار اور فلک بوس عمارتوں کا ایک ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔

دفعتاً پورے آسمان پر بدلیاں چھا گئیں، اور بوندیں پڑنے لگیں اور وہ چاروں قبرستان سے بس سٹینڈ کے مختصر سے چائے خانے کی طرف بھاگے۔ چائے خانے کا کمرہ بہت چھوٹا تھا۔ جس میں صرف ایک لمبا بنچ، ایک کرسی اور ایک لمبی میز پڑی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ سب دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر مونچھ والے نے کوئی بات کرنے کی غرض سے چھدرے دبلے نوجوان سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ کو بہت صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ کتنے مضطرب ہیں آپ بھائی صاحب!"

"مضطرب!" چھدرے دبلے نوجوان نے دہرایا۔ "نہیں نہیں۔" وہ اضطراب بھرے انداز میں چلایا۔ "میں مضطرب تو نہیں۔ میری روئیداد سن کر کیا کریں گے آپ۔" وہ بولا۔ اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اپنی کتھا سنانے لگا۔ "مجھے اس بات کا دکھ ضرور ہے کہ وہ جوانمرگی کا شکار ہو گئی، اور آج اس قبرستان میں مٹی کے ڈھیر تلے بے بس پڑی ہے۔ مگر جہاں تک میرا تعلق ہے، میں خوش ہوں۔ مجھے تو یہ خوشی ہے کہ میں اس سحر سے نکل آیا ہوں۔ اُف کس قیامت کا سحر تھا جیسے کسی نے جادو کر رکھا ہو۔ ہاں وہ جادوگرنی تھی۔" وہ خاموش ہو گیا، اور ان جانے میں بجھے ہوئے پائپ کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔

کھدر پوش نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور زیر لب بولا۔ "آپ کو اس سے محبت ہو گی۔"

"محبت" پتلا دبلا نوجوان چلایا۔ "مجھے معلوم نہیں۔ لیکن محبت ایسی تو نہیں ہوتی۔ نہیں نہیں وہ تو ایک مثبت جذبہ ہے جو اطمینان اور تسکین کا باعث ہوتا ہے۔" پھر وہ یوں بولنے لگا جیسے دیر سے منتظر تھا کہ کوئی اسے چھیڑے۔ "اوہ یہ ۔۔۔۔ یہ تو ایک بیماری تھی، ہاں بیماری۔ ایک ایسی بیماری جس کے تحت مریض خود چاہتا ہے کہ وہ شفایاب نہ ہو۔ اور ایسے حالات پیدا کر لیتا ہے کہ مرض بڑھتا جائے، دوا کرنے

کے باوجود بڑھتا جائے۔"

"عجیب بات ہے" اچکن پوش بزرگ نے سر اٹھا کر پہلی مرتبہ دبلے پتلے مضطرب نوجوان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

بس سٹینڈ کے اس مختصر سے چائے خانے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر ہوا درختوں کے اس جھنڈ میں کراہ رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔

"ہاں" دبلا پتلا نوجوان لمبی آہ بھر کر آپ ہی آپ یوں بڑبڑانے لگا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو، جیسے اسے دوسرے اصحاب کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہا ہو۔ "ہاں عجیب۔ کتنی عجیب عورت تھی وہ۔ کس قدر جاذبیت تھی اس میں۔ توبہ ہے!" اس نے جھرجھری لی۔ اس میں نمائش نہیں تھی۔ نخرا نہیں تھا۔ آج کل کی لڑکیوں کی طرح اس کے ہونٹ بھونرے کی طرح کھلتے ملتے نہیں تھے، اس کی آنکھیں ڈولتی نہیں تھیں، اس کی بھویں تنی تنی نہیں تھیں، اس کی آنکھوں میں متبسم اشارے نہیں جھلکتے تھے۔ اسے دیکھ کر پیار کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ جی چاہتا تھا کہ اس کے قدموں میں گر کر رہ پڑیں۔ وہ لڑکی نہیں تھی، ضیار عورت تھی، ضیار عورت۔ اس پر لڑکپن کبھی نہیں آیا تھا، کبھی نہیں۔ وہ پیدائشی ضیار تھی۔ اس میں ایک عجیب سی آن تھی۔ عجیب سی تمکنت ایک ایسا احساس جیسے کہ وہ تمام کائنات کا محور ہو، مرکز ہو، اُف" دبلے پتلے نوجوان نے یوں لمبی سانس لی جیسے اس کے اندر شعلے بھڑک رہے ہوں" اس کے روبرو اپنی شخصیت شل ہو جاتی تھی۔ اپنی آرزوئیں گویا مفقود ہو جاتی تھیں۔ جی چاہتا تھا وہی کریں جو وہ چاہتی ہے۔ جی چاہتا تھا وہ احکام جاری کرے اور ہم تعمیل کریں۔ عجیب عورت تھی وہ عجیب۔" وہ پھر اپنے خیالات میں کھو کر چپ ہو گیا۔

باہر درختوں کی ٹہنیوں میں گرتی ہوئی بوندیاں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی ہچکیاں لے رہا ہو۔ دور جانے ہنڈی بین کر رہی تھی۔ کمرے میں اچکن پوش سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کھدر پوش غور سے میز کی طرف گھور رہا تھا اور مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا شخص ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کمرے کی دیوار کے پار نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔

"ہاں جادو" دبلا پتلا نوجوان بولا۔ "اس نے مجھ پر بچپن سے ہی جادو کر رکھا تھا۔ اور، اور جب میں نے ہوش سنبھالا میں اس کے پیچھے پیچھے گود کے لیلے کی طرح پھرتا رہتا تھا۔ جہاں بھی وہ جاتی، میں اس کے پیچھے جاتا۔ وہ کسی سے ملنے کے لیے گھر کے اندر چلی جاتی تو میں دہلیز پر بیٹھ جاتا اور انتظار کیا کرتا کہ کب وہ باہر نکلے اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل سکوں۔ وہ چوبارے میں بیٹھ کر سوئٹر بنتی تو میں اس کے سامنے چوکی یا پتھر پر بیٹھ رہتا۔ وہ ہنڈیا پکانے میں مصروف ہوتی تو میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو

رہتا۔ وہ سکول جاتی تو میں سکول کے دروازے تک اس کے پیچھے پیچھے جاتا۔ پھر سکول میں داخل ہوتے وقت وہ مڑ کر میری طرف دیکھتی اور اس کی آنکھوں میں ایک شریر مسکراہٹ چمکتی، اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی شرارت میں، میں اس کے ساتھ شریک ہوں۔ سوئٹر بنتے ہوئے تاگا توڑتے وقت یا سلائی پر دھاگے کھینچتے وقت مجھے وہاں بیٹھے دیکھ کر وہ مسکراتی۔ وہی مسکراہٹ جیسے ہم دونوں کسی پوشیدہ شرارت میں اکٹھے شریک ہوں۔ بس وہی مسکراہٹ مجھے اس بات پر اکساتی تھی کہ میں گود کے لٹنے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے پھروں۔"

"گھر کے سب لوگ اسے اس بات پر چھیڑا کرتے تھے۔ میری ماں بھی ہنس کر اس سے پوچھا کرتی۔ اے ہے تم نے تو لڑکے پر جادو کر رکھا ہے کیا۔" کوئی کہتا تو بہ ہے اس لڑکے کو کیا ہے پلے کی طرح تمہارے پیچھے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ کوئی کہتا یہ لڑکا تو اپنی ماں کے ہاتھوں سے بھی نکل گیا لیکن ان دنوں میں ابھی بچہ ہی تھا۔ اس لیے لوگ بات کر کے ہنس پڑتے تھے اور بس، وہ خود بھی ہنسا کرتی۔ اور کبھی کبھی میرے قریب آ کر میرے منہ پر ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی۔" کیوں رے تجھے میرے پیچھے پھرنے میں مزہ آتا ہے کیا؟" اور پھر ایک عجیب سی نگاہ میری طرف ڈال کر دہراتی "مزہ آتا ہے" اس کے کہنے کا انداز ایسا ہوتا کہ میں ایک مزے بھری تھر تھری محسوس کرتا اور اس کی نگاہ کی شرارت کی چمک کی وجہ سے میں محسوس کرتا جیسے وہ کہہ رہی ہو اونہوں کسی کو بتانا نہیں کہ اس مزے بھری شرارت میں ہم دونوں برابر کے شریک ہیں۔ برابر کے۔ چپ۔"

دبلے پتلے نوجوان نے ایک شدید جھرجھری لی، اور پھر جیبوں کو ٹٹول کر دیا سلائی نکالی اور ماچس جلا کر پائپ کے لمبے لمبے کش لینے شروع کر دیے۔ اچکن پوش بزرگ اپنا ورد بھول چکے تھے۔ اور منہ کھولے دبلے پتلے نوجوان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ موچھوں والا ادھیڑ عمر کا مرد ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ کھدر پوش ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی رکھے گہری سوچ میں پڑا تھا۔ باہر ٹین کی چھت پر بوندیاں گویا یوں جلترنگ بجا رہی تھیں جیسے کوئی مغنی مزے میں آیا ہوا ہو۔

"اس مزے کی وجہ سے میں اپنی عمر سے پہلے ہی جوان ہو گیا۔" پتلا دبلا نوجوان بولا" میرا مطلب ہے بچپن ہی میں جوانی کی شرارت گویا مجھ پر مسلط ہو گئی۔ اسے بھی اس حقیقت کا احساس تھا اور وہ اس بات پر ہنسا کرتی تھی۔ اس کی ہنسی میں طنز نہیں ہوتی تھی۔ اونہوں! جیسے مصور اپنے نقش کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے تقریباً پانچ سال بڑی تھی۔ لیکن اس کی اس رازدارانہ مسکراہٹ نے گویا مجھ میں بلوغت کا خمیر پیدا کر دیا تھا اور میں اپنے آپ کو اس کا ہم عمر سمجھنے لگا تھا۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا۔" پھر اس کی مسکراہٹ کا وہ رازدارانہ رنگ گویا اس کی

آنکھوں سے رس رس کر بہنے لگا حتیٰ کہ اس کی ہر حرکت اسی رنگ میں شرابور ہو گئی اور۔۔۔ اور میری نظر میں اس کے جسم کے پیچ وخم یوں عریاں دکھائی دینے لگے جیسے وہ ہولی کھیل کر آئی ہو اور ہر نگاہ کے ساتھ جو میں اس کے اوپر ڈالتا میری آنکھوں میں اسی رنگ کی پھوار پڑتی اور میرے جسم میں ایک ہوائی سی چل جاتی تو بہ۔" اس نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے یوں بھیگے بھیگے انداز سے کہا جیسے وہ رنگ میں شرابور ہو گیا ہو۔ پھر دفعتاً سر اٹھا کر بولا۔ " پھر اس نے وہ شرارت سازش میں بدل دی اور۔۔۔ اور ایک معصوم لڑکے کو جس نے عنفوان شباب کے عالم میں ابھی قدم رکھا ہی تھا، گناہ کے احساس سے شناسا کر دیا، تو بہ۔" وہ پھر چلایا۔" جو گناہ سے آشنا نہ تھا۔ جس نے گناہ کی آرزو تک نہ کی تھی اسے گناہ کے احساس سے شناسا کر دیا اور شناسا ہی نہیں بلکہ شرابور کر کے بھیگے کبوتر کی طرح اس کی قوت پرواز ختم کر دی اور یہ سب ایک جملے ایک کنایہ سے چپ کوئی آ رہا ہے۔" کس قدر معصوم جملہ ہے۔ لیکن ایک خوبصورت مٹیار کے منہ سے رازدارانہ انداز سے نکلے تو، تو بہ ہے۔" ایک ساعت کے لیے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر آپ ہی آپ کہنے لگا۔" ہم دونوں ایک دوسرے سے دور بیٹھے ہوتے وہ اپنے کام کاج میں منہمک ہوتی، اور میں چپ چاپ نگاہوں سے اس کے پاؤں کی انگلیوں سے کھیل رہا ہوتا، پاؤں کی چاپ سن کر دفعتاً وہ میری طرف دیکھتی اور خاموشی سے اشارہ کرتی "چپ کوئی آ رہا ہے" اور میرا دل اُچھلتا اور میں اپنے آپ کو یوں سنبھالتا جیسے کوئی پکڑا گیا ہو اور پھر میں محسوس کرتا جیسے آنے والا ہمارے راز سے واقف ہو۔" وہ ہنسنے لگا۔" عجیب بات تھی۔ راز کی نوعیت جانے بغیر میں اس کے کھل جانے سے ڈرتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ راز کے کھلنے کا ڈر پیدا کر کے دراصل وہ مجھے راز کی نوعیت کی عملی تحقیق کرنے پر اکسا رہی تھی۔"

" پھر ایک روز شام کے وقت جب ہم دونوں کمرے میں اکیلے اگرچہ دور دور بیٹھے تھے تو اس کے والد صاحب کی کھنکھار سنائی دی، وہ دیوانہ وار اٹھی اور میرا بازو پکڑ کر گھسیٹ کر کمرے کے کونے میں لے گئی اور مجھے الماری کے پیچھے ٹھونس دیا۔ وہ پہلا دن تھا۔ جب اس معصوم شرارت پر سازش کی مہر لگ گئی۔" وہ خاموش ہو گیا۔ اور دروازے کے باہر گرتی ہوئی بوندیوں کو غور سے دیکھنے میں کھو گیا۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ اچکن پوش بزرگ پھر سے سر جھکا کر ورد کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا مرد اضطراب بھرے انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیرنے میں مصروف ہو جاتا۔ آخر وہ بے اختیار ہو کر بولا۔۔۔ " پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا۔"

" پھر۔۔۔؟" دبلا پتلا نوجوان چونکا۔" پھر۔۔۔؟" اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ اپنا قصہ بیان کر رہا تھا۔" اوہ۔ ہاں" وہ چلایا۔" پھر کیا ہونا تھا۔ پھر وہی ہوتا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ اور کیا ہو سکتا تھا

اور میں۔ میرا عزم تو یوں شل ہو چکا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ پھر اسی روز اس نے مجھ سے کہہ دیا۔ کہنے لگی۔ ''اب تم نہ آیا کرو میاں جب تک میں خود نہ بلاؤں۔'' پھر دفعتاً نہ جانے کیا سمجھ کر اس نے میری جانب دیکھا۔ وہی سازشی نگاہ، وہی چپ کا سا انداز۔ ''میں بلایا کروں گی۔'' وہ بولی۔ ''ہاں'' اس ہاں نے وہ منفی احساس جو اس کے منع کرنے کی وجہ سے مجھ پر مسلط ہو گیا تھا۔ قطعی طور پر رفع کر دیا۔ اور میں نے پہلی مرتبہ اسکی ہاں کا مثبت اثر محسوس کیا اس وقت گویا ساری کائنات سمٹ کر میری جھولی میں آ گری۔ آتشدان پر شانت آسن میں بیٹھا ہوا دیوتا میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر اس نے میرے سامنے سر جھکا دیا اور آتش دان پر بچھے ہوئے کپڑے پر کاڑھے ہوئے پھولوں میں سے خوشبو کا ایک ریلا آیا اور سارا کمرہ خوشبو سے بھر گیا۔ وہ ہنسنے لگا'' عجیب عمر تھی وہ بھی۔ کاش کہ میں اس جادوگرنی کے سحر میں نہ آتا۔'' اس کی ہنسی زہر خند میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور دروازے میں کھڑے ہو کر درختوں کے جھنڈ تلے بکھری ہوئی قبروں کی طرف دیکھنے لگا۔

''عجیب واقعہ ہے۔'' اچکن پوش بزرگ نے زیر لب کہہ کر آہ بھری۔ ''تو کیا اس نے تمہیں بلایا۔'' مونچھوں والے ادھیڑ عمر کے مرد نے پوچھا۔

''ہاں'' وہ بولا۔ ''کئی بار، لیکن بے کار۔ ہر بار جب بھی بلاتی تو کوئی نہ کوئی آ جاتا اور مجھے پردے یا الماری کے پیچھے چھپا دیا جاتا۔ جہاں میرا دل دھک دھک کرتا۔ میرے جسم کا بند بند سمٹتا پھیلتا، میرا حلق بند ہو جاتا اور چاروں طرف سے ایک ان جانا بوجھ مجھ پر پڑتا۔ توبہ ہے۔'' وہ چلایا'' جیسے جیسے ڈر اور خوف مجھے انڈے کی طرح پھینٹ کر رکھ دیتے۔ لیکن اس کے باوجود میں انتظار کرتا رہتا کہ کب وہ بلائے اور میں جاؤں۔۔۔'' پھر'' وہ آہ بھر کر بولا'' پھر اس کی شادی ہو گئی اور۔۔۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ مجھے اس بات پر دکھ نہ ہوا کہ وہ کسی اور کی ہو رہی ہے بلکہ صرف اس بات پر کہ اس سے چوری چھپے ملنے کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ حالانکہ ہمارے ملنے کی صورت کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ عجیب بات ہے نا''۔ وہ پائپ کا کش لیتے ہوئے بولا۔ اور جب وہ رخصت ہونے لگی تو اکیلے میں مجھ سے کہنے لگی'' تم فکر نہ کرنا۔ میں تمہیں بلاؤں گی۔ میں بلاؤں تو آنا ضرور۔ ضرور آنا۔ اس کی اتنی سی بات پر مجھے اطمینان سا ہو گیا اور میری تمام شکایات یوں ختم ہو گئیں جیسے پیدا ہی نہ ہوئی ہوں اور ایک بار پھر میں انتظار کی لذت میں کھو گیا۔

''چھ مہینے گزر گئے''۔ اس نے مختصر سے وقفے کے بعد کہا'' لیکن مجھے اس کا بلاوا نہ آیا۔ اس کے رنگین وعدے کا سحر ٹوٹنے لگا اور۔ اور وہ زہر خند کے ساتھ بولا۔'' ایک روز میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر وہاں جا پہنچا۔ جہاں وہ رہتی تھی۔ اور پھر ایک رات جب اس کا خاوند گھر پر نہ تھا۔ میں ناگہاں اس کے

روبرو جا کھڑا ہوا۔"

"مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ گھبرا گئی، لیکن جلد ہی سنبھل کر بولی "شکر ہے تم آ گئے۔ آؤ آؤ لیکن ادھر اس کونے میں کوئی نوکر نہ دیکھ لے۔" اس نے مجھے اسی نگاہ سے دیکھا۔ وہی سازش وہی شوخی، وہی نیم مدہوشی۔ مجھے وہاں بٹھا کر وہ کام کاج میں مصروف ہو گئی۔ اور رنگین تتلی کی طرح ادھر ادھر گھومنے لگی۔ ہر چند منٹ کے بعد چپکے سے وہ اس کونے میں آ جاتی جہاں میں بیٹھا تھا۔ اور پھر وہی نگاہ، وہی تبسم۔ کام کاج سے فارغ ہو کر جب ہم اکٹھے ہوئے تو وہی بات وقوع میں آئی جو ایسے موقع پر ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔ بیٹھے بٹھائے آہٹ کی آواز سن کر وہ زیر لب چلائی۔" وہ۔ وہ آ گئے اور پھر اپنی بانہوں میں تھام کر گھسیٹتے ہوئے وہ مجھے ساتھ والے چھوٹے کمرے میں لے گئی۔ اور مجھے وہاں بٹھا دیا۔ "چپ" وہ بولی اور دروازے کے پٹ بند کر کے خود باہر نکل گئی۔ اور میں اس تنگ و تاریک کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ توبہ ہے، اس رات میرا کیا حال ہوا۔ توبہ ہے" پتلے دبلے نوجوان نے لمبی آہ بھر کر کہا۔ "خوف کا ایک آرہ تھا جو مجھے کاٹ رہا تھا۔ وہی بوجھ۔ وہی گھٹن۔ وہی تناؤ۔ توبہ ہے۔"

"دو گھنٹے وہاں دبک کر بیٹھنے کے بعد میرے لیے وہ تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی اور خطرے سے بے پروا ہو کر میں نے باہر نکل بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب میں دبے پاؤں نکلا تو کیا دیکھتا ہوں، توبہ ہے۔ وہ چلایا "توبہ ہے۔"

"کیا" مونچھوں والا بولا۔

"وہ اکیلی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ ایک بازو سر تلے دبایا ہوا تھا۔ اور اس کے چہرے پر اتنی مسرت اور شگفتگی چھائی ہوئی تھی جیسے خوشی سے سرشار ہو اور سارے گھر میں اس کے اور اس کی نوکرانی کے سوا کوئی نہ تھا۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ اس کی تمام تر خوشی اسی بات پر موقوف تھی کہ کسی کو الماری یا پردے کے پیچھے چھپا دے۔ جہاں وہ تڑپ تڑپ کر اپنا آپ اس کے لیے ہلکان کرتا رہے اور خود اطمینان سے سو جائے۔ غصے سے میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور پھر پیشتر اس کے کہ وہ مجھے پکڑ لیتی میں ہمیشہ کے لیے اس کے گھر سے نکل آیا۔ بھاگ آیا۔"

گھر آتے ہی میں نے اماں سے کہا "اماں میری شادی کر دو، چاہے کسی سے کر دو۔ اماں کر دو۔ اور جب میری شادی ہو گئی اور میری حسین و جمیل بیوی میرے پاس آ گئی تو۔۔۔" تو وہ رک گیا "توبہ ہے"۔ وہ بولا "حد ہو گئی حد"۔

"کیا"۔ مونچھوں والے نے بے تابی سے پوچھا۔

"جب میں اپنی نئی دلہن کے پاس بیٹھا تھا تو دفعتاً میرا جی چاہنے لگا کہ کوئی آ جائے اور میری بیوی

مجھے گھسیٹ کر لے جائے اور کہیں چھپاتے ہوئے وہ آ گئے۔ چپ کے۔ میری اپنی بیوی۔" وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا۔" اور آج تک۔ آج تک میری یہی حالت ہے"۔ وہ بولا۔" مگر کوئی نہیں آتا اور کوئی آ بھی جائے تو وہ ایسا نہیں کرتی۔ یہ نہیں کہتی وہ آ گئے وہ۔ وہ۔ تو بہ ہے۔ تو بہ ہے۔" وہ چلایا۔" میں کتنا کمینہ ہوں، کتنا کمینہ ہوں میں مگر یہ سب کچھ اس کے سحر کا نتیجہ ہے۔ ہاں اسی کا۔ اور آج ابھی جب میں اس کی قبر کے پاس بیٹھا تھا۔ تو خدا کی قسم میں منتظر تھا کہ وہ باہر نکل کر کہے" وہ آ گئے وہ۔" وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا۔

باہر ہوا درختوں کی ٹہنیوں میں رو رہی تھی۔ جانی بنذی بین کر رہی تھی۔ بوندیاں چھم چھم کر رہی تھیں۔ اور اس کی دیوانگی بھری ہنسی کس قدر خوفناک تھی۔ پھر دفعتاً اس کی ہنسی ایک کراہ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر میز پر کہنیاں ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اور کمرے میں کرب ناک خاموشی چھا گئی۔

" چائے بابو جی" چھوٹا لڑکا ٹرے پر چائے کے چار پیالے رکھے ہوئے داخل ہوا اور ایک ایک پیالہ ان کے سامنے رکھ کر باہر نکل گیا۔

چائے آ جانے سے کمرے کے ماحول میں کچھ تبدیلی سی ہو گئی۔" زندگی کس قدر عجیب ہے" کھدر پوش نے کہا۔" ان دکھوں اور غموں کے باوجود جو ہمیں برداشت کرنے پڑتے ہیں"۔ اچکن پوش نے لمبی آہ بھری۔" بجا ہے۔" وہ بولے۔" لیکن صاحب انجام کار سب نے یہیں آ جانا ہے۔" کھدر پوش نے مونچھوں والے ادھیڑ عمر کے مرد کی طرف دیکھا۔" معلوم ہوتا ہے آپ بڑے دکھی ہیں"۔ وہ بولا۔" کوئی عزیز داغِ مفارقت دے گئے ہیں کیا۔"

" میرے عزیز" مونچھوں والے نے سر اٹھایا۔ نہیں عزیز تو نہیں۔ اس کی مجھ سے رشتہ داری نہ تھی۔" تو" کھدر پوش مسکرایا" محبت" وہ فقرہ مکمل کیے بغیر چپ ہو گیا۔

" محبت" مونچھوں والے نے آہ بھر کر دہرایا۔" کاش میں اس کی محبت کی قدر کرتا۔ میں نے قدر نہ کی۔" اس کی آواز بھر آئی۔" وہ میری محسن تھی صاحب محسن۔"

" محسن تھی" اچکن والے بزرگ نے" تھی" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

" ہاں" مونچھوں والا بولا۔" وہ بھی عورت تھی۔ اب تم سے کیا چھپانا ہے بھائی صاحب۔" اس نے کہا۔" اس بات کو تو سب ہی جانتے ہیں۔ ہمارے گھر میں اللہ کا فضل رہا ہمیشہ۔ اپنا کاروبار ہے۔ کام کرنے کے لیے کارندے ہیں۔ مجھے صرف دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے اور باقی سارا وقت اپنے شغلوں میں صرف ہو جاتا ہے۔ بے فکری ہے۔ پیسہ عام ہے۔ ساری عمر اپنی کھانے پینے اور عیش کرنے میں صرف ہوئی ہے۔ جو چاہا مل گیا۔ جس کی آرزو کی وہ حاصل ہو گئی۔ محبت کرنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس

نہیں ہوئی۔ البتہ کبھی کبھار کسی پر طبیعت آ گئی اور طبیعت اپنی ایسی کمبخت ہے کہ جب کسی پر آ جائے تو، وہ ہنسنے لگا۔ ''میں اندھا ہو جاتا ہوں۔ تمہاری قسم پھر کچھ نہیں سوجھتا۔ جی چاہتا ہے چاہے ساری دولت ہی کیوں نہ لٹانی پڑے اسے حاصل کر لوں، اور پھر جب حاصل ہو جائے تو چند ایک روز میں چاؤ اتر جاتا ہے اور پھر اپنی توجہ کسی اور طرف لگ جاتی ہے۔ اللہ کا فضل ہے۔ آج تک کبھی ناکامی نہیں ہوئی جو چاہا ملا۔ جسے چاہا حاصل کر کے چھوڑا'' وہ ہنسنے لگا۔

''کوئی پانچ سال ہوئے ہوں گے۔ جب اتفاق سے اپنی نظر ایک کالج کی لڑکی پر پڑ گئی تھی۔ اور کیا بتاؤں تمہیں ایسی بری طرح مچل گئی طبیعت کہ میں پاگل ہو گیا۔ بس بھائی صاحب ہر جتن کر کے دیکھ لیا، اس کی منتیں کیں، لالچ دیا، کہلوا بھیجا میں دولت لٹا دوں گا۔ صرف ایک بار مجھ سے مل جا۔ بیسیوں شنیوں اور والوں کو بیچ میں ڈالا۔ مگر اس اللہ کی بندی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر اٹھا لے جانے کی دھمکیاں دیں۔ سب بے کار۔ اور جوں جوں مجھ میں ناکامی کا احساس بڑھتا توں، توں میرا جنون اور بڑھتا۔ حتیٰ کہ یہ حالت ہو گئی کہ مجھے وہ عیش و عشرت کھٹکنے لگا جس کا میں عادی تھا۔

ان دنوں اس محلے میں جہاں وہ رہتی تھی عین اس کے گھر کے سامنے ایک مکان جو خالی ہوا تو میں نے جھٹ اُسے سرے سے خرید ہی لیا۔ اور اس مکان کو اپنی بیٹھک بنا لیا کہ دیکھو شاید داؤ چل ہی جائے۔ لیکن میری کوئی پیش نہ گئی۔ وہ لڑکی نہ جانے کیا نام تھا اس کا۔ عجیب سا نام تھا۔ لیکن ہم چار یاری میں اُسے شہزادی کہا کرتے تھے۔ وہ بالکل قابو میں نہ آئی۔

اسی محلے میں ہمارے ساتھ والے مکان میں یہ عورت رہا کرتی تھی جس کی قبر پر میں آج یہاں آیا ہوں۔

اس نے دو چار بار مجھے اپنی نوکرانی کے ہاتھ بلوا بھیجا عجیب عجیب بہانوں سے بلایا کرتی تھی۔ پہلی مرتبہ نوکرانی نے کہا۔ ''ذرا ادھر آؤ تو۔ بی بی بلا رہی ہیں ان سے بات کر لیجئے۔ ڈیوڑھی کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہیں۔'' دوسری بار تھوڑی سی برانڈی منگوا بھیجی۔ اسی طرح چار پانچ مرتبہ مجھے ملنے پر اکسایا گیا۔ لیکن اپنی طبیعت تو ان دنوں شہزادی پر مائل تھی۔ اور سچ پوچھو تو بیاہی ہوئی عورت سے اپنے کو کبھی دلچسپی نہیں ہوئی طبیعت ہی ایسی ہے۔

پھر ایک روز جب رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے تو اس کی نوکرانی پرچی لے کر آ گئی۔ لکھا تھا۔ ''شہزادی سے ملنا ہو تو رات کے ایک بجے آؤ۔'' میں اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ ڈر تھا کہ انتقام لینے کے لیے چال نہ چلی گئی ہو۔ جس عورت کو آپ دھتکاریں۔'' وہ کھدر پوش سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''وہ انتقام لینے پر آمادہ ہو جایا کرتی ہے۔ بہر صورت چار یاری میں آپس میں مشورہ کرنے

کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو ہمیں آزمانا ضرور چاہیے۔ تو بھائی صاحب ہم نے حفاظتی تدابیر سوچ لیں اور میرے چاروں یار گھر کے چاروں طرف چوکنے بیٹھے رہے کہ کوئی چال ہو تو مکان پر دھاوا بول دیں اور میں مکان کے اندر چلا گیا۔ اس رات پہلی مرتبہ میں نے اسے دیکھا۔ وہ بے حد خوبصورت تھی شہزادی سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ لیکن خوبصورتی کیا چیز ہے بھائی صاحب سارا کھیل تو طبیعت کا ہے۔ وہ صرف دو ایک منٹ میرے پاس ٹھہری اور پھر شہزادی کو میرے حوالے کر کے آپ چلی گئی۔ اور بھائی صاحب اس عورت نے کیا جادو کر دیا تھا اس لڑکی پر وہ تو بالکل رام ہو چکی تھی رام۔ پھر ہم وہاں اکثر ملنے لگے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں ملانے کے بعد وہ اپنا تقاضہ شروع کر دے گی۔ لیکن میرے شک بالکل ختم ہو گئے اس کی نگاہوں اور انداز میں بلا کی آن تھی۔ آن اور بے تکلفی۔ وہ میرے پاس صرف دو ایک منٹ کیلئے ٹھہرتی تھی، لیکن جب میں وہاں جاتا اور جب وہاں سے لوٹتا تو وہ آتی ضرور اور ہنس کر مجھ سے کہتی تم آ گئے تم جا رہے ہو۔ پھر کب آؤ گے، وہ ہمیشہ مجھے تم کہا کرتی تھی۔ عجیب عورت تھی وہ۔ ہاں بھائی صاحب وہ آہ بھر کر بولا چار ایک ماہ تک ہم ملتے رہے۔ لیکن پھر اپنی طبیعت اکتا گئی۔ جیسے ہمیشہ اپنا طریقہ ہے۔ وہ ہنسا۔" اور پھر وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔"

کوئی چھ ماہ کے بعد ایک روز جب اپنی اسی بیٹھک میں، میں ایک نئی لڑکی پھنسا کر لایا ہوا تھا تو نہ جانے کس نے میرا بھید فاش کر دیا۔ اور لڑکی کے رشتہ دار پولیس لے کر وہاں آ گئے اب وہ آدھی رات کے وقت نیچے میرا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں اور اوپر میں سخت گھبرایا ہوا ہوں۔ بدنامی اور رسوائی کے ڈر سے لڑکی کو ادھر اُدھر بھی نہیں کر سکتا۔ سارے محلے دار اپنے دشمن تھے۔ کرتا کیا عجیب مصیبت میں گرفتار تھا کہ دھم سے وہ کوٹھا پھاند کر میرے گھر میں اتر آئی اور آتے ہی بولی تم چلے جاؤ جی وہاں اُس کمرے میں، میں سنبھال لوں گی۔ اس وقت اس نے عجیب سی پوشاک پہن رکھی تھی۔ ساڑھی اور بندی اور نہ جانے کیا کیا۔ حالانکہ وہ ساڑھی نہیں باندھتی تھی۔ بال بھی عجیب سے بنا رکھے تھے۔ پہچانی ہی نہیں جاتی۔ غالباً وہ جان بوجھ کر بھیس بدل کر آئی تھی۔" اُف" اس نے آہ بھری بڑی دلیر عورت تھی وہ۔ دلیری سے اس نے باہر کا صدر دروازہ کھولا اور سب کے سامنے کھڑی ہو گئی۔" کیا ہے، وہ بولی۔ میرے میاں خود گھر پر نہیں ہیں۔ میں ان کی بیگم ہوں"۔ اسے یوں کھڑا دیکھ کر پولیس والے اور ان کے ساتھی چوہوں کی طرح دبک کر چلے گئے اور میں صاف بچ گیا۔ صاف۔

اسی روز جب وہ مجھ سے اکیلے میں ملی تو اس کے لیے میرے دل میں شدید جذبہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر تمہارے خاوند کو معلوم ہو گیا تو۔ بڑی دلیری کی ہے تم نے۔" تم میری فکر نہ کرو" وہ بڑی آن سے بولی۔ اپنی بات کرو تم، اس وقت مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ میرے دل میں اس کے لیے محبت کا

ایک طوفان سا چل رہا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ لپک کر اسے بازوؤں سے تھام لیا، لیکن وہ تڑپ کر باہر نکل گئی۔ میرا احسان اتار رہے ہو۔ وہ بولی، اُونہوں! میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ وہ ہماری آخری ملاقات تھی۔

پھر میں نے اس بیٹھک میں اپنا قیام چھوڑ دیا اور پھر جب میں نے کل ناگہاں سنا کہ وہ انتقال کر گئی ہے تو میں غم سے پاگل ہو گیا۔ اور آج اس کی قبر پر بیٹھے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میری واحد محبوب تھی۔ اور جیسے وہ قبر سے نکل کر کہے گی۔ ''تم بتم میرا فکر نہ کرو، جاؤ گھر جاؤ۔'' اس نے ایک لمبی آہ بھری اور اپنی آنکھیں پونچھنے لگا۔

دیر تک کمرے میں طویل خاموشی چھائی رہی۔ چتکا زبلا نوجوان ویسے ہی ٹھوڑی ہاتھوں میں رکھ کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کھدر پوش میز کو انگلی سے بجا رہا تھا۔ اور اچکن پوش معمر آدمی زیرلب کچھ پڑھ رہا تھا۔ اور۔ اور آپ چتکا زبلا نوجوان چونک کر بولا ''آپ کیسے آئے ہیں۔ یہاں آپ کا کون عزیز فوت ہو گیا ہے۔'' وہ اچکن پوش اور کھدر پوش دونوں اصحاب میں سے نہ جانے کس سے مخاطب تھا۔

کھدر پوش مسکرایا۔ ''میرا گرو''۔ وہ بولا ''میرا پیر سمجھو میرا سبھی کچھ۔'' وہ اس قبرستان میں دفن ہے۔ اس نے مجھے وہ دولت بخشی ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اگر میں اس سے نہ ملتا تو آج میں بھی عام نوجوانوں کی طرح سرخ ہونٹوں، سیاہ بالوں، مجسم آنکھوں اور سنہرے بدن کی ان بوتلوں میں کھویا ہوتا۔ جو آج کل سڑکوں اور بازاروں میں آزادی سے گھومتی پھرتی ہیں۔ شاید آپ نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ عورت کا وجود کتنا دبیز پردہ ہے، جو ہماری عقل پر پڑا ہے اور آج کی تہذیب اسے اور رنگین اور دبیز بنانے میں شدت سے مصروف کار ہے۔ اس جیتے جاگتے رنگین جنور کا صرف ایک مقصد ہے کہ وہ مرد کو لے ڈوبے اور اس کی کائناتی نگاہ کو ناکارہ کر دے، اسے زندگی سے بیگانہ بنا دے۔ اُف کتنا عظیم پردہ ہے۔'' وہ شانے ہلاتے ہوئے بولا۔ ایسا پردہ جسے ہم بخوشی اپنی عقل پر ڈالنے کے مشتاق ہیں۔ کتنی بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر میری اس سے ملاقات نہ ہوتی، تو آج میری حسیات پر بھی وہی پردہ پڑا ہوتا۔ میرے بھی پر کٹے ہوتے تمہاری طرح۔''

اچکن پوش معمر نے سر اٹھا کر غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا مرد حیرانی سے منہ کھولے بیٹھا تھا اور دبلے پتلے نوجوان پر مایوسی سی چھائے جا رہی تھی۔

''ہاں'' کھدر پوش بولا۔ ''یقین کیجیے، یہ سب اسی کی دین ہے اسی کی۔ حالانکہ مجھے صرف ایک مرتبہ ملی تھی، بس صرف ایک مرتبہ۔''

''ملی تھی'' اچکن پوش کی دونوں آنکھیں گویا باہر نکل آئیں۔ مونچھوں والوں کے کھلے ہونٹوں پر تبسم دوڑ گیا۔ دبلے پتلے نوجوان نے دفعتاً اضطراب سے پائپ کے کش لینے شروع کر دیئے۔

کھدر پوش مسکرایا۔ ''ہاں'' وہ بولا۔ ''میری نظر وہی ایک عورت تھی بلکہ حسین عورت۔ ایک رنگین ترین بھنور۔ ایک ایسی ناگن جس کے کاٹنے کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے پر گہری خاموشی چھا گئی۔ باہر درختوں میں گویا بھوتنیاں ناچ رہی تھیں۔ دور جانی ندی سر پٹک پٹک کر رو رہی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ اور چولھے پر رکھی ہوئی چائے کی کیتلی ایک غم ناک دھن بجا رہی تھی۔

''میں ایک زمیندار کا بیٹا ہوں''، کھدر پوش بولا۔ ''ہمارا گاؤں پہاڑ پر واقع ہے۔ سمجھو کوئی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر۔ بچپنے سے ہی ہم پہاڑوں پر چڑھنے کے شوقین تھے اور اکثر بہت دور، بہت اونچے نکل جایا کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں سے اوپر، کوئی چار ہزار فٹ اوپر یا شاید زیادہ ایک غار ہے جسے قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اس کا منہ تنگ ہے مگر اندر سے کافی وسیع و عریض ہے۔ اس کی چھت بہت اونچی ہے اور فرش بہت صاف۔ جس کے ایک طرف سے چشمہ نکلتا ہے اور وہیں تالاب سا بن جاتا ہے اور پھر نہ جانے اس کا پانی کدھر کو بہہ نکلتا ہے گویا نیچے ہی نیچے غائب ہو جاتا ہے اور اس غار سے منظر اس قدر خوبصورت دکھائی دیتا ہے کہ ہم دیکھ کر دم بخود رہ جایا کرتے تھے۔ پھر موسم سرما میں جب چاروں طرف برف پڑ جاتی تو اس غار سے ایک عجیب نظارہ دکھائی دیتا۔ عجیب''۔ اس نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا لیکن موسم سرما میں راستے بند ہو جایا کرتے تھے اور وہاں پہنچنا محال ہو جاتا۔ پھر بھی پہلی بار برف پڑتی تو ہم وہاں ضرور پہنچتے اور وہاں سے عجیب نظارہ نظر آتا جیسے وہ کوئی اور ہی دنیا ہو۔ اور ہی جہان ہو۔

جب میں جوان ہوا تو نہ جانے کیوں میرے دل میں صرف ایک ہی خواہش تھی کہ کوئی نئے فیشن کی حسین عورت ہو اور ہم دونوں موسم سرما میں اکیلے اس غار میں رہیں۔ اکیلے نہ جانے یہ خواہش میرے دل میں کیسے پیدا ہوئی مجھے معلوم نہیں۔ لیکن وہ بڑھتے بڑھتے جنون کی صورت اختیار کر گئی۔ ویسے پہاڑ کی عورتیں تھیں۔ مگر مجھے ان سے نفرت تھی۔ میری نگاہ میں وہ عورتیں ہی نہیں تھیں۔

پھر والد کے انتقال کے بعد میں نے اسے عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ بات بڑی مشکل تھی۔ ایسی عورت کو ڈھونڈنا بے حد مشکل تھا۔ تو قصہ مختصر میں اکثر شہر جانے لگا۔ کیونکہ شہر میں بہت سے لوگ میدانوں سے آتے تھے اور ان کے ساتھ وہ بیر بہونیاں ہوتی تھیں۔ جن کے ساتھ غار میں رہنے کا مجھے خبط تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے شہر کے دلالوں سے راہ و رسم بڑھائی، لیکن میری بات سن کر وہ

جس دیتے۔ "تم ایک دو دن کی بات کرو۔ اکٹھا ایک ہفتہ اور وہ بھی برف کے دنوں میں اور پھر جناب اتنی دور غار میں جانے کو، کون تیار ہو گی۔"

پھر ایک دن جب میں شہر ہی میں تھا اور ابھی پہلی ہی برف پڑی تھی تو ایک دلالہ بھاگی بھاگی آئی۔

"کام بن گیا" وہ بولی، "لیکن پیسہ بہت خرچ ہوگا۔ نہ جانے کون ہے وہ، یہاں اکیلی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ برف دیکھنے آئی ہے۔ ساتھ نوکرانی ہے۔ کوئی ایسی ویسی نہیں۔ بڑے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کی نوکرانی کی جھولی بھر دو تو وہ کہتی ہے کہ میں منالوں گی اُسے۔"

اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔ روپے کی تو مجھے پرواہی نہیں تھی۔ میں نے کہا غار میں جائے گی، ہاں وہ بولی اس کی نوکرانی کہتی ہے میں لے چلوں گی۔ پر یہی دو تین دن کے لیے زیادہ نہیں تو خیر صاحب بات پکی ہو گئی اور ہم وہاں پہنچ گئے۔ غار میں پہنچ کر جب اس نے برقعہ اتارا تو میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کی بھنویں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ اور اس کے ہونٹ بے نیازی سے بھیگے ہوئے تھے۔ جیسے اسے جسم سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ جیسے وہ زمین سے نہیں آکاش سے اتری ہوئی ہو۔" وہ خاموش ہو گیا۔ چتا ذیا نوجوان منہ کھولے بیٹھا تھا۔ اچکن پوش کی آنکھیں اُبلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور مونچھوں والے کا چہرہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس پر ایک سفید لمبی داڑھی اُگ آئی ہو۔ ہوٹل کا لڑکا جو برتن اٹھانے آیا تھا، چپ چاپ دروازے کے پٹ کے ساتھ چپکا کھڑا تھا۔ جیسے کھو گیا ہو۔

"تین دن ہم وہاں اکٹھے رہے۔ تین دن۔" کھدر پوش نے بات شروع کی۔ "وہ غار نہیں رہا تھا۔ اس کی آمد کے بعد گویا وہ ایک مندر میں بدل چکا تھا۔ وہ عورت نہیں تھی۔ وہ ایک دیوی تھی اور میں ہوس کار نہیں تھا۔ وہ مجھ سے بہت قریب۔ بہت قریب۔۔۔ لیکن نہیں وہ مجھ سے قریب نہیں تھی دور۔۔۔ بہت دور۔۔۔ میں اس کے پاؤں پر سر رکھے پڑا تھا۔ میرے ہاتھ اس کی پنڈلیوں سے چھو رہے تھے۔ لیکن وہ گوشت پوست کی پنڈلیاں نہیں تھیں۔ وہ نور کی بنی ہوئی تھیں، اسی نور کی جو غار سے باہر چاروں طرف پھیلا ہوا تھا چاروں طرف اور پھر نیچے سے اُوپر تک چوٹیوں سے اُوپر۔ بادلوں سے اُوپر۔ نیلے بادلوں سے اُوپر۔ نیلے آسمان سے اُوپر۔" ایک ساعت کے لیے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔

"ان تین دنوں میں میں نے اس کے جسم کے ایک ایک نقشے پر سجدے کیے۔ اس کے بند بند پر آنکھیں ملیں۔ اس کے روبرو بیٹھ کر بھجن گائے۔ سب کچھ کیا۔ لیکن نہ جانے کیوں میری خواہشات میں ہوس کا عنصر نہیں تھا۔ ہمارے جسم گویا فنا ہو چکے تھے۔ ہماری آرزوئیں اس پھیلی ہوئی سفیدی میں گویا ڈھل چکی تھیں۔ اس لطیف فضا میں محبت اور تحیّر کے سوا کچھ نہ تھا۔ بے غرض محبت۔ بے نام تحیّر۔ لیکن آپ نہیں

جانتے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے۔" وہ بولا" آپ بھی دس ہزار فٹ سے اوپر نہیں گئے ہوں گے۔ آپ نہیں جانتے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ کیسے جان سکتے ہیں آپ" ایک ساعت کے لیے وہ خاموش ہو گیا۔

تیسرے دن جدائی کے خیال سے میری گھگھی بندھ گئی۔ میں اس کی محبت میں دیوانہ ہو چکا تھا۔ میں ہمیشہ کے لیے اسے دیوی بنا کر اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے منتیں کیں۔ ہاتھ جوڑے۔ سبھی جتن کیے۔ لیکن جواب میں وہ خاموش رہی، بالکل خاموش جیسے گونگی ہو۔

"عمر بھر کے لیے ہونا منظور نہیں" میں نے کہا" تو صرف ایک بار پھر صرف ایک بار ایک مہینہ۔ ایک ہفتہ۔ ایک دن۔"

آخر میری مسلسل منتوں کا یہ اثر ہوا کہ اس نے ایک بار پھر ملنے کا وعدہ کر لیا۔ ہم نے ایک تاریخ مقرر کر لی۔ اور پھر وہ چلی گئی۔

اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وہ ایک سال مَیں نے کیسے گزارا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ وہ مقررہ دن میرے نزدیک اتنا اہم تھا جتنا کہ قتل کے ملزم کے لیے فیصلہ کا دن ہوتا ہے میرے لیے زندگی اور موت کا سوال تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ آئے گی۔ ضرور آئے گی اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا چاہے وہ ایک دن کے لیے آئے یا ایک ہفتہ کے لیے میں اسے واپس نہیں جانے دوں گا۔ اور ہم موسم سرما وہیں گزاریں گے۔ اسی خیال کے تحت میں نے چار مہینے کی جملہ ضروریات کی چیزیں اس غار میں پہلے سے ہی پہنچا دی تھیں اور بالآخر وہاں اپنی دیوی کے انتظار میں بیٹھ گیا تھا۔"

مونچھوں والے نے ڈھیلے ہونٹوں سے کہا" پھر؟"

لیکن وہ نہ آئی۔ وہ بولا" نہ آئی حتیٰ کہ راستے مسدود ہو گئے اور مَیں نے محسوس کیا کہ میں اتنے مہینوں کے لیے اس برف خانے میں دفن کر دیا گیا ہوں۔ پہلے دو تین دن تو میں غار کے اندر اس خیالی مجسمے کے سامنے کتے کی طرح پڑا روتا رہا۔ پھر جب وہ دیوانگی دور ہوئی تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی۔ جہاں وہ پچھلے سال کھڑی ہوا کرتی تھی۔ اس کی بھنویں اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں باہر اوپر کی طرف دیکھ رہی تھیں اور وہ یوں مسکرا رہی تھی جیسے مجھے بھی باہر اوپر کی طرف دیکھنے کی ترغیب دے رہی ہو۔ میں نے پہلی مرتبہ اطمینان اور سکون سے باہر دیکھا۔ لیکن آپ، وہ بولا۔" آپ اس منظر کو ذہن میں نہیں لا سکتے۔ آپ دس ہزار فٹ کی بلندی پر اوپر نہیں گئے کبھی۔"

دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر اس نے پھر سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے کہا۔" فضا اس قدر لطیف ہوتی ہے اور عالم اس قدر نورانی ہوتا ہے جیسے صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے یہاں دودھیا سویرا پھیلا ہوتا ہے۔ اس بلندی پر جہاں صبح صادق کے دودھیا سویرے کو قیام اور دوام مل جاتا ہے۔ اس

ذودھیا سویرے میں نگاہیں ہمیشہ اوپر کو اٹھتی ہیں۔ اور انسان محسوس کرتا ہے جیسے وہ اُڑ رہا ہو۔ انسانی کثافت کا بوجھ گویا اس کی پیٹھ سے اتر گیا ہو۔ اس کی آرزوؤں میں شدت کی وہ دھار نہیں رہتی، اس کے دُکھوں اور حسرتوں میں تکلیف کا عنصر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بغض، دشمنیاں، نفرتیں سب یوں اپنی کثافت کھو بیٹھتی ہیں، جیسے مشین سے دبی ہوئی روئی کی گٹھڑی کو دھنک کر صاف کر دیا گیا ہو۔ وہاں روح سے بوجھ اتر جاتا ہے۔ وہاں کوئی ہوس کاری کا شکار نہیں ہو سکتا۔ وہاں کوئی جرم سرزد نہیں ہو سکتا۔ وہاں کوئی گناہ سے آلودہ نہیں ہو سکتا۔ جیسے یہاں صبح صادق کے وقت کوئی جرم نہیں کر سکتا۔ عیش و نشاط کی محفلیں چار بجے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ اس وقت محبوبہ کے لیے برہا کا راگ بھی گایا نہیں جا سکتا۔ صرف حمد و ثنا صرف کائناتی جذبہ ہی اس وقت قیام حاصل کر سکتا ہے۔ اس ذودھیا سویرے میں وہاں عشق جسم کے بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے اپنی انا اپنی ذات سے نکل کر کائنات کے ذرّے ذرّے پر بکھر جاتی ہے۔ وہ بلندی اور پھر وہ پاکیزہ نورانی برف، وہ چاروں طرف پھیلا ہوا نور۔ اور وہ سکوت۔ گہرا بے انتہا سکوت"۔ وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے پر گویا ذودھیا سویرا چھا گیا۔

تین مہینے کی اس نور سے بھیگی ہوئی تنہائی نے مجھے اپنی انا سے نکال کر ساری کائنات پر مسلط کر دیا۔ اس نے سلسلہ کلام از سرنو جاری کیا۔ "اور وہ وجدان جو مجھ پر طاری رہا۔ اس کی وجہ سے تین مہینے میں میری کایا پلٹ گئی۔ پھر جب میں نیچے اترا تو ایک مرتبہ پھر مجھ پر وہی جنون طاری ہوا۔ اس کا جنون۔ میں نے جگہ جگہ خاک چھانی کہ اسے ڈھونڈ نکالوں۔ لیکن بے سُود۔ وہ نہ ملی۔ اس کا پتہ بھی نہ مل سکا۔"

پھر جب موسم سرما آیا تو مجھ پر ایک نئی وحشت سوار ہو گئی۔ وہ نورانی غار مجھے اپنی طرف بلانے لگا۔ مجھے ہر وقت اسی منظر کا خیال رہنے لگا۔ وہی نور کی چادر۔ وہی اطمینان گہری خاموشی۔ یہ وحشت اس حد تک میرے سر پر سوار ہوئی کہ میں پھر موسم سرما کاٹنے وہیں جا پہنچا۔ اور اب میں ہر سال موسم سرما وہیں گزارتا ہوں۔"

"اور وہ وہ" چتا ڈیا نوجوان چلایا۔ "وہ پھر نہ ملی۔"

"وہ" کھدر پوش ہنسنے لگا "اس نورانی سویرے نے مجھے نکھار نکھار کر بذات خود دیوتا بنا دیا اور دیوی کے نقوش میرے دل سے دھو ڈالے۔ اور چھ سال میں میں نے اس راز کو پا لیا کہ عورت مرد کی راہ میں محض ایک رکاوٹ ہے۔ ایک پردہ ہے ایک ایسا پردہ ہے جسے ہٹائے بغیر ہم کہیں پہنچ نہیں سکتے۔ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ زندگی رکاوٹوں کو عبور کرنے کا نام ہے۔ آرزوؤں کا غلام بننے کا نہیں۔ میری طرف دیکھیے، وہ چلایا۔ "سردی ہو یا گرمی میں صرف اس کھدر کے کرتے میں رہتا ہوں اور یقین جانو میرے بدن میں اس قدر قوت دفاع پیدا ہو چکی ہے کہ میں سانس لیتا ہوں تو مجھے لذت محسوس ہوتی

ہے۔ایسی لذت جو عورت کے رنگین قرب سے بھی میسر نہیں ہو سکتی۔"

"لیکن وہ۔۔۔" پتلے دبلے نوجوان نے پھر اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کی کوشش کی۔

وہ مسکرایا۔"جب میں اس کے سحر سے آزاد ہو چکا تھا تو ایک روز شہر میں اتفاقاً وہ مجھے مل گئی۔اس کے ساتھ وہی نوکرانی تھی۔"

"مل گئی!" مونچھوں والے نے بیٹھے ہوئے گلے سے دہرایا۔"واقعی۔"

"ہاں"۔وہ بولا۔"اس نے مجھے پہچان لیا۔میں نے ہنس کر کہا دیوی تم پھر نہ آئیں۔اس نے جھرجھری لی اور بولی اس مندر میں دیوی کی جگہ نہیں ہے۔میں نے ازراہ شرارت کہا کہ پھر پنجاری ہی کو بلا لیا ہوتا۔وہ پھر ہنسی لیکن جلد ہی گویا کسی اثر سے بھیگ کر کہنے لگی۔اس مندر کا پجاری کسی کے بلائے سے نہیں آتا۔میں خود ابھی تک اسی مندر کی پجارن ہوں۔اس کی آنکھیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں اور ان میں اس وقت وہی دودھیا اُجالا چمک رہا تھا۔وہ خاموش ہو گیا۔پھر کچھ دیر بعد آپ ہی آپ کہنے لگا۔

"ہاں وہ میری گرو تھی۔میر لیڈر تھی۔میرا سبھی کچھ تھی۔اور جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ وفات پا گئی ہے تو میں یہاں آئے بغیر نہ رہ سکا۔لیکن،اس نے مسکرا کر کہا۔"اب کی سردیوں میں وہ وہاں ضرور آئے گی۔اب وہ پردہ نہیں رہا۔پردے سے نکل چکی ہے۔وہ یقیناً ابھی تک اسی مندر کی پنجارن ہے۔ابھی تک۔" وہ خاموش ہو گیا۔

دفعتاً ہوٹل کا لڑکا چلایا۔"بابو جی بادل چھٹ گئے ہیں اور بس آنے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔"

اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے مونچھوں والے نے اچکن پوش بزرگ کی طرف دیکھ کر کہا۔"اور صاحب آپ کا کون عزیز فوت ہوا ہے۔۔۔" اور سب کی نگاہیں اچکن پوش کی طرف اٹھ گئیں۔

وہ گھبرا گیا۔پھر اچکن جھاڑتے ہوئے کہنے لگا۔"میں تو کسی عورت کے لیے یہاں نہیں آیا میں تو تقریباً ہر روز ہی آتا ہوں۔جب سے میری بیوی فوت ہوئی ہے،روز فاتحہ کے لیے آتا ہوں۔"

"بیوی" پتلے دبلے نوجوان نے دہرایا۔

"اتنی وفادار اور خدمت گزار بیوی شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو"۔وہ بولا۔"حالانکہ میں بوڑھا تھا اور وہ نوجوان تھی۔لیکن سبحان اللہ،وہ گویا صرف میری خدمت کرنے کے لیے جیتی تھی۔"اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔"جنتی روح تھی جنتی" بھرائی ہوئی آواز میں اس نے کہا اور خاموش ہو گیا اور وہ چاروں ملحقہ قبرستان کی طرف چل پڑے۔

بادل واقعی چھٹ گئے تھے۔سورج مغرب میں تانبے کے تھال کی طرح ننگا ہوا تھا۔اس کی سنہری

شعاعوں میں بدلیاں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

''وقت بہت کم ہے'' کھدر پوش بولا۔ ''شہر کے لیے یہ آخری بس ہے۔''

پتلے دبلے نوجوان نے کہا۔ ''لیکن قبر پر دیا تو جلانا چاہیے کم از کم۔''

''ہاں۔ ہاں'' مونچھ والا بولا۔ اور وہ تینوں سفید قبر کی طرف لپکے۔ اور جب تینوں نے بیک وقت ایک ہی تربت کے طاق کی طرف ہاتھ بڑھائے تو تینوں کے سر آپس میں ٹکرا گئے۔

''ہائیں'' وہ تینوں بیک وقت چلائے اور انھوں نے ایک نئے مفہوم سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتے اچکن پوش بزرگ کی آواز سنائی دی۔ ''میاں تم کدھر آ نکلے ہو'' وہ کہہ رہا تھا'' مجھے اپنی بیوی کے مزار کا دیا تو جلا لینے دو۔''

وہ سب تعجب سے بوڑھے کی طرف دیکھنے لگے۔ پتلے دبلے اضطرابی نوجوان نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن کھدر پوش نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر زیر لب کہا'' اونہوں، دوسروں کو ننگا نہ کرو۔ ہمیں پردہ اپنی عقل سے اٹھانا ہے۔ اپنی عقل سے۔''

''کتنا رنگین پردہ ہے۔'' مونچھوں والے نے آہ بھری۔

''کتنی بڑی رکاوٹ ہے۔'' کھدر پوش نے کہا۔

اچکن پوش انہماک سے دیا جلانے میں مصروف تھا۔ اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔ سورج کی آخری شعاعوں نے بادلوں سے چھن کر فضا میں نور کی دھاریاں سی بنا دی تھیں۔ جیسے نور کا ایک مینار کھڑا ہو اور چاروں طرف ڈودھیا سویرا پھیلا تھا۔

-☆-

روغنی پُتلے

شہر کا ایلیٹ شاپنگ سنٹر۔۔۔جس کی دیواریں شلف الماریاں بلور کی بنی ہوئی ہیں جس کا بنا سجا فے کیڈ جلتے بجھتے رنگ دار سائنز سے مزین ہے۔ جس کے کاؤنٹرز مختلف رنگوں کے گلوکلرز پینٹس کی دھاریوں سے سجے ہوئے ہیں اور شلف دیدہ زیب سامان سے لدے ہوئے ہیں جس کے کاؤنٹروں پر سمارٹ متبسم لڑکیاں اور لڑکے یوں استادہ ہیں جیسے وہ بھی پلاسٹک کے پتلے ہوں! جو ان کے اردگرد یہاں وہاں سارے ہال میں جگہ جگہ رنگا رنگ لباس پہنے کھڑے ہیں۔۔۔ہاں فیشن آرکیڈ سے کون واقف نہیں۔

چاہے انہیں کچھ نہ خریدنا ہو لوگ کسی نہ کسی بہانے فیشن آرکیڈ کا پھیرا ضرور لگاتے ہیں۔ وہاں گھومتے پھرتے نظر آنا ایک حیثیت پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ پاش چیزوں اور نئے ڈیزائنوں کو دیکھنے آتے ہیں تاکہ محفلوں میں لیٹسٹ فیشن کی بات کر کے اپ ٹو ڈیٹ ہونے کا رعب جما سکیں۔ نوجوان آرکیڈ میں گھومنے پھرنے والیوں کو نگاہوں سے ٹٹولنے آتے ہیں۔ ٹھنڈے سیل گرلز سے اٹا سٹا لگانے کی کوششیں کرتے ہیں لڑکیاں اپنی نمائش کے لیے آتی ہیں۔ بوڑھے خالی آنکھیں سینکتے ہیں۔ گھاگ بیگمات گرین پوتھ کی ٹوہ میں آتی ہیں۔ وہ صرف فیشن آرکیڈ ہی نہیں رومان آرکیڈ بھی ہے کیوں نہ ہو آج محبت بھی تو فیشن ہی ہے۔

کون سی چیز ہے جو فیشن آرکیڈ مہیا نہیں کرتا۔ زربفت سے گاڑے تک۔ موسٹ ماڈرن گیجٹس سے سوئی سلائی تک۔ سی تھرو سے رنگین مالاؤں تک سب کچھ وہاں موجود ہے لوگ گھوم گھوم کر تھک جاتے ہیں تو آرکیڈ کے ریستوران میں کافی کا پیالہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔

فیشن آرکیڈ کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ فارن ڈگنیٹریز نے خرید و فروخت کرنی ہو تو انہیں خاص

انتظامات کے تحت آرکیڈ میں لایا جاتا ہے۔

آرکیڈ ہال میں جگہ جگہ رونمی پتلے طرح طرح کا لباس پہنے کھڑے ہیں چہروں پر جوانی کی سرخی جھلملا رہی ہے۔ آنکھوں میں دعوت بھری چمک ہے۔ ہونٹوں پر رضامندی بھرا تبسم کھدا ہے۔ جسم کے پیچ وخم ہر لحظہ یوں ابھرتے سمٹتے محسوس ہوتے ہیں جیسے سپردگی کے لیے بے تاب ہوں۔

اگرچہ ڈمی پتلے پلاسٹک کے جمود میں مقید ہیں مگر صناع نے انہیں ایسی کاریگری سے بنایا ہے کہ ان کے بند بند میں حرکت کی الیوژن لہریں لے رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ رواں دواں ہوں۔

سی تھرو لباس والی پتلی کو دیکھو تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ ابھی اپنی برہنہ ٹانگ اٹھا کر کہے گی۔ " ہٹے مجھے سنبھالو میں گری جا رہی ہوں۔" اور جیکٹ والا اپنی عینک اتار کر مونچھوں کو لٹکاتے ہوئے چل پڑے گا۔ " ہولڈ آن ڈارلنگ، میری گود میں گرنا۔"

آرکیڈ میں بہت سی پتلیاں پوز بنائے کھڑی ہیں۔ منی سکرٹ والی، ساڑھی والی، بیدنگ کاسٹیوم والی، میکسی والی، سی تھرو لباس والی، لٹکتے بالوں والی، پتلون والی، ننگے پاؤں والی، چوٹی، ٹوکرا بالوں والی، انگلی سے لگے بچے والی۔

ان کے ساتھ ساتھ پتلے کھڑے ہیں شکاری جیکٹ والا، دانشور، موٹر سائیکل والا، بلیک سوٹ، اچکن، بیبی، کرتے پاجامے والا، سنوڈنٹ، ڈینڈی، مصور۔

آرکیڈ ہال کے اوپر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک گیلری چلی گئی ہے جہاں نظروں سے اوجھل دکان کا کاٹھ کباڑ پڑا ہے پرانی میزیں کرسیاں شلف اور پتلے جن کا رنگ روغن اڑ چکا ہے۔

رات کا وقت ہے آرکیڈ بند ہو چکا ہے ہال میں سات آٹھ بتیاں روشن ہیں۔ شیشے کی دیواروں کی وجہ سے ہال جگمگ کر رہا ہے۔

گھڑی نے دو بجائے۔ سارے ہال میں حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پتلوں نے آنکھیں کھول دیں۔ پتلیوں کی لمبی لمبی پلکیں یوں چلنے لگیں جیسے پنکھیاں چل رہی ہوں۔

سی تھرو نے انگڑائی لی۔

منی سکرٹ نے اپنی ٹانگ اٹھائی۔

جیکٹ والے دانشور نے اپنا قلم جیب میں ٹانکا۔ عینک صاف کی اور سی تھرو کی طرف بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔

موٹر سائیکل والے نے پیچھے بیٹھی لٹکتے بالوں والی پر گلیڈ آئی چکائی لٹکتے بالوں والی سے پھینپے اڑنے لگے۔

''مائی گاڈ'' سی تھرو چلائی یہ دیکھو اس نے اپنی ٹانگ لہرائی میری ٹانگ پر نیلی رگیں اُبھر آئی ہیں کھڑے کھڑے۔

کیوں نہ ہو بلیو بلڈ ہے۔ بلیک نوٹ مسکرایا۔

دور سے ایک آواز آئی۔ ''ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلی میں'' سب کوک بکس کے پاس کھڑی پتلون والی کی طرف دیکھنے لگے۔

''تیرے ہاتھ تو خالی ہیں۔ کہاں ہے ساغر'' کرتے پاجامے والے نے پوچھا۔

''اندھے وہ تو خود ساغر ہے۔ دکھتا نہیں تجھے'' جین والا ہنسا۔

''میں تو بور ہو گئی'' منی سکرٹ نے آنکھیں گھما کر کہا۔

''کیوں مذاق کرتی ہو'' موٹر سائیکل نے گلیڈ آئی چمکائی۔

''تم تو سراپا حرکت ہو تمہاری تو بوٹی بوٹی تھرکتی ہے تم کیسے بور ہو سکتی ہو۔''

''کیوں بناتے ہو اسے اس کے جسم پر بوٹی ہی نہیں تھرکے گی کہاں سے۔'' دور کونے میں کھڑے اچکن والے نے کہا۔

''ہاں'' پہلوان نما کرتے والے نے سر اثبات میں ہلایا۔ ''وہ تو غیار کا زمانہ تھا جب بوٹی بوٹی تھرکا کرتی تھی اب تو کانٹھ ہی کانٹھ رہ گیا ہے۔''

''شٹ اپ'' جین والے نے آنکھیں دکھائیں۔ ''اپنے دقیانوسی رجعت پسندانہ خیالات سے فیشن آرکیڈ کی فضا کو متعفن نہ کرو۔''

''اے مسٹر اچکن'' اسٹوڈنٹ چلایا۔ ''ذرا آئینہ دیکھو یوں لگتے ہو۔ جیسے سارنگی پر غلاف چڑھا ہو۔''

''یہ مسٹر اچکن تو خالص ہسٹری ہے ہسٹری۔ اسے تو میوزیم میں ہونا چاہیے۔''

''این ٹیکس میوزیم میں۔'' جیکٹ والے نے قہقہہ لگایا۔

''بالکل۔ ان روایتی لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں۔''

''یہ لوگ زندگی کو کیا جانیں۔''

''ہپوکریٹس'' ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

''اگنور ہم، ہٹاؤ۔ کوئی اور بات کرو'' سی تھرو آنکھیں گھما کر بولی۔

''ہاؤ کین وی اگنور ہم۔ یہ لوگ ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں۔''

''نان سنس ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ وی آر آل فار پروگریس مومنٹ۔''

جیکٹ والا چلا کر بولا۔

''ہمر ہمر'' تالیوں سے ہال گونجنے لگا۔

''ہاہاہا'' اوپر گیلری میں کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ اس کی آواز کھرج تھی انداز والہانہ تھا تالیاں رُک گئیں۔ ہال میں خاموشی چھا گئی۔ پھر سرگوشیاں اُبھریں۔

''کون ہے یہ۔''

''کون ہنس رہا ہے۔''

''پتہ نہیں اوپر سے آواز آ رہی ہے۔''

''ہئے میں تو ڈر گئی کتنی بھورس آواز ہے۔''

قہقہہ رُک گیا۔ پھر قدموں کی آواز سنائی دی ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک۔

''کوئی چل رہا ہے اُوپر۔''

''ہئے میری تو جان نکلی جا رہی ہے۔''

''پتہ نہیں کون ہے'' منی سکرٹ بولی۔

''ڈونٹ فیر ڈارلنگ۔ آئی ایم ہیئر بائی یُور سائیڈ۔''

''وہ دیکھو وہ'' تو کرا بالوں والی نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

''اُوپر۔۔۔گیلری کے جنگلے پر'' ساڑھی والی ڈر کر بولی۔

سب کی نگاہیں اوپر جنگلے کی طرف اُٹھ گئیں۔

گیلری کی ریلنگ سے ایک بڑا سا بھیانک چہرہ جھانک رہا تھا۔

''توبہ ہے''۔ ''اُف''۔ ''ہائے''۔ چڑیوں نے شور مچا دیا۔

''کون ہے تو''۔ موٹر سائیکل والا اپنا سائیلنسر نکال کر غرایا۔

''میں وہ ہوں جو ایک روز مشہدی لنگی باندھے وہاں کھڑا تھا جہاں آج تو کھڑا ہے۔''

''اس کی آواز اتنی بھدی کیوں ہے'' سی تھرو نے سینہ سنبھالا۔

''کہاں سے بول رہا ہے یہ'' پتلون والی نے پوچھا۔

''میں وہاں سے بول رہا ہوں جہاں بہت جلد تم چپکلی جانے والی ہو۔'' لنگی والا کہنے لگا۔

چڑیوں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ان کے منہ سے چیخیں سی نکلیں۔ ''نو نو۔ نو نو'' نیور، مائی گاڈ ہئے اللہ''۔ وہ سب سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔

''ڈونٹ مائنڈ ہم ڈارلنگ'' جین والا بولا۔ ''یہ تو بنا ہوا مہرہ ہے۔ بنے ہوئے مہرے سے کیا

ڈرنا۔''

''ویئس اٹ، ویئس اٹ دے بی لونگ ٹو دی پاسٹ۔''

''یہ اب بھی ماضی میں رہتے ہیں اور ہم کو ماضی کی طرف گھسیٹنا چاہتے ہیں''۔ جیکٹ والا حقارت سے بولا۔

''بڑے میاں سلام'' جیکٹ والے نے ماتھے پر ہاتھ مار کر طنزیہ سلام کیا۔ ''ماضی پرستی کا دور ختم ہوا۔ حضرت اب جدیدیت کا زمانہ ہے۔

گیلری میں اوندھا پڑا ہوا رومی ٹوپی والا لنگڑا سوٹی پکڑ کر اٹھ بیٹھا۔ ''احمق ہیں یہ جدیدیت کے دیوانے اتنا بھی نہیں جانتے کہ اس دنیا میں نہ قدیم ہے نہ جدید جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا۔''

''یہ ظاہر کے دیوانے کیا سمجھیں گے۔'' مشہدی لنگی والے نے قہقہہ لگایا۔ ''کہ دور ایک گھومتا ہوا چکر ہے۔ جو آج اوپر ہے کل نیچے چلا جائے گا۔ جو آج نیچے ہے کل اوپر آ جائے گا۔''

جین والے نے اپنی پتلون جھاڑی۔ ''ان کباڑ خانے والوں کی باتیں نہ سنو یہ بے چارے کیا جانیں جدیدیت کو۔''

''جدیدیت کے دیوانے آج تیری پتلون کے پائنچے کھلے ہیں کل تنگ ہو جائیں گے پرسوں پھر کھل جائیں گے یہی ہے نا تیری جدیدیت۔'' رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔

''ذرا اس کی جین کی طرف دیکھو''۔ لنگی والا بولا۔ ''نیلی پتلون پر سرخ ٹکی لگی ہوئی ہے ہاہا۔ ہاہا'' وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

''احمق یہ ٹکی نہیں۔ پیچ ہے پیچ۔ پیچ فیشن ہے۔ پیچ لگی جین کی قیمت عام پتلون سے دگنی ہوتی ہے تجھے کچھ پتہ بھی ہو۔''

''پیوند کبھی غربت کا نشان تھا۔ پیوند لگے کپڑوں والے سے لوگ یوں گھن کھاتے تھے جیسے کوڑھی ہو۔ آج تم اس پیوند کی نمائش پر فخر محسوس کر رہے ہو۔'' مشہدی لنگی والا ہنسنے لگا۔ ''تم عجب تماشہ ہو۔''

رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔ ''دور جدید کے تخیل کا فقدان ملاحظہ ہو پیوند کو فیشن بنا بیٹھے ہیں۔ ہی ہی ہی ہی۔''

''سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے۔'' بین نے سر اٹھا کر کہا۔

''ہائیں یہ کیا کہہ رہی ہے۔'' پتلون والی نے پوچھا۔

''تو'' سی تھرو زیر لب گنگنائی۔ ''چھلنی بھی بولی۔''

''ہاں'' ہپی نے سینے پر ہاتھ مارا۔'' سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے۔''

''تعفن کا کریڈٹ غلاظت کا کریڈٹ اور کونسا۔'' بیڈنگ کا سٹیوم والی بولی۔

سازھی والی نے ناک چڑھائی۔

ہپی نے قہقہہ لگایا۔'' جدیدیت کے ذہنی تعفن کو دور کرنے کا کریڈٹ۔ جدیدیت کے بت توڑنے کا کریڈٹ۔ چھوٹی قدروں کو پاؤں تلے روندنے کے لیے ہمیں غلاظت کو اپنانا پڑا۔''

سپورٹس گرل نے بیڈمنٹن ریکٹ کو گھما کر دانت نکالے۔

''ڈینٹل کریم کا اشتہار کسے دکھا رہی ہو۔'' ہپی ہنسا۔ ہم نے دور حاضرہ کے سب سے بڑے بت دولت کو پاش پاش کر دیا۔ ہم نے چھوٹے رکھ رکھاؤ کا بت ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ہم نے ماڈرن ایج کے واحد دل بہلاوے سمال کمفرٹس کی نفی کر دی ہم نے مغربی تہذیب کا جنازہ نکال دیا۔

''یہ بے چارے کیا جانیں''۔ ہپن بولی۔'' ظاہریت کے متوالے۔ جب کوئی تہذیب متعفن ہو جاتی ہے تو اسے مسمار کرنے کے لیے مجاہد بھیج دیے جاتے ہیں ہم وہ مجاہد ہیں۔''

''تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔'' رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔

''بالکل درست'' لنگی والا چلایا۔'' یہ ٹرانزیشنل دور ہے۔ جب ایک شو ختم ہو جاتا ہے تو دوسرے شو کے واسطے ہال صاف کرنے کے لیے جمعدار آ جاتے ہیں۔ یہ دور جمعداروں کا دور ہے۔''

''سلی فول'' سی تھرو قمیص۔'' یہ تو رومانس کا دور ہے۔''

''رومانس'' گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک مجنوں صفت دیوانہ لپک کر ریلنگ پر آ کھڑا ہوا۔'' تم کیا جانو، رومان کیا ہوتا ہے۔۔۔ تمہارے دور نے تو عشق کا گلا گھونٹ دیا۔ عاشق کو غنڈہ بنا کر رکھ دیا۔ محبوب سے محبوبیت چھین کر اسے رنڈی بنا دیا۔ عریانی کو رومان نہیں کہتے بی بی۔''

''پالنڈرو نیش۔''

''نانسنس۔''

رومی ٹوپی نے ایک لمبی آہ بھری۔'' دوستو ہمارے زمانے میں عورت کا نقاب سرک جاتا تھا۔ تو گال دیکھ کر مرد میں تحریک پیدا ہوتی تھی۔ لیکن اب ننگے پنڈوں کی یلغار نے مردانہ حس کو کند کر دیا ہے۔ تمہارے دور نے مرد کو نامرد اور عورت کو بانجھ کر کے رکھ دیا ہے۔''

جیکٹ والا آگے بڑھا۔ اس نے قلم جیب میں ڈالا عینک اتاری۔'' ہم جنس کے متوالے نہیں، ہم جنس کی لذت کی دلدل میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں۔ دور حاضر میں سب سے اہم ترین مسئلہ اقتصادیت کا ہے۔ تم حالات حاضرہ سے چشم پوشی کرتے ہو۔ ہم تمہاری طرح حالات حاضرہ سے آنکھیں نہیں

چراتے۔ہم ترقی پسند لوگ ہیں۔''

''حالات حاضرہ''۔ رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔تمہارے نزدیک حالات حاضرہ روٹی کپڑا اور مکان ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ اَنا کا ہے۔سلف کا۔''میں'' کا۔

''روٹی کپڑے والو ہماری طرف دیکھو۔''چمن چلائی۔''جو ملتا ہے کھا لیتے ہیں جہاں بیٹھ جاتے ہیں وہی ٹھکانہ بن جاتا ہے۔ جو میسر آتا ہے پہن لیتے ہیں۔کہاں ہیں وہ مسئلے جنہیں تم اہرام مصر بنائے بیٹھے ہو۔''

''اُوں ہُوں انہیں کچھ نہ کہو یہ تو فارن خیالات کی ایڈ کے بل بوتے پر کھڑے ہیں انہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔''رومی ٹوپی والا بولا۔

''کل جب روٹی کپڑا اور مکان کا مسئلہ حل ہو جائے گا پھر تمہارے ہاتھ پلے کیا رہ جائے گا بتاؤ۔'' چمن بولی۔

''یہ تو حرکت کے متوالے ہیں،منزل کے نہیں۔ انہیں صرف چلنے کا شوق ہے،پہنچنے کا نہیں۔'' مشہدی لنگی والے نے منہ بنایا۔

''بکو نہیں۔ ہمارے راستے میں جو شخص روڑے اٹکائے گا اس پر رجعت پسندی کا لیبل لگا دیا جائے گا۔''

ہپی قہقہہ مار کر ہنسا''سو وات،ہم ہپیوں پر رجعت پسندی کا لیبل لگا دو بے شک لگا دو۔ہم نے کیپٹل ازم کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ہم نے اقتدار پسندی کا تمسخر اڑایا ہے ہم میں اور ان گوریلوں میں کیا فرق ہے جو سرمایہ داری کے خلاف جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔''

''صرف یہی کہ طریق کار مختلف ہے''۔چمن نے لقمہ دیا۔

ہال پر سناٹا چھا گیا۔

سی تھرو اپنے جسم کے پیچ وخم کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساڑھی اپنا پلو سنبھال رہی تھی۔ لٹکے بالوں والی منہ میں انگلی ڈالے کھڑی تھی۔ پتلون والی کا چہرہ حقارت سے چقندر بنا ہوا تھا۔ جیکٹ والا سر کھجاتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔''کتابوں میں تو یہ بات کہیں نظر سے نہیں گزری۔''

مجنوں نما نے قہقہہ لگایا۔''خود کو زندگی کے متوالے گرداننے والے کتابوں کی بیساکھیوں کے سہارے کے بغیر چل نہیں سکتے۔زندگی کتابوں سے اخذ نہیں کی جاتی مسٹر زندگی حال ہے کسی صاحب حال سے پوچھو۔''

''جو قیل وقال کے دیوانے ہیں انہیں حال کا کیا پتہ۔''لنگی والا بولا۔''انہیں اتنا نہیں پتہ کہ حال

پر قیل وقال نہیں ہو سکتا۔ حال کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ حال سب سے بڑی حقیقت ہے۔"
ہال پر خاموشی چھا گئی۔
پھر دور سے ایک سرگوشی اُبھری۔۔۔"میں کہاں آ پھنسی ہوں"۔۔۔ بچے کو انگلی لگائے کھڑی ماں گنگنا رہی تھی۔" یہ دور ماں کا دور نہیں۔ یہ تو عورت کا دور ہے۔ میں کہاں آ پھنسی ہوں۔"
"عورت کا نہیں بی بی۔" پہلوان کرتے والے نے سر ہلا کر کہا۔" یہ تو لڑکی کا دور ہے انہیں کیا پتہ کہ عورت کسے کہتے ہیں۔ بال سفید ہو جاتے ہیں پھر بھی یہ لڑکیاں ہی بنی رہتی ہیں۔"
"خاموش" آرکیڈ کی فرنٹ رو میں کھڑی ٹوکرا بالوں والی بولی "سنو، سنو یہ کیسی آواز ہے۔"
"کون سی آواز؟"
"کدھر ہے آواز۔"
"چپ۔" ٹوکرا بالوں والی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔
سب کان لگا کر سننے لگے۔
"ارے" موٹر سائیکل والا چلایا۔" یہ تو ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی ہے۔"
"یہ آواز تو باہر سے آ رہی ہے۔" منی سکرٹ والی نے کہا۔
جیکٹ والے نے عینک صاف کی اور باہر دیکھنے لگا۔
"ہئے اللہ" سی تھرو بولی۔" یہ آواز تو ایمر جنسی فون بوتھ سے آ رہی ہے۔ وہ جو باہر پورٹیکو میں ہے۔"
"خاموش" شکاری ڈانٹ کر بولا" سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاؤ۔۔۔ وہ آ رہا ہے۔"
"کون آ رہا ہے" سی تھرو نے زیر لب پوچھا۔
"چوکیدار۔"
"چوکیدار" پتلیاں سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔ پتلے باہر جھانکنے لگے۔
سامنے ایک اونچا لمبا جہلمی جوان خاکی وردی پہنے سر پر پگڑی لپیٹے ہاتھ میں سونٹا اٹھائے بوتھ کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔
"بالکل اجڈ نظر آتا ہے" پتلون والی نے حقارت سے ہونٹ نکالے۔
"گاکی، کروڈ، ان کوتھ" ٹوکرا بالوں والی دانت بھینچ کر بولی۔
"میرے بدن پر تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اسے دیکھ کر۔" سی تھرو نے کہا۔
چوکیدار نے سونٹا باہر کھڑا کیا اور خود جلدی سے بوتھ میں داخل ہو گیا۔ اس نے نیلی فون کا چونگا

اُٹھایا اور فون پر باتیں کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن بات سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چند ایک منٹ کے بعد وہ بوتھ سے باہر نکلا اور حسب معمول ہال کا چکر لگانے کے بجائے ہال کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

''ضرور کوئی ایمرجنسی ہے۔'' فنکاری نے چھائے ہوئے سکوت کو توڑا۔

گیلری میں رومی ٹوپی والا ہنسا۔ ''ایمرجنسی۔۔۔ یہ دور تو بذات خود ایک سٹیٹ آف ایمرجنسی ہے۔''

''ایک اُبال ہے۔ بے مقصد اُبال'' لنگی والے نے قہقہہ لگایا۔

منی سکرٹ والی نے لمبی لمبی پلکیں جھپکا کر اوپر دیکھا۔

''اگنور ہم مائی ڈیئر'' موٹر سائیکل والے نے سائیلنسر فٹ کر کے کہا۔

''میں کہتا ہوں ضرور یہ کسی کے انتظار میں کھڑا ہے ضرور کوئی آنے والا ہے۔''

سٹوڈنٹ زیر لب بولا۔

''چوکیدار کو دیکھ کر میری روح خشک ہو جاتی ہے۔'' سی تھرو نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

لنگی والے نے مسکرا کر پوچھا۔ ''بی بی کیا تیرے اندر روح بھی ہے، ہوتی تو تو سی تھرو نہ ہوتی۔''

''کتنی ڈراؤنی شکل ہے چوکیدار کی۔'' پتلون والی لنگی والے کے سوال کو دبانے کے لیے بولی۔

رومی ٹوپی والا ہنسنے لگا۔ ''کتنی عجیب بات ہے اپنوں کو دیکھ کر ڈر کر سہم جاتی ہیں۔ بیگانوں کو دیکھ کر ایٹ ہوم محسوس کرتی ہیں۔''

''شٹ اپ'' پتلون والی ڈانٹ کر بولی۔۔۔ ''یو۔۔۔ اَن کلچرڈ۔۔۔ اَن کوتھ۔۔۔ بیہودہ۔''

''ول سیڈ۔'' بلیک سوٹ والے نے کہا۔ ''ہیئر ہیئر۔۔۔ جنٹلمین چیئرز۔''

سارا ہال تالیوں کی آواز سے گونجنے لگا ہمارے دور میں اَن ہو یا ئزڈ۔ ان ایجوکیٹڈ۔ لوگوں کو لب ہلانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی'' جیکٹ والا منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے بولا۔

''تمہارا دور'' مجنوں نما ہنسا۔ ''نقالوں کا دور، چربے دور۔ یہ دور مغربی تہذیب کی کاپی ہے کاپی۔ بیگانوں کی طرز زندگی کی نقل کر وان کے خیال کو اپناؤ۔ اپنوں سے بلکوں سے نفرت کرو یہی نا۔''

''مغربی تہذیب مغرب میں خودکشی کر چکی ہے۔ چاند غروب ہو چکا ہے۔ اس کی آخری شعاعیں یہاں سرابی رنگ دکھا رہی ہیں۔'' ہپی مسکرایا۔ ''اور۔۔۔''

''میں کہتی ہوں'' ۔ چن نے اس کی بات کاٹی۔ ''اگر نقل ہی کرنی ہے تو کسی ایسی قوم کی کرو جس میں جان ہے زندگی ہے۔ چربہ بننا ہے تو کسی ایسی تہذیب کا ہو جو ابھر رہی ہے۔ کیوں ڈوبتے سورج کو

پو چ رہے ہو۔"
جیکٹ والے نے اپنا قلم جیب میں اٹکایا عینک کو سنبھالا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ہال کے درمیان آ کر بولا۔ "کون نہیں جانتا کہ کون سی قومیں اُبھر رہی ہیں۔"
مشہدی لنگی والا قہقہہ مار کر ہنسا۔ "ذرا اس فیشن آرکیڈ پر نظر دوڑاؤ۔ کیا یہ رنگ ان قوموں کا ہے جن کا تم حوالہ دے رہے ہو۔"
"کیا یہ منی سکرٹ، یہ تھری پی اس آئیڈیل کے مظہر ہیں جس کے تم دعویدار ہو کیا تمہارا دور جس پر تم اتنے نازاں ہو تمہارے مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے۔" رومی ٹوپی والا جوش میں بولا۔
"ابھی ہم جدوجہد کے عالم میں ہیں۔" سٹوڈنٹ نے اپنے ٹوکرا بالوں کو جھٹک کر سنوارتے ہوئے کہا۔
مجنوں نما ہنسا۔ "ذرا آئینہ دیکھو میاں کیا جدوجہد کرنے والوں کی شکلیں ایسی ہوتی ہیں جیسی تمہاری ہیں کیا ان کی قلمیں سارنگی نما ہوتی ہیں۔ کیا ان کے سروں پر بالوں کے ٹوکرے دھرے ہوتے ہیں کیا ان کی آنکھوں میں سُرے کی دھار ہوتی ہے کیا وہ ایسے بنے ٹھنے ہوتے ہیں جیسے تم ہو۔ تم نے تو لڑکیوں کو بھی مات کر دیا۔ ایمان سے۔۔۔
ہال پر خاموشی طاری ہو گئی۔
سب چپ ہو گئے رومی ٹوپی والا ہنسنے لگا۔
کسی نے رومی ٹوپی والے کو جواب نہ دیا۔
"وہ دن کب آئے گا"۔ دور سے یوں آواز سنائی دی جیسے کوئی آہیں بھر رہا ہو۔
"کون سا دن بی بی۔" کرتے پاجامے والے نے پوچھا۔
"جب مجھے ماتا کے جذبے پر شرمندگی نہ ہو گی۔" بچے کو انگلی لگائے کھڑی ماں بولی "جب اس آرکیڈ میں سر اُٹھا کر کھڑی ہو سکوں گی۔"
"سچ کہتی ہو بی بی آج کے دور میں مائیں اپنے بچوں کو اپناتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں۔" رومی ٹوپی والے نے کہا۔
"وہ ماں کہلوانا نہیں چاہتیں۔" کرتے پاجامے والا بولا۔ "بچوں سے کہتی ہیں۔ مجھے باجی کہہ کر بلاؤ۔"
"آج کی عورت، عورت بن کر جینا چاہتی ہے، ماں بن کر نہیں۔" لنگی والا بولا۔
"میں پوچھتا ہوں کیا عورت کو عورت بن کر جینے کا حق نہیں۔ تم نے اسے ماں بنا کر قربانی کا بکرا بنا

دیا تھا۔ ہم نے اسے عورت کی حیثیت سے جینے کا حق دیا ہے۔" بلیک سوٹ نے کہا۔

"تمہیں کچھ پتہ بھی ہو۔" رومی ٹوپی والا ہنس کر بولا۔ "وہ سب تہذیبیں تباہ کر دی گئیں جنہوں نے ماں تا کو رد کر دیا تھا اور عورت کو عورت بن کر جینے کا حق دیا تھا۔ اس دنیا میں صرف وہی تہذیب پنپ سکتی ہے جو بچے کو زندگی کا مقصد مانے۔"

"پاگل ہیں یہ ماضی کے دیوانے، جیکٹ والے نے عینک اتار کر صاف کی۔ اتنا نہیں جانتے کہ آج سب سے بڑا معاشی مطالبہ یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش کو روکا جائے۔"

"بالکل بالکل"۔ بلیک سوٹ والے نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"بچے کم خوشحال گھرانہ۔" موٹر سائیکل والا گنگنانے لگا۔

"سبحان اللہ۔" مشہدی لنگی والا بولا "سوشل ازم کے نام لیوا سرمایہ داروں کے حربے کا پرچار کر رہے ہیں۔"

"بھائی صاحب بچے تو غربت کی پیداوار ہیں قدرت کا اصول ہے جس گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگی بچے پیدا کرنے کی قوت کم ہو جائے گی۔ اگر غریبوں کی یہ صلاحیت ختم کر دی گئی تو تخلیق کا عمل مدہم پڑ جائے گا شاید ختم ہو جائے۔" رومی ٹوپی والے نے کہا۔

"مین پاور کی عظمت کو ماننے والے بچوں کی پیدائش کو معاشی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔" مجنوں نما قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

پتلیاں ایک دوسری سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔

"کیا کہہ رہا ہے یہ۔"

"گاڈ نوز۔"

"ہنے۔ چلڈرن ہیو نو سنس۔"

"سیانوں نے کہا تھا" کرتا پاجامے والا کہنے لگا کہ۔۔۔

"کون سیانے۔" جیکٹ والے نے پوچھا۔

"ہمارے ٹکٹے لوگ" کرتا پاجامے والے نے وضاحت کی کوشش کی۔

"تم اپنے۔ لکٹوں کی بات کر رہے ہو" لنگی والے نے اسے ٹوکا۔ انہیں سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ان کے ٹکٹے تو مغرب میں رہتے ہیں۔ یہ تو مغربی تہذیب کے دیوانے ہیں۔"

"وہ دن دور نہیں"۔ اچکن والے نے کہا۔ "جب انہیں اپنے لکٹوں کو اپنانا پڑے گا۔"

"بھول جاؤ وہ دن۔" جیکٹ والا جلال میں بولا۔ "وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔"

''ہم ترقی کی جانب قدم اُٹھا رہے ہیں۔ ہم آگے بڑھنے کے قائل ہیں۔ ہم کبھی واپس ماضی کی طرف نہیں جائیں گے۔''

موٹر سائیکل والے نے لٹکے بالوں والی کی طرف دیکھا۔''کیوں ڈارلنگ۔''

''فارگٹ دیٹ ڈے۔ اٹ ول نیور کم۔'' لٹکے بالوں والی نے بال جھٹک کر کہا۔

گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک پتلا اُٹھ بیٹھا اس نے ایک لمبا چغہ پہن رکھا تھا سر پر کُلاہ تھا۔

''کون نہیں مانتا اس دن کو۔ کیا تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ دُنیا کا نظام بدل رہا ہے۔''

''اچھا بدل رہا ہے کیا''۔ شکاری نے طنزاً کہا۔

سب پتلے ہنسنے لگے۔

''دُنیا کے سارے مذہب سارے نجومی۔ سارے سیئرز آنے والے گولڈن ایج کو مانتے ہیں۔''

چغے والا چلایا۔

عیسائی، مسلمان، یہودی، ہندو بھی مانتے ہیں۔ اسٹرالوجرز اس کی شہادت دیتے ہیں۔'' رومی ٹوپی والے نے کہا۔

''وہ گولڈن ایج۔'' چغے والے نے انگلی اٹھا کر کہا۔''جب ترقی کا رُخ مادی سہولتوں سے ہٹ کر روحانی مقاصد کی طرف مڑ جائے گا۔ جب ہماری توجہ باہر کے آدمی کی جگہ اندر کے آدمی پر مرکوز ہو جائے گی۔ جب امن ہو گا۔ اطمینان کا دور دورہ ہو گا۔''

موٹر سائیکل والے نے طنز بھرا قہقہہ مارا۔

جیکٹ والے نے چلا کر کہا۔''ضعیف الاعتقادی نہیں خوش فہمی ہے یہ۔''

''اچھا''۔ ماں بولی۔''کیسا گولڈن ایج ہو گا وہ۔''

''نشاۃ ثانیہ۔'' چغے والا چلا کر بولا۔

''نشاۃ ثانیہ۔'' ہال کی دیواریں گونجنے لگیں۔

''دُنیا پر مبارک ترین ستاروں کا اکٹھ ہو رہا ہے۔ ایسا اکٹھ جو کبھی آج تک نہیں ہوا تھا۔''

چغے والا بولا۔

''اس کے اثرات ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ ظہور میں آئیں گے۔''

نوکرا بالوں والی نے منہ میں انگلی ڈال لی''سچ۔''

ساڑھی والی نے سینہ سنبھالا۔

سی تھرو کا رنگ اُڑ گیا۔

خاموش لٹکے بالوں والی چلائی۔ ''وہ دیکھو وہ۔'' اس نے انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ سب انگلی کی سیدھ میں پورٹیکو کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا ہوا'' دور سے پونکا بکس کے قریب کھڑی پتلون والی نے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

''پتا نہیں۔''

''کون ہے؟''

دور کھڑی پتلیاں سرگوشیاں کرنے لگیں۔

موٹر سائیکل والے نے اپنا سائیلنسر فٹ کر کے کہا۔ ''وہ آ رہے ہیں، خاموش۔'' اس نے دور کھڑے پتلوں کو خبردار کیا۔ ''وہ آ رہے ہیں۔ ادھر آ رہے ہیں۔''

''ہاں ہاں'' لٹکے بالوں والی بولی۔ ''انتظامیہ کے لوگ آ رہے ہیں۔''

''بالکل''۔ ساڑھی والی نے کہا۔ ''وہ ضرور اندر آئیں گے۔''

جیکٹ والے نے اپنی عینک صاف کی۔ اسے پھر سے لگایا اور پھر تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ''سب اپنے اپنے مقام پر اپنا مخصوص پوز بنا کر کھڑے ہو جاؤ یقیناً کوئی ایمرجنسی ہے'' موٹر سائیکل والا بولا۔ ''ورنہ اس وقت ناظم کا یہاں آنا۔۔۔''

سارے پتلے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہونے کے لیے دوڑے۔

گیلری میں کھڑے پتلے کونوں میں جا کر ڈھیر ہو گئے۔

ہال پر سناٹا طاری ہو گیا۔

آرکیڈ کا صدر دروازہ کھلا۔ ناظم اندر داخل ہوا اس کے پیچھے نائب تھا۔ نائب کے پیچھے دس بارہ کاریگر تھے۔ انہوں نے پینٹ کے بڑے بڑے ڈبے اور برش اٹھائے ہوئے تھے۔

ناظم کرسی پر بیٹھ گیا۔ نائب اور کاریگر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ''دیکھو اس وقت تین بجے ہیں۔'' ناظم نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ہمارے پاس صرف چھ گھنٹے ہیں۔ حکومت کے معزز مہمان جو دنیائے اسلام کے بہت بڑے سربراہ ہیں ٹھیک ساڑھے نو بجے آرکیڈ دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔ ان کے آنے سے آدھ گھنٹہ پہلے سارا کام مکمل ہو جانا چاہیے سمجھے۔'' ناظم نے نائب سے مخاطب ہو کر کہا۔

''لیس سر'' نائب نے جواب دیا۔ ''اٹ شیل بی ڈن۔''

''ہوں۔'' ناظم نے کہا۔ ''ہمارے پرائم منسٹر صاحب کا کہنا ہے کہ معزز مہمان توقع رکھتے ہیں کہ پاکستان کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر پاکستانی رنگ میں رنگا ہو گا اور پاکستانی زندگی، دستکاری اور فن کا

مظہر ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ آرکیڈ کی ہر تفصیل پاکستانی ہو۔ سمجھے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔۔۔۔سر''۔۔۔نائب نے کہا۔

پھر وہ کاریگروں سے مخاطب ہوا۔ ''دیکھو بھئی اتنے تھوڑے وقت میں، اتنے شارٹ نوٹس پر ہم نیا سامان مہیا نہیں کر سکتے۔ اس لیے اسی سامان کو رنگ و روغن کر کے گذارہ کرنا ہوگا۔''

''جی صاحب'' کاریگروں نے جواب دیا۔

اگلے روز ساڑھے نو بجے جب معزز مہمان آرکیڈ میں داخل ہوئے تو صدر دروازے کے اوپر فیشن آرکیڈ کی جگہ پاکستان آرکیڈ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اندر دروازے کے عین سامنے اچکن والا بڑے طمطراق سے کھڑا تھا اس کے پاس ہی دائیں طرف رومی ٹوپی والا اپنا پھندنا جھلا رہا تھا۔ بائیں طرف طرّہ باز مونچھ کو تاؤ دے رہا تھا۔ قریب ہی بچے کو انگلی لگائے چادر میں لپٹی ہوئی خاتون بچے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی اس کے پرے کرتے پاجامے والا چھاتی پھلائے استادہ تھا۔

ساڑھی والی لمبا چنڈا لٹکائے نگاہیں جھکائے لجا رہی تھی۔

سی تھرو چھینٹ کا گھگھر اپنے سر پر پانی کی گاگر رکھے قدم اٹھائے کھڑی تھی۔

سکرٹ والی چست پاجامہ پہنے بازو پر جدید لمبا کوٹ اٹھائے مسکرا رہی تھی۔

۔☆۔

وہ

یہ کون آ گھسا ہے میرے گھر میں۔ دن بائے دن پوچھے۔ دن بتائے۔ کیوں۔
یہ کیسی موجودگی ہے۔ میرا سارا گھر اس سے بھرا ہوا ہے۔ وہ ہر کمرے میں بیٹھا ہے۔ سیڑھیوں میں صحن میں برآمدوں میں باورچی خانے میں۔ ہر جگہ۔ ہر وقت دن ہو یا رات صبح ہو یا شام۔ میرا گھر مجھ سے اس قدر بھرا ہوا نہیں جس قدر اس سے بھرا ہوا ہے۔

کیا مصیبت ہے۔ زندگی میں پہلی بار میں دو کیلا ہوا ہوں۔۔۔ میں جو ازلی طور پر اکیلا تھا۔
بچپن میں بھرے گھر میں اکیلا تھا۔ چلا جاتا تو کسی کو پتہ نہ چلتا کہ چلا گیا ہوں۔ آ جاتا تو کوئی محسوس نہ کرتا کہ آ گیا ہوں۔
جوانی میں اپنا اکیلا پن دور کرنے کے لیے میں نے ایک عورت سے محبت لگا لی۔ اپنا آپ چھوڑ کر خود اس کی دہلیز پر بیٹھ گیا۔ لُٹ پُٹ گیا تو پتہ چلا کہ اکیلا پن اور بھی گہرا ہو گیا ہے جرأت ہوتی تو دہلیز سے اُٹھ جاتا۔ لیکن ایک بار بیٹھ کر اُٹھ جانا۔ میری سرشت میں نہ تھا۔ نہیں ہے۔۔۔ لہٰذا اُٹھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس لیے بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا سولہ سال بیت گئے حتیٰ کہ نٹے پنے اور اکیلے رہنے کی لت پڑ گئی۔ پھر وہ اپنا گھر چھوڑ کر میرے گھر میں آ گئی۔ میری ہو گئی اور میں اپنے گھر کی دہلیز پر آ بیٹھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی بولی "اب میں تیری ہوں۔"
"ہاں" میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ کتنی خوشی کی بات ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی دیکھتی رہی۔ میں خوشی کے نشے میں چوراسے دیکھتا رہا دیکھتا رہا۔
"تو مجھے دیکھ رہا ہے" وہ بولی۔
"اور میرا کام ہی کیا ہے۔"

''میں یہاں ہوں یہاں تیرے پاس۔''
''ہاں تُو میرے سامنے ہے۔''
''لیکن تُو تو اب بھی دہلیز پر بیٹھا ہے۔''
''اور کہاں بیٹھوں؟''
''قریب آ جا۔''
''قریب آ گیا تو تُو مجھے نظر کیسے آئے گی؟''
''پتہ ہے تیری جگہ کونسی ہے؟'' اُس نے اپنی گود پھیلا دی۔
''وہی جہاں میں بیٹھا ہوں'' میں نے سر اُٹھائے بغیر کہا۔
حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔
پھر آہستہ آہستہ وہ بند ہوتی گئیں۔ بند ہوتی گئیں۔ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔۔۔ اور میں پھر سے اکیلا رہ گیا۔
پھر لوگوں نے ''زبردستی'' پکڑ کر میری شادی کر دی۔ جب میں نے پہلی بار اپنی بیوی کو دیکھا تو مجھے پتہ چل گیا کہ وہ بھی مجھ ایسی ہے۔ لُٹی پُٹی اکیلی۔
اُس نے سات سال اپنے پہلے دولہا کی انتظار میں دہلیز پر بیٹھ کر گزار دیے تھے۔
ہمارا آپس میں اَن کہا سمجھوتہ ہو گیا۔ اور ہم دونوں دو کیلے میں اکیلے اکیلے رہنے لگے۔
ہاں میں تو ازلی طور پر اکیلا ہوں۔ اب یہ کون آ گیا ہے میرے گھر میں کیوں دھرنا مار کر بیٹھ گیا ہے۔ یہاں آخر۔۔۔ وجہ۔۔۔ مطلب۔
ویسے دیکھنے میں آج بھی میں اکیلا دکھتا ہوں۔۔۔ کسی کو خبر نہیں کہ گھر میں کوئی آ گیا ہے۔ میری بیوی کو بھی پتہ نہیں۔ صرف میں جانتا ہوں کہ میں اکیلا نہیں رہا۔ وہ آ گیا ہے۔ اور میرا گھر اس سے یوں بھر گیا ہے جیسے ماں کا سارا وجود ہونے والے بچے سے بھر جاتا ہے۔
صاحبو مجھے پتہ نہیں کہ وہ کون ہے صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہے۔ کیوں۔ کس لیے اُس نے میرے اکیلے پن کی مسند کو یوں تار تار کر دیا ہے۔ مجھے علم نہیں۔ صرف دُکھ ہے۔ اپنے اکیلے پن کو کھو دینے کا دُکھ۔
زندگی میں مَیں نے ایک ہی امتیاز حاصل کیا تھا۔
زندگی گزارنے کا ایک ہی طریقہ سیکھا تھا۔
اکیلے پن نے مجھے بڑا اعزاز بخشا تھا، مقام بخشا تھا۔

مجھے بُت بنا دیا تھا۔۔۔بہت بڑا بُت۔

صاحبو۔ اکیلا پن، بہت بڑا بت گر ہے۔

زندگی بھر میں بُت بنا رہا۔

بُت کا مطالبہ ہے کہ کوئی پجاری ہو۔ نہ ملے تو وہ خود اپنا پجاری بن جاتا ہے۔ زندگی بھر میں خود کی پوجا کرتا رہا۔ اس لیے نہیں کہ جھکنا سیکھوں۔ بلکہ اس لیے کہ بُت کی شان قائم رہے لیکن جب سے وہ آیا ہے۔ بُت تڑخ رہا ہے ٹوٹ رہا ہے، ریزہ ریزہ ہوا جا رہا ہے۔ میری ساری زندگی کی کمائی میری آنکھوں کے سامنے لٹی جا رہی ہے۔

سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بے نام موجودگی نے اتنے بڑے بُت کو کیسے توڑ دیا۔ اس کے ہاتھوں میں تیشہ نہیں کلہاڑا نہیں کدال نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں اس کے انداز میں تشدد نہیں طیش نہیں غصہ نہیں پھر یہ کیسے ہوا۔

بُتوں کو توڑنے کے لیے تو غزنوی پیدا ہوتے ہیں۔ حملے کیے جاتے ہیں۔ ایک دو نہیں۔ سولہ سترہ۔ فوجیں چڑھائی کرتی ہیں تہس نہس کرتی ہیں یوں تو کبھی نہیں ہوتا کہ ایک بے نام ان جانا دو چپکے سے آئے دھرنا مار کر بیٹھ جائے اور اس کی موجودگی سے بُت خود بخود ٹوٹنے لگے۔

کبھی کبھی مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ وہی تو نہیں جس کا نام لے لے کر بچپنے میں بڑے بوڑھے مجھے ڈرایا کرتے تھے۔ جس سے ڈر ڈر کر میں جوان ہوا تھا۔ پھر جوانی میں دانشوروں سے ملا تو ہم مل کر اس کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ دراصل بچپن میں اس سے ڈر ڈر کر اب ہم اس سے انتقام لے رہے تھے۔

پھر اُدھیڑ عمر میں مَیں اس سے بے نیاز ہو گیا تھا۔۔۔ہے تو پڑا ہو۔۔۔نہیں ہے تو نہ سہی کیا فرق پڑتا ہے لیکن نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تو بہت ڈراؤنا تھا۔ اُس نے آگ کی ایک بہت بڑی بھٹی جلا رکھی تھی ہاتھ میں سونٹا تھا۔ سونٹا چلایا۔ لوگوں کو دھڑا دھڑ آگ میں ڈالتا جاتا۔ بس یہی اس کا کام تھا۔

پھر جوانی میں علم کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت اُجاگر ہوئی۔ عظمت ہی عظمت، عظمت ہی عظمت۔ ڈر اور خوف کی جگہ حیرت نے جنم لیا۔ نہیں یہ وہ بھی نہیں۔ یہ موجودگی نہ تو ڈراؤنی ہے نہ حیرت کا جذبہ طاری کرتی ہے۔ یہ تو ایسے ہے جیسے لگن اور لگاؤ سے بھیگی ہوئی اِک فضا ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے ماں کی کوکھ نے پھیل کر میرے گھر کو سمیٹ لیا ہو۔ ایک ''نگ'' ہے جو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ایک عجیب سا سکوں۔ لطافت کا ایک ٹھہراؤ۔

مجھ پر خواہ مخواہ ایک احساس محیط ہوا جا رہا ہے۔ جیسے میں نے پا لیا ہے۔ کیا پا لیا ہے۔ اُوں ہُوں

اس کا پتہ نہیں چلتا۔ بس پالیا ہے۔ جیسے سب کچھ پالیا ہے۔ میں نے کبھی اس کی آرزو نہیں کی تھی۔ اس کے لیے ڈھونڈ نہیں کی تھی۔ اسے پانے کی آرزو نہ کی تھی۔ کبھی اُسے چاہا نہ تھا کتنی عجیب بات ہے کہ ڈھونڈے بغیر پالو۔ جانے بغیر جان لو۔

پہلی مرتبہ جب میں نے اس کی موجودگی کو محسوس کیا تو میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ان دنوں میں سخت فکر مند تھا۔ بے چین تھا۔ میرے افسر نے مجھ پر دو جھوٹے کیسز بنا رکھے تھے جو بڑی سنگین نوعیت کے تھے۔ وہ اس دھوم دھمکے سے بار باران کا ذکر کیا کرتا تھا کہ مجھے خود شک پڑنے لگا تھا کہ وہ مجھ پر الزام نہیں دھر رہا بلکہ سچ بول رہا ہے۔ میں خود کو مجرم سمجھنے لگا تھا۔ مجھ پر احساسِ جرم چھائے جا رہا تھا۔

اُس روز شام کا وقت تھا بڑی اُداس شام تھی وہ۔ لیٹی پٹی۔ اس روز دفتر میں میری بہت تذلیل ہوئی تھی۔ انکوائری کمیشن نے میرے بیان کا مضحکہ اُڑایا تھا۔ وہ لوگ جو جانتے تھے کہ مجھ پر بہتان لگایا گیا ہے اُنہوں نے بھی میرے حق میں گواہی نہ دی تھی۔

دکھ فکر اور اندیشوں کی بوجھل گٹھڑی کو کندھوں پر اُٹھائے میں گھر پہنچا۔ پہنچتے ہی دھڑام سے کھاٹ پر گر پڑا۔ وہاں پڑا رہا پڑا رہا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک پڑا رہا۔۔۔ پھر دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے سر پر کوئی بوجھ نہ ہو۔۔۔ ارے وہ گٹھڑی کیا ہوئی میں اُٹھ بیٹھا۔

میرے گرد ایک عجیب سی فضا معلق تھی۔ جیسے جیسے ایک لوری ہوا میں تیر رہی تھی۔ جیسے کمرے میں ایک سپتھی کنڈیشنر لگا ہو۔ جیسے کمرے میں کوئی ہو۔ لگن اور لگاؤ سے بھیگی ہوئی موجودگی۔ یہ کون ہے۔ میرے گھر میں کون گھس آیا ہے میں نے سارے گھر کا چکر لگایا کہ شاید کوئی ہو۔ کوئی بھی نہ تھا۔ پھر بھی کوئی ضرور تھا۔ اس بے نام موجودگی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

باورچی خانے میں میری بیوی گھٹنوں میں سر دیئے پیاز چیر رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا دیکھتا رہا وہ اکیلی بیٹھی تھی۔۔ اکیلی۔۔ لق و دق تنہا۔۔ اسے دیکھ کر مجھے پتہ چل گیا کہ کوئی نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گھر کی موجودگی ایک کو متاثر کرے دوسرے کو خبر ہی نہ ہو۔

سونے سے پہلے میں پڑھنے کا عادی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ ایک تو اس لیے کہ کتاب سامنے ہو تو نیند آنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ تلخ حقائق سے بچنے کے لیے مطالعہ ایک نعمت ہے۔

ان دنوں تو مطالعہ میرے لیے از بس ضروری تھا دفتری حقائق سے فرار کا ایک ہی راستہ تھا۔ پھر بھی میں زبردستی کتاب پڑھتا تھا۔ بار بار دفتری حالات سامنے آ کھڑے ہوتے۔ مطالعے کا عمل رُک جاتا دل پر ایک ٹھیس سی لگتی پھر اندیشوں کی لہریں رینگنے لگتیں۔ سرخ ڈیڈو نے میری طرف یورش کرتے پھر

سارے جسم میں خوف کی دُھنکی بجتی۔

اُس روز پتہ نہیں کیا ہوا۔ کتاب ہاتھ میں اُٹھائے میں بیٹھا رہا۔ سوچتا رہا۔ حالانکہ عام طور پر میں سوچنے سے گریز کرتا ہوں۔ کیونکہ سوچ مجھے دل خراش وسوسوں کی طرف بہا کر لے جاتی ہے۔۔۔ پھر وہی ٹیسیں۔۔۔ وہی چیونٹے۔۔۔ وہی دھنکی۔ اس روز میں سوچ رہا تھا لیکن ذہن میں کوئی بات نہ تھی جیسے ذہن کلفتوں رنجشوں اور خوشیوں سے بے نیاز ہو چکا ہو۔ ماؤف ہو چکا ہو۔

ذہن خیالات سے خالی تھا۔ کوئی تلخی نہ تھی، ٹیس نہ تھی، چیونٹے نہ تھے، دُھنکی نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں خلا میں ٹنگا ہوا ہوں اور یہ خلا بے نام سکون سے بھرا ہوا ہے۔ مطالعہ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب کوئی خوف ہی نہ ہو تو فرار کیسا۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ ایسی خوشگوار فضا کو چھوڑ کر کون سوئے۔

اگلے روز جب نیند سے بیدار ہوا تو۔۔۔ ارے میں چونکا۔۔۔ عام طور سے جب میں جاگا کرتا ہوں تو یوں تھکا ٹوٹا ہارا ہوا اُٹھتا ہوں جیسے کوئی مار کھا کر اُٹھا ہو۔ اُس روز میری کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے گیس بھرا غبارہ ہو۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے مخول کمرے میں آ گھسے ہوں۔ چڑیاں چہک رہی تھیں اور سورج کھڑکی میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ارے یہ کیا۔۔۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ یہ کیسی صبح ہے۔ کیا میں، میں ہی ہوں یا کوئی اور ہے۔ ساتھ ہی مجھے غصہ آنے لگا۔ یہ کون ہے جو میری شخصیت کو بدل رہا ہے۔ کیوں۔

پھر کوئی ان جانا ہاتھ بڑھا اور اس نے مجھے تھپکنا شروع کر دیا۔ جیسے تھپک تھپک کر مجھے وسوسوں سے دور لے جا رہا ہو۔ سارا کمرہ اس تھپک سے بھر گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ ہاتھ ماں کا ہاتھ ہو۔ وہ مجھے تھپک رہی ہے۔ سو جانے کے لیے نہیں بلکہ جینے کے لیے۔ سارا کمرہ جینے کی لذت سے بھرا ہوا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔

پھر دفتر گیا وہاں بھی سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ تذلیل و تضحیک کی باتیں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے دور سے آ رہی ہوں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ باتیں میرے متعلق نہیں بلکہ کسی اور کے بارے میں تھیں۔ ذہن میں ایک اطمینان سا تھا۔ میری میز کے گرد ایک تبسم گھیرا ڈالے کھڑا تھا۔

آج بھی میرا سارا گھر اسی تبسم سے بھرا ہوا ہے۔ رات کو سوتا ہوں تو وہ میری چارپائی پر بیٹھا مجھے تھپک رہا ہوتا ہے۔ جاگتا ہوں تو وہ میرے سرہانے کھڑا مسکرا رہا ہوتا ہے، کام کرتا ہوں تو وہ میرے پاس بیٹھا اپنی گندول کی شعاعیں بکھیر رہا ہوتا ہے۔ باہر جاتا ہوں تو وہ مجھے دروازے پر چھوڑنے آتا ہے۔ واپس آتا ہوں تو دہلیز پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اُس نے میری ذاتی زندگی کو کیوں تہس نہس کر رکھا ہے۔ غصے میں میری کنپٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ یہ سب کیا ہے تم کون ہو۔ کیوں

ہو۔ بولو۔ جواب دو۔

اس نے زبان سے مجھے کبھی جواب نہیں دیا۔ وہ گونگا ہے۔ اس کے وجود سے شعاعیں سی نکلتی ہیں۔ ایک لطیف سی لرزش میرے بند بند سے ٹکراتی ہے۔ جسم میں ایک ٹمک ٹمک بجنے لگتی ہے۔ پھر احساسات کا ایک دھواں سا اُڑتا ہے میرے سوال کی ساری تلخی نچڑ جاتی ہے۔ مٹھاس کی اک پھوار پڑتی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے میرے سوال کا جواب مل گیا ہو۔

اُس نے کبھی میری مَیں، میں ردّوبدل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میری غلاظت پر کبھی ناک نہیں چڑھائی۔ میری کج فہمیوں اور کج رویوں کا نوٹس نہیں لیا۔ لیکن میری انا کے غلیظ گوشوں پر جب اس کی روپہلی روشنی پڑتی ہے میں ان گوشوں کو دیکھتا ہوں تو میرا دل کراہت سے بھر جاتا ہے۔ سر احساس ندامت سے جھک جاتا ہے۔

پھر میری انا کا تڑخا ہوا نت سر اُٹھاتا ہے نہیں نہیں میں ان گوشوں کو صاف نہیں کروں گا نہیں کروں گا۔ میں جیسا بھی ہُوں۔ ہُوں۔ مجھے خود پر کوئی ندامت نہیں ہے۔ میں ایسے ہی جینا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی مَیں سے پیار ہے میں اپنی مَیں کو نہیں بدلوں گا۔ کسی کو مجھے بدلنے کا حق نہیں۔

ٹھیک ہے ٹھیک ہے فضا سے ایک سرگوشی اُبھرتی ہے۔ کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔۔ اردگرد کی فضا مجھے تھپکتی ہے۔

تُو کیوں میری ہر بات مانے جا رہا ہے۔ کیوں۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ ضرور اس میں کوئی چالا کی ہے۔ جواب میں سارا کمرہ ایک بے نام لطیف تبسم سے بھر جاتا ہے۔ بے شک اس نے مجھے اپنا رکھا ہے لیکن میں۔ میں اسے کبھی نہیں اپناؤں گا۔ کیوں اپناؤں۔ کیوں کہ مجھے پتہ ہے وہ اپنی رواداری سے، ہمدردی سے، محبت سے میری مَیں کو توڑ دے گا۔ پھر میرے پلّے کیا رہ جائے گا۔

آج تک اس نے مجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ صرف ایک مطالبہ۔ وہ بھی مطالبہ نہیں چونکہ اس میں مطالبہ نہیں منت سی منت ہے۔

اُس کا کہنا ہے اپنے دُکھوں وسوسوں پریشانیوں غموں اور تکلیفوں کی گٹھڑی خود نہ اُٹھا۔ مجھے سونپ دے۔ مجھ پر بھروسہ کر۔ خود کو میرے بھروسے پر چھوڑ دے۔

جب مَیں اپنے فکروں کی گٹھڑی سر پر اُٹھائے گھر پہنچتا ہوں تو گھر کی فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے گرد چاروں طرف سے منت بھرے ہاتھ لپکتے ہیں۔ یہ گٹھڑی مجھ پر ا مجھے دے دے۔ خود نہ اُٹھا۔ فضا سرگوشیوں سے بھر جاتی ہے۔ منتوں کا اِک طوفان اُمڈ آتا ہے۔ مجھ پر بھروسہ کر۔

بُت، دیوتا اور سناٹا

تراخ۔۔۔ایک دھچکا لگا۔۔۔جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔۔۔گردوپیش کی آوازیں مدہم پڑتی گئیں۔ مدھم پڑتی گئیں۔۔۔ارے میں تیر رہا تھا۔ بے لہر سمندر میں تیر رہا تھا۔ تیرتا رہا۔ تیرتا رہا۔۔۔ایک گرداب مجھے کھینچ رہا تھا۔ نیالی سپیدی ختم ہوتی جا رہی تھی۔۔۔کالا بولا اندھیرا۔۔۔میں ایک کنوئیں میں گر رہا تھا۔ گرا جا رہا تھا۔ گرتا رہا۔ گرتا رہا۔ صدیاں بیت گئیں۔ وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں لاوقت ہو چکا تھا۔

ہوش آیا تو میں ایک وسیع نیلگوں دھندلکے میں ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ حرکت کی سکت نہ رہی۔ پھر جیسے روشنی کی ایک کرن مجھ پر پڑی۔ اس میں نمو تھی۔ زندگی تھی۔ کرن قریب آتی گئی۔ اور قریب۔ اور قریب۔ میں نے آنکھ کھولی۔ میرے روبرو ایک چہرہ تھا۔ منور چہرہ۔۔۔میں اُٹھ بیٹھا۔ پھر سے بے لہر سمندر میں تیرنے لگا۔

وہ ایک دھندلا دھندلا وسیع میدان تھا۔ سامنے ایک عظیم ہیبت ناک قلعے کے دو ڈراؤنے بُرج نظر آ رہے تھے۔ میدان میں بہت بڑا ہجوم تھا۔ یہ کون سی جگہ ہے میں نے خود سے بات کی۔ کچہری ہے۔ ایک مدہم سی آواز آئی۔

میں نے تو کسی پر مقدمہ نہیں کیا۔

کسی نے بھی نہیں کیا۔

پھر یہ سب یہاں کیوں آئے ہیں۔

یہاں آنا ہی پڑتا ہے۔

میں تو یہاں رُکنا نہیں چاہتا۔

نہیں نہیں، گٹھڑی میں اُس کے حوالے کیوں کروں۔ یہ میری گٹھڑی ہے۔ میری ساری زندگی کی کمائی ہے۔ مجھے اپنی مشکلات سے عشق ہے اپنی فکرمندیوں سے محبت ہے۔ میں بڑی محنت سے اپنے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہوں۔ بڑے شوق سے اپنے راستوں پر خاردار پودے اُگاتا ہوں تا کہ اپنی آبلہ پائی پر بیٹھ کر رو سکوں یہی میری سب سے بڑی عشرت ہے۔

یہی میری سب سے بڑی لذّت ہے۔ میں اپنے دُکھوں کی گٹھڑی کیسے اُسے تھما دوں۔

میں تو شک کا دیوانہ ہوں۔

میں کس طرح اس پر بھروسہ کرلوں۔

چاروں طرف سے میری جانب ہاتھ لپکتے ہیں۔

بلیّوں سے سارا کمرہ بھر جاتا ہے۔

کب سے یہی ہوتا آ رہا ہے۔

وہ منّتیں کر کر نہیں ہارا۔

میں دھمکیاں دے دے کر ہارتا جا رہا ہوں۔

مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے دُکھوں کی گٹھڑی اُس کے حوالے نہ کردوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اُس پر بھروسہ کر کے بیٹھ نہ جاؤں۔

صاحبو کیا وہ کبھی مجھ سے مایوس نہ ہوگا۔

-☆-

نہیں نہیں، گٹھڑی میں اُس کے حوالے کیوں کروں۔ یہ میری گٹھڑی ہے۔ میری ساری زندگی کی کمائی ہے۔ مجھے اپنی مشکلات سے عشق ہے اپنی فکرمندیوں سے محبت ہے۔ میں بڑی محنت سے اپنے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہوں۔ بڑے شوق سے اپنے راستوں پر خاردار پودے اُگاتا ہوں تاکہ اپنی آبلہ پائی پر بیٹھ کر رو سکوں یہی میری سب سے بڑی عشرت ہے۔

یہی میری سب سے بڑی لذت ہے۔ میں اپنے دُکھوں کی گٹھڑی کیسے اُسے تھمادوں۔

میں تو شک کا دیوانہ ہوں۔

میں کس طرح اس پر بھروسہ کرلوں۔

چاروں طرف سے میری جانب ہاتھ لپکتے ہیں۔

بلٹوں سے سارا کمرہ بھر جاتا ہے۔

کب سے یہی ہوتا آرہا ہے۔

وہ منتیں کر کر نہیں ہارا۔

میں دھمکیاں دے دے کر ہارتا جارہا ہوں۔

مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے دُکھوں کی گٹھڑی اُس کے حوالے نہ کردوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اُس پر بھروسہ کرکے بیٹھ نہ جاؤں۔

صاحبو کیا وہ کبھی مجھ سے مایوس نہ ہوگا۔

☆☆

نہ رکو۔ چلے جاؤ۔

کوئی پوچھے گا تو نہیں۔

اونہوں۔ کوئی نہیں پوچھے گا۔ لیکن۔۔۔

لیکن کیا۔

لیکن تمہیں اک دن آنا ہی پڑے گا۔

وہ پکڑ کر لے جائیں گے کیا؟

نہیں۔ تم از خود آؤ گے۔ اپنی مرضی سے۔

اپنی مرضی سے۔۔۔؟

ہاں۔ آ کر کہو گے میں حاضر ہوں۔ میرا حساب چکایا جائے۔

دفعتاً مزج پر لگا ہوا لاؤڈ سپیکر بولا۔ توجہ توجہ۔

سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ سناٹا چھا گیا۔

جہانگیر فرزند خاتون بیگم۔ لاؤڈ سپیکر غرایا۔

میں چونکا یہ تو میرا نام ہے۔

تم بڑے خوش قسمت ہو۔ چار ایک آوازیں آئیں۔ یہاں تو لوگ نہ جانے کب سے گوش بر آواز بیٹھے ہیں۔ کہ کب آواز پڑے۔

پھر دفعتاً منظر بدل گیا۔ میں ایک اور چوگان میں تھا جہاں چاروں طرف بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ اور ذودھیا سویرا چھایا ہوا تھا۔ وسیع و عریض میدان میں، میں اکیلا تھا۔ سامنے وہی مزج ایستادہ تھے ہیبت ناک وہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے میں سوچنے لگا۔ میں کہاں آ گیا ہوں۔ کیا یہ دوسری زندگی ہے۔

اونہوں پیچھے سے آواز آئی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے ایک روشن مدنم چہرہ تھا۔

زندگی نہ پہلی ہے نہ دوسری بلکہ ایک تسلسل ہے۔

کیا یہ دوسرا جہان نہیں میں نے پوچھا۔

نہیں وہ بولا۔ بہت سے آسمان ہیں زمینیں ہیں لیکن جہاں ایک ہی ہے۔

مجھے آواز پڑی تھی نا۔

ہاں پڑی تھی۔

لیکن یہاں کوئی پوچھتا نہیں۔۔۔کیوں؟
پوچھنے والے کی مرضی۔
یہ میدان خالی کیوں ہے؟
خالی تو نہیں۔
بڑے بڑے پتھر پڑے ہیں اور بس۔
پتھر نہیں ہیں۔
پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو وہ پتھر نہیں تھے۔نت تھے۔اتنے سارے نت۔نت ہی نت۔
نت ہی نت۔کچہری میں بتوں کا کیا کام۔کیوں۔کس لیے۔
یہاں کیوں کس لیے نہیں پوچھا جاتا۔یہ گستاخی ہے۔
میں نے مڑ کر دیکھا۔آپ ہیں کون؟
میں ٹرائل اسسٹنٹ ہوں۔
کیسا ٹرائل۔
تمہارا ٹرائل۔
میرا ٹرائل ہوگا۔کس بات کا؟
ہر بات کا۔
آپ جج ہیں کیا۔
نہیں وہ بولا میں رابطہ افسر ہوں۔
میں نے تو زندگی میں کچھ نہیں کیا۔کچھ نہیں۔کسی کا برا نہیں چاہا۔کسی کو دھوکا نہیں دیا۔کسی کا حق نہیں مارا۔۔۔
نہ کرنا عمل نہیں۔یہاں صرف عمل جانچتے ہیں۔کہ کیا کیا۔کیا یہ نہیں کہ کیا نہیں کیا۔
میں نے محبتیں ضرور کی تھیں۔چار ایک۔ان میں ناجائز بھی تھیں۔
محبت کرنا جرم نہیں۔
سچ۔لیکن ان میں ناجائز جو تھیں۔
محبت محبت ہوتی ہے۔نہ جائز ہوتی ہے نہ ناجائز۔
لیکن میری خواہشات پاکیزہ نہ تھیں۔

تم یقین سے کہہ رہے ہو۔

ہاں یہی یہاں کا قانون ہے۔

جج کہاں ہے میں نے پوچھا۔

جج تم خود ہو۔

میں؟

ہاں تم۔

میں جج بھی ہوں مجرم بھی۔

ہاں تم مجرم بھی ہو۔ گواہ بھی اور جج بھی۔

میں حیرت میں ڈوب گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔

دفعتاً میرے روبرو ایک حسین جاذب نظر متبسم چہرہ اُبھرا۔ وہ چہرہ بہت مانوس تھا۔ بے حد مانوس۔

ارے یہ تو سفینہ ہے۔

پہچان لیا تم نے رابطہ افسر بولا۔

ہاں۔۔۔ یہ میری سفینہ ہے۔ میری پہلی محبت۔ میری نوجوانی کی ویرانے میں پہلا نخلستان۔

پتہ نہیں اس وقت مجھے کیا ہوا۔ سفینہ کو دیکھ کر جیتے ہوئے جذبات پھر سے اُبھر آئے۔ جذبات کا وہی طوفان جس سے میں پچاس سال پہلے سرشار تھا میں بھول گیا کہ کہاں ہوں کس کے حضور کھڑا ہوں۔ جوش میں، میں بولے گیا، بولے گیا۔

یہ وہ سفینہ ہے جس کے ساتھ میں نے ٹوٹ کر محبت کی۔ اس کے قدموں پر اپنا سر جھکائے رکھا، جھکائے رکھا۔۔۔ ۱۶ سال۔ اس کے پاؤں پر اب بھی میرے سجدوں کے نشان موجود ہیں۔ سولہ سال میرے جسم کا انگ انگ۔ روح کا ذرہ ذرہ اس کی طرف متوجہ رہا۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے چلتے پھرتے ہر آن، ہر لمحہ میں اس پر نثار ہوتا رہا۔ میں نے اپنی ذات کو اس میں فنا کر دیا۔ یہ بت تھی اور میں بت پرست تھا۔ پجاری تھا۔ یہ چلتی تو اس کی چال میں نے نظر آتی۔ بیٹھتی تو اس کے پوز میں حُسن ہی حُسن محسوس ہوتا۔ بولتی تو چاندی کی گھنٹیاں بجتیں۔

سولہ سال میں نے اس دیوی کو مناتا کر گزار دیئے۔ میری ہر نگاہ میں آرتی کے پھول ہوتے۔ میری سوچ کا ہر زاویہ اس کی سمت لے جاتا۔

دفعتاً میں رُک گیا۔ رابطہ افسر سر جھکائے کھڑا تھا۔ سفینہ کے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔
میری محبت میں صرف ایک خامی تھی۔ میں نے کہا۔ میری محبت جائز نہ تھی۔ مجھے اس سے محبت کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ یہ کسی اور کی ہو چکی تھی۔ میں نے پہلی بار اسے اس وقت دیکھا جب یہ دلہن بن کر ہمارے محلے میں آئی تھی۔ ڈولی سے باہر نکلی تھی۔ اس کا پور پور زندگی سے منور تھا۔ محلے کی لڑکیوں میں یہ یوں تھی جیسے کیکر کے پھولوں میں چنبے کی بوٹی ہو۔ اسے دیکھ کر محلے کے نوجوانوں کے دیدے پھٹ گئے۔ اسے نگاہوں نے گھیر لیا۔ نگاہوں پر ایسی چڑھی۔ اس قدر جھلائی گئی کہ نگاہوں پر جھولنا اس کا مقدر بن گیا۔ دفعتاً مجھے ہوش آیا کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔
اس سے پوچھ لیجیے میں نے رابطہ افسر سے کہا میں جھوٹ نہیں بول رہا۔
ہاں سفینہ بولی۔ یہ سچ ہے کہ میں نگاہوں پر چڑھی۔ جھلائی گئی۔ آرزوؤں کا مرکز بنی۔ میرے اردگرد بُت پرست ہی بُت پرست تھے۔ انہوں نے مجھے بُت بنا لیا۔
واقعی اس شخص نے ٹوٹ کر محبت کی۔ سجدے بچھائے۔ اس شخص کو توجہ کی ایسی صلاحیت ملی ہے جو عورت کو پاگل کر دیتی ہے۔ رنگین توجہ۔ اَنوٹ توجہ۔ خوفناک توجہ۔ اس نے میرے اردگرد توجہ کا ایک سنہرا جال بُن دیا۔
بے شک اس نے ٹوٹ کر محبت کی لیکن اس کی محبت دینے والی محبت نہ تھی، لینے والی محبت تھی۔ خود کو معدوم کرنے والی محبت نہ تھی۔ دوسرے کو زیرِ اثر کرنے والی محبت تھی۔ اس کی محبت میں تیاگ نہ تھا۔ شوکتِ نفس تھی۔
کیا کیا کیا غصے سے میں چلایا۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔
شوکتِ نفس محبت نہیں ہوتی۔ رابطہ افسر گنگنایا۔
بولو میں جھوٹ کہتی ہوں کیا سفینہ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چلا چلا کر کہوں بالکل جھوٹ میں جواب دینے ہی والا تھا کہ مجھ میں سے وہ نکل کر میرے روبرو آ کھڑا ہوا۔ اسے دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ وہ میں ہی تھا میں خود۔
اس شخص نے بلاشبہ ٹوٹ کر محبت کی۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ لیکن اس نے سفینہ سے محبت نہیں کی۔
سفینہ وہ بولا ایک حوالہ تھی۔ ایک بہانہ تھی۔ ایک پردہ تھی دراصل اسے اپنی بھابھی سے محبت تھی۔ اس کی بھابھی حسین تھی شوخ تھی طرحدار تھی۔ جس کے گھر میں یہ پرورش پاتا رہا تھا بھابھی سے محبت کا اظہار ممنوع تھا۔ ناجائز تھا۔ یہ خود سے اس کا اعتراف نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ پھر منظر پر سفینہ آ گئی۔ اور یہ

شخص۔ فقیر کے پاؤں پڑ گیا بے خودی نیاز میں۔ بھابھی دیوی تھی۔ سفینہ نت تھی۔ اس نے خود کو دھوکا دیا۔ سفینہ کو دھوکا دیا۔ بھابھی کو دھوکا دیا۔ سولہ سال کا مسلسل دھوکا۔

جھوٹ سراسر جھوٹ میں چلایا۔ تم کون ہو۔ جو میری ہی شکل میرے ہی روپ میں میرے سامنے آ کھڑے ہوئے ہو۔

یہ گواہ ہے رابطہ افسر بولا۔ یہ تمہارے اندر کا سچ ہے۔ میں وہ ہوں۔ گواہ بولا۔ جسے تم نے ساری زندگی بولنے نہ دیا۔ اس لیے کہ سچ کا سامنا کرنے کی تم میں ہمت نہ تھی۔ تم نے خود کو رنگین فریبوں میں جتلا رکھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ رُک گیا پھر بولا۔ تم نے خود کو کبھی ایسے نہیں دیکھا جیسے کہ تم ہو بلکہ ہمیشہ ایسے دیکھا جیسے تم خود کو دیکھنا چاہتے تھے۔

لیکن لیکن میں چلایا سفینہ اور میری محبت تو رسوائے عالم تھی اور۔۔۔

ہاں سفینہ بولی ہم دونوں رسوائے عالم تھے۔ تمہاری پاگل کر دینے والی توجہ نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میرا خاوند۔ میرے بچے۔ محلے والوں کی خوشنودی۔ یہاں تک کہ خود مجھے مجھ سے چھین لیا۔

کیا تم معصوم ہو۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہ تھا میں نے غصے میں پوچھا۔

میں ایک عورت ہوں وہ بولی مجھ میں ہر بات کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہے لیکن میں محبت بھری توجہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مرد کی توجہ۔ چاہے وہ سچی ہو جھوٹی ہو۔ پردہ ہو یا دکھاوا۔ پاکیزہ ہو یا ہوس بھری اس کے زیر اثر میں یوں پگھل جاتی ہوں جیسے مکھن چولہے کی حدت میں پانی ہو جاتا ہے۔ پھر وہ رابطہ افسر سے مخاطب ہو کر بولی۔ اس شخص کے پاس خوفناک قسم کی توجہ ہے۔ جو بند بند میں اُتر جاتی ہے چیونٹوں کی طرح چڑھ جاتی ہے۔ کھا جاتی ہے۔ اس کی توجہ نے مجھے کھا لیا۔ کھوکھلا کر دیا۔

گواہ آگے بڑھ کر بولا۔ اس کے پاس توجہ کے سوا کچھ نہیں کچھ نہیں۔ توجہ کا یہ گلدان محبت کے گلدستے سے خالی ہے۔ محبت دینے کا عمل ہے۔ اس شخص میں دینے کی صلاحیت مفقود ہے۔ یہ توجہ کا جال اس لیے بچھاتا ہے کہ پھانس لے جکڑ لے۔ اپنا بنا لے۔ حکمرانی کرے۔ یہ شخص کسی کی پوجا کیا کرے گا۔ یہ خود نت ہے شوکتِ نفس نے اسے نت بنا رکھا ہے۔

گردو پیش میں حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مسلسل حرکت۔ مجھے ایسا لگا جیسے چوگان میں پڑے ہوئے بتوں نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ ان کے ہونٹ ہلے سارے چوگان میں ایک سرگوشی گونجی۔ نت نت۔ میں نے شرم سے گردن جھکا لی۔ پتہ نہیں کتنی دیر ویسے ہی بیٹھا رہا۔ پھر قدموں کی آہٹ سن کر میں نے سر اٹھایا۔ میرے روبرو سعدیہ کھڑی تھی۔ سعدیہ میری محبوبہ۔ وہی متبسم آنکھیں۔ شرارت سے ادھ کھلے ہونٹ۔ وہی شوخی۔ بے چینی۔ اضطراب۔

اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ چہرہ تمتما گیا۔ نہیں نہیں۔ وہ رابطہ افسر سے مخاطب ہو کر بولی۔ میں اس شخص کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ اس نے مجھ سے خوفناک قسم کا انتقام لیا تھا۔

نہیں نہیں میں چلایا میں نے تو تم سے محبت کی تھی۔

میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ پھر دفعتاً وہ ہٹ گیا اور میں نے دیکھا کہ تم محبت کی اوٹ میں مجھ سے انتقام لے رہے ہو۔ کتنا خوفناک انتقام تھا۔

پھر وہ رابطہ افسر سے مخاطب ہو کر بولی مجھے ایک خوبصورت اونچے لمبے شخص سے محبت تھی۔ اس کا نام جاوا تھا۔ یہ شخص جاوا کا رازدان تھا۔ جب جاوا اسے پہلی بار ہمارے سامنے لایا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا نہیں نہیں۔ ہمیں اس کالے کلوٹے ٹھگنے شخص سے کوئی سروکار نہیں لے جاؤ اسے لے جاؤ۔ لیکن جاوا کا اس کے بغیر گزارہ نہ تھا۔ اس لیے وہ اسے اپنے ساتھ لانے لگا۔ پھر اس نے اپنی باتوں کا جال بچھایا۔ اف اس کی باتیں۔ اتنی رنگین اتنی رس بھری اتنی حاضر جوابی۔ باتوں سے موہ لینے کے بعد اس نے اپنی توجہ مجھ پر مرکوز کر دی میں اس کی توجہ سے پاگل ہو گئی۔ جاوا کو بھول گئی۔ گھر والوں کو بھول گئی۔ سبھی کچھ بھول گئی۔ یہ نت بن گیا اور میں پجارن۔ پھر دفعتاً وہ سرک گیا۔ اور۔ اور میں نے دیکھا کہ محبت کے پردے میں یہ مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔ چونکہ میں نے اسے کالا کلوٹا کہہ کر رد کیا تھا۔ مجھے ایک دھچکا لگا۔ خوفناک دھچکا۔ سب اتھل پتھل ہو گیا۔۔۔ پھر وہ مجھے پاگل خانے لے گئے اور میں پاگل رہی مہینوں پاگل رہی۔ نہیں نہیں میں اس شخص کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں اسے دیکھ کر مجھ پر وہی وحشت سوار ہو جاتی ہے۔ نہیں نہیں نہیں نہیں کہتی ہوئی وہ الٹے پاؤں چلنے لگی۔

میں نے محسوس کیا جیسے تمام بتوں نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ ان کے ہونٹ ہلے اور چوگان میں وہی سرگوشی گونجی۔ نت۔ نت۔ شرمسار ہو کر میں نے سر جھکا لیا۔ جھکائے رکھا۔ جھکائے رکھا۔ پھر جو میں نے سر اٹھایا تو میرے سامنے آصفہ کھڑی تھی۔ اس کی محبت بھری نگاہیں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کے حزن وملال بھرے چہرے پر خوشی بھرا تبسم تھا۔

ہاں وہ بولی انہوں نے مجھ سے سچی محبت کی اتنی والہانہ محبت کی کہ میرے اندر شمعیں روشن ہو گئیں۔ ان کی محبت نے مجھے زندگی سے آشنا کر دیا۔ میرا تن من منور کر دیا۔ وہ رک گئی۔ جذبات کی شدت نے اس کی آواز بند کر دی۔

اگرچہ، آصفہ نے کہا حالات ہم دونوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑے ہو گئے اور ہم نہ مل سکے۔ لیکن میں نے ان کے خیال میں ساری زندگی تنہائی میں گزار دی ساری زندگی۔ پھر بھی کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں محبت کے وہ روشن لمحے جو انہوں نے مجھے عطا کیے انمول تھے۔ میں نے ساری زندگی ان

کی روشنی میں گزاری ہے۔
یہ صاحب وہ بولی بڑے عظیم ہیں۔ انہیں محبت میں خود کو دینا آتا ہے۔ میں نے ساری زندگی ان کی پوجا کی ہے۔
مجھ میں سے نکل کر گواہ پھر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ تحقیر بھرے قہقہے۔ تم کتنی معصوم ہو آصف۔
نہیں نہیں آصف چلائی۔ میں ان کے خلاف ایک لفظ نہیں سنوں گی۔
اس شخص نے جان بوجھ کر تمہیں دھوکا دیا گواہ بولا۔ اس کی محبت جھوٹ تھی فریب تھی۔
آصف نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ مت کہو، مت کہو وہ چلائی۔ اس قدر ٹوٹ کر محبت کرنے والا شخص فریبی نہیں ہو سکتا۔ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ پجاری کے سامنے دیوتا کی نندا نہ کرو۔ نہ کرو۔ میں نہیں سن سکتی۔ یہ کہتے ہوئے وہ پچھلے پیروں چلنے لگی اور چند ساعت میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔
اسے کہتے ہیں محبت گواہ بولا۔ اور تم۔۔۔ تم اس نے میری طرف دیکھا۔ یاد ہے تمہیں۔۔۔ جب تم آصف سے ملے تھے۔ اس وقت وہ عالم شباب میں تھی اور تمہاری عمر ڈھل چکی تھی۔ اس وقت تمہارے دوستوں نے تم سے کہا تھا جناب آصف پر ڈورے نہ ڈالئے بے کار ہے۔ اب تمہارے تلوں میں تیل نہیں ہے اس بات پر تم ضد میں آ گئے تھے اور اپنا مان ثابت کرنے کے لیے تم نے اپنی توجہ سے آصف کی زندگی تباہ کر دی۔ کیا اسے محبت کہتے ہیں۔ تف ہے تم پر۔
میں نے شرم سے گردن جھکا لی۔
اس وقت ایک عجیب بات عمل میں آئی۔ میرے حلق سے ایک گمبھیر آواز بلند ہوئی، پُر وقار، پُر ہیبت۔ نت۔
چوگان میں پڑے ہوئے تمام بتوں کی گردنوں میں حرکت ہوئی۔ ایک مدہم سی سرگوشی گونجی۔ بلند ہوتی گئی۔ اور بلند اور بلند حتیٰ کہ تمام گرد و پیش گونجنے لگا۔ نت نت۔ نت نت۔
میں نے محسوس کیا کہ میرا نچلا دھڑ پتھر کا بنتا جا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ پتھر اوپر کی طرف بڑھتا گیا بڑھتا گیا۔
یہ کیا ہو رہا ہے میں نے گھبرا کر رابطہ افسر سے پوچھا۔
وہ مسکرایا۔ بولا۔ تم نے خود فیصلہ سنا دیا ہے۔ تمہارے فیصلے پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس عمل کو کوئی نہیں روک سکتا۔ کوئی نہیں روک سکتا۔
مین اس وقت ایک مہیب آواز آئی جیسے بادل کڑکتا ہے۔ سرگوشی بند ہو گئی۔ سناٹا چھا گیا۔

چھائے رہا، چھائے رہا۔ صدیاں بیت گئیں۔ سارا ماحول سہا ہوا تھا۔ بے حس و حرکت تھا۔ خاموش۔ منتظر۔

پھر ایک پر ہیبت آواز آئی۔

ہم نے بندے تخلیق کیے تھے۔ لیکن وہ دیوتا بن بیٹھے۔

کیا ہمارے بندوں میں کوئی ایسا نہیں جو بندہ بن کر جیا ہو۔۔۔ بولو۔۔۔ جواب دو۔

جواب میں ایک گمبھیر سناٹا چھا گیا جو کائنات پر مسلط و محیط ہو گیا۔

۔☆۔

اَن پُورنی

پتہ نہیں:

یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی۔ لیکن کایا پلٹ جب بھی ہوتی ہے ایسے ہی ہوتی ہے کچھ پتہ نہیں دیتی کہ کیوں ہوئی، کب ہوئی۔ اس گوری کی طرح دبے پاؤں آتی ہے جو پائل کی جھنکار کو بیرن سمجھتی ہو۔

اس کایا پلٹ کے تحت آنند کمار، نہ کمار رہا، نہ آنند رہا۔ پہلے وہ کمار بھی تھا، آنند بھی۔ اس لیے کہ ریاست انگاوہ کے مہاراج کا پتر تھا۔ آنند اس لیے کہ کوئی چاہ نہ تھی جو پوری نہ ہوئی ہو۔ ادھر چاہ کی اُدھر پوری ہوئی۔ یہی آنند ہے تا کہ ہر آرزو پوری ہو جائے۔ نہ انتظار نہ محرومی نہ بے چینی۔ آنند کو پتہ ہی نہ تھا کہ ایسی آرزو بھی ہو سکتی ہے جو پوری نہ ہو۔

زندگی میں پہلی بار اس کے دل میں ایسی آرزو پیدا ہوئی تھی جس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نہ تھی یہ آرزو کوئی ایسی مشکل بھی نہ تھی پتلی، دبلی، سوئی سوئی، کھوئی کھوئی، ڈولتی چھوئی موئی خود سے دور لے جانے والی ایک گائیک تھی۔ اَن پورنی۔

ان پورنی جب سے راجدھانی میں آئی تھی اک دھوم مچی ہوئی تھی اس کا چرچا نہ تو رنگ روپ کی وجہ سے تھا نہ گائیکی کی وجہ سے۔ رنگ روپ میں کئی گانے والیاں اس سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ گائیکی میں بھی وہ ایسی جاذب نہ تھی کہ سننے والے تڑپ کر رہ جائیں۔ الٹا وہ تو سنانے کے لیے گاتی ہی نہ تھی۔ نرت لبھانے کے لیے نہ کرتی۔ اپنے قریب لانے کے لیے نہیں۔ الٹا دور لے جاتی۔ گائیکی میں تیرتی نہ تھی ڈوب جاتی تھی۔ جسے خود کی سدھ بدھ نہ رہے وہ ڈوبتے کی سدھ بدھ کیا مارے گی۔ ان سب باتوں کے باوجود ان پورنی کی دھوم مچی تھی۔

شاید بھید یہ تھا کہ ان پورنی میں لوبھ نہ تھا۔ نہ کمانے کا نہ خود کو اچھالنے کا۔ نہ آپ چھلکتی تھی نہ

دو جوں پر چھینٹے اڑاتی۔ جلتی ضرور تھی پر مدھم مدھم۔ ٹمٹماتی۔ ٹمٹماتی جیتی۔ جیون میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نمی نسیاں بھڑک کر جلنے والوں کو ماند کر دیتی ہیں۔ تشنگی کا ایسا دریا بہا دیتی ہیں کہ بڑے بڑے تیراک ڈوب جاتے ہیں۔ آنند بہت بڑا تیراک تھا۔ ڈوبنا نہیں جانتا تھا۔ جسے دھن دولت اور مرتبہ مان کے مشکیزے حاصل ہوں وہ بھلا کیوں ڈوبے۔

آنند نے ان پورنی کی دھوم سنی تو شوق چرایا کہ چلو چل کر دیکھیں جس کی اتنی دھوم ہے وہ ہے کیسی۔ یار دوستوں کی سنگت میں وہ چوبارے میں پہنچا تو اسے دیکھ کر ان پورنی کی نائیکہ کنول نینی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ تکی تکی رہ گئی ہوش آیا تو سواگت میں بچھ بچھ گئی۔ اتنی آؤ بھگت کی کہ وہ اُمیدیں رچا کے بیٹھ گیا۔ پھر ان پورنی آئی۔ ہاتھ جوڑ نمسکار کیا۔ مسکائی، لجائی اور بیٹھ گئی۔ پھر وہ سازوں کی دھن میں کھو گئی۔ بے بے وقتی کی دھن تھی۔ پتیاں پڑوں کی پلنگا وند چڑھوں گی۔

ایک وہ جسم کی ادھ کھلی تھی دوسرے آنکھ ادھ کھلی تھی۔ دیکھنے والی نہیں دیکھنے والی۔ وہ بھی آدمی اوٹ میں۔ یوں جان لو کہ سامنے ایک ٹمٹمانے والا دیا جل رہا تھا۔

ان پورنی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ پر پاس نہ تھی آدمی نہ جانے کہاں۔ گانے میں اتنا گداز جیسے واقعی پتیاں پڑی ہو۔ قربت میں اتنی دوری جیسے پلنگا وچڑھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پر ایسا ہوتا ہے جو ساری کی ساری پاس آ بیٹھتی ہیں۔ وہ صرف جسم کا جھنجھنا بجا دیتی ہیں جو پاس ہو کر بھی آدمی نہ جانے کہاں ہوتی ہیں۔ وہ وجود کی سُرتیاں چھیڑ دیتی ہیں۔ ان پورنی نے آنند کے وجود کی سُرتیاں چھیڑ دیں۔ ایک انجانا نغمہ اُبھرا جس سے وہ واقف نہ تھا۔ کیسے واقف ہوتا۔ وہ تو ایسیوں کا شیدائی تھا جو ساری کی ساری پاس آ بیٹھتی ہیں وہ سمجھتا تھا پالینا ہی دولت ہے۔ نہ پانے کی عظمت سے واقف نہ تھا۔

اس رات آنند راج بھون واپس پہنچا تو وہ اکیلا نہ تھا۔ ان جانے میں ان پوری کو ساتھ لے آیا تھا۔ خود پر بڑا برہم تھا۔ یہ مجھے کیا ہوا بکھرا بکھرا کیوں ہوا۔ اس نے وہ رات ٹہل ٹہل کر کاٹی۔

پھر کئی ایک راتیں ٹہل ٹہل کر کٹیں۔ پہلے خود سے لڑتا جھگڑتا رہا۔ نہیں نہیں کوئی بات ہے کہ چوبارے بیٹھی دو ٹکے کی چھوکری راج کمار کو الٹا پلٹا کر رکھ دے۔ لیکن خود سے کوئی کب تک لڑے گا۔ آخر ایک رات اپنے خاص نوکر سیوک ناتھ کو بلایا۔ سیوک ناتھ جا۔ ابھی جا گاڑی جوت کر ساتھ لے جا۔ موتی بازار سے ورے ورے گاڑی کھڑی کر دیجیو۔ پیدل ان پورنی کے چوبارے میں جائیو۔ نائیکہ کنول نینی سے کہیو، راج کمار، ان پورنی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔۔۔ اور دیکھیو گاڑی محل کے صدر دروازے پر نہ آئے۔ بات نہ نکلے کنول نینی کو پتہ چلا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بھاگی بھاگی ان پورنی کے

پاس گئی۔ دشمن بھاگ پتری جو تو آج کی رات جاگی جاگی کاٹے، سوئی سوئی نہ رہے تو کیا پتہ کل رانی بن جائے بچاری کنول نینی کو کیا پتہ تھا کہ جاگی نے نہیں ادھ سوئی نے جوت جگائی ہے جوانی میں کنول نینی خود کنوروی کھلی آنکھ والی تھی۔ مدھ بھری ادھ کھلی کے چمتکار سے واقف نہ تھی۔

ان پورنی راج بھون میں یوں داخل ہوئی جیسے سپنا دیکھ رہی ہو تبھی ہوئی گھبرائی ہوئی۔ ہوائیاں اڑی ہوئیں۔ اس نے اردگرد کی جانب نہ دیکھا۔ محل کی سج دھج پر دھیان نہ دیا۔ کمار کی آنکھوں میں کھبنے کی بجائے اپنی آنکھیں چرائے رکھیں۔ ہاتھ جوڑے کھڑی رہی۔ کمار بولا آؤ ان پورنی بیٹھو۔ یہ سن کر وہیں فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ کمار بھی اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔

کمار بولا ان پورنی تو نیچے کیوں بیٹھ گئی۔

بولی مہاراج میری جگہ ہے وہیں بیٹھتی نا۔ آپ کے چرنوں میں۔

ہم نے تجھے پلنگا اوپر بیٹھنے کو بلایا ہے۔

بڑی کرپا ہے مہاراج پر میں اس جوگی نہیں۔

جوگی نہیں کہ پلنگا وچڑھنے کو اپمان جانتی ہے۔ کمار نے طعنہ دیا۔

نہ مہاراج وہ بولی جد مان ہی نہیں تو اپمان کیسے ہوگا۔ پلنگا وچڑھنا تو ویشیا کا دھندہ ہے مہاراج۔

دھندہ ہے تو گھبراہٹ کیوں۔

اس دھندے جوگی نہیں مہاراج۔

کچھ کمی ہے کیا۔

پتہ نہیں مہاراج تن چڑھتا ہے۔ چت نہیں چڑھتا۔

کمار یہ سن کر ٹھٹھکا پھر بولا چت کہیں لگا ہے کیا۔

نہ مہاراج۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے ان پورنی۔

پتہ نہیں مہاراج کہ ایسے کیوں ہے۔ پر ایسے ہی ہے۔ میں نام کی ان پورنی نہیں جیو کی بھی ان پورنی ہوں اپنے آپ میں پورن نہیں ہوں۔

کیا مطلب آنند نے پوچھا۔

ادھوری ہوں مہاراج، آدھی ہوں، آدھی نہیں ہوں۔

میں نہیں سمجھا وہ گنگنایا۔

میں آپ نہیں سمجھی مہاراج آپ کو کیسے سمجھا دوں۔

وہ چپ ہو گیا۔

یوں سمجھ لیجیے مہاراج وہ گنگنائی کہ پٹھنی کے چاند اسمان ہوں آدمی ادھر ہوں آدمی پتہ نہیں کدھر ہوں۔ پلنگاہ پر وہ براجمان ہوتی ہیں مہاراج، جو پورن ماشی کے چندا کی طرح پورن ہوتی ہیں۔ ان پورنی بچاری پلنگاہ پر کیا چڑھے گی۔ چڑھی نہ چڑھی برابر۔ وہ چپ ہو گئی۔ سیس نوائے زمین جھکائے بیٹھ رہی۔

اس کی باتیں کمار کے ہردے پر چیونٹیوں کی طرح چڑھ گئیں۔ دل میں چھنس گئیں۔ اتنا پسیجا کہ جواب دینا بھول گیا۔ پتہ نہیں کس بات پر۔ لاج پر جو ان پورنی کے مکھ پر گھنا بن کر چھائی تھی، بھولپن پر یا سچ کی باس پر جو اس کے منہ سے نکلی ہوئی باتوں میں یوں رچی بچی تھی جیسے پیاز میں آنسو رچے ہوتے ہیں۔

آنند کو چپ لگ جائے تو اتنی دور لے جاتی ہے کہ واپس آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر پورن بندہ بھی ان پورن ہو جاتا ہے۔

کمار اور ان پورنی دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ بیٹھے رہے۔ سیوک ناتھ نے کئی بار باہر سے جھانکا۔ بچارہ حیران۔ اندر دو مٹ بیٹھے تھے۔ ایک دوجے کے پاس۔ ایک دوجے سے دور۔ بہت دور جیسے ایک دوجے کی خبر نہ ہو۔

سیوک ناتھ سمجھتا تھا کہ راج کمار جو کئی دنوں سے کھویا کھویا نظر آ رہا تھا۔ ان پورنی کے آنے پر پورا ہو جائے گا اسے اپنا کھویا آدھا پھر سے مل جائے گا۔

پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا تھا۔ راج کمار پر بے چینی کے بادل چھائے تھے۔ پھر کوئی چتر نئی آئی پلنگاہ چڑھی۔ پھلجھڑیاں چلیں، ہوائیاں چھوٹیں، رنگدار چکر گھومے جھولے پھر سارا کمرہ جگمگ جگمگ ہو گیا تھا۔ پر آج یہ کیا ہو رہا ہے۔ دونوں ہی مت بیٹھے ہیں ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ جدو تو ژی پجاری نہ ہو بت بت کیسے بنے۔ پھر دو بت کیسے بن گئے۔ بھگوان تیری لیلا تو ہی جانے۔

جب آنند کمار واپس اپنے آپ میں آیا تو وہ نہ رہا تھا جو چپ ساگر میں ڈوبنے سے پہلے تھا اور اس کی نظر میں ان پورنی، وہ ان پورنی نہ رہی تھی جو پلنگاہ چڑھانے کو لائی گئی تھی۔ ان پورنی آنند بولا۔ سبھی سبھی کیوں بیٹھی ہے۔ چنتا نہ کر جو تو چاہے گی وہی ہوگا۔

ان پورنی چاہے ادھوری تھی پر استری تھی۔ اس نے دیکھا کہ مائع اتر گئی ہے نظر ڈھل گئی ہے۔ آواز نچلے سروں پر گر گئی ہے۔ لے بلمپت ہو گئی ہے۔ سر میں کامنا کی جگہ براہ کی مینڈھ لگ گئی ہے۔

ان پورنی وہ بولا جو میں تجھے اپنا بنانا چاہوں تو۔۔۔

مہاراج میں ودھوا ہوں۔

ودھوا۔ وہ چونکا۔

ویاہ ہوا تھا۔ مہاراج وہ بولی۔ پھیرے ہوئے تھے خوشی میں ٹھاہ ٹھاہ بندوقیں چلیں۔ اک گولی چوک کر پران پتی کو لگی۔ بھاگیہ کا لکھا پورا ہوا۔ میں ان پورن رہ گئی۔

اوہ۔۔۔ کمار کو ٹھیس لگی۔ پھر۔۔۔ اس نے پوچھا۔ اگرچہ اس کے حلق میں آواز نہ رہی تھی۔

پھر۔۔۔ کلموہی بنی۔ ابھاگن بنی۔ ٹس گئی گئی۔ اتنی تنہا ہوئی کہ سہار نہ سکی۔ گھر چھوڑ کر چلی آئی۔

کمار کو پھر چپ لگ گئی۔ پھر دو بت بن گئے۔ رات بیت گئی۔ بھور بھئے ہو گیا تو آنند جاگا۔ اسے جاگا دیکھ کر وہ بولی مہاراج بھور بھئے ہو گیا ہے۔ لوگ جاگن لگے۔

وہ اُٹھ بیٹھا۔ ہاں جانے سے پہلے اک بات بتاتی جا۔ جی مہاراج وہ بولی۔

جیون میں کوئی ایسی چیز ہے جس کی تجھے چاہ ہے، ڈھونڈ ہے، لگن ہے۔

ہاں مہاراج وہ بولی۔ اک سُر ہے مہاراج جس کی مجھے چاہ ہے، ڈھونڈ ہے جو مجھے اَن پُورنی سے پُورنی کر دیتی ہے۔ ٹوٹ جوڑ دیتی ہے۔ اس سُر کے کارن میں چوبارے چڑھی دھندہ اپنایا۔

سُر کیا ہوتی ہے، کہاں ہوتی ہے، کیسے حاصل ہوتی ہے۔

اس دن سے آنند کمار کو ڈھونڈ پڑ گئی۔ سُر کی ڈھونڈ۔

ڈھونڈ کتنی بڑی دین ہے جو جو جڑ کو منڈی بنا دیتی ہے جو گڑی کشتی کو چپوار دے دیتی ہے جو زندگی کو سمت بخش دیتی ہے۔

کسی نے کہا مہاراج کانتا وتی سے پوچھو۔ شہر میں وہی سُر کی رانی ہے۔

کانتا وتی ہنسی، بولی۔ راج کمار کو کس نے کہا کہ میں سُر کی رانی ہوں۔ نہ مہاراج میں تو سُر کی داسی بھی نہیں ہوں۔ میں تو جیون بھر سُر انجان رہی۔ بول کے بندھن میں پھنسی رہی۔ مہاراج چوبارے کی گائیک سُر کو کیا جانے گی۔ سننے والے تو بول کے متوالے ہیں سُر کی سار نہیں جانتے۔ وہ تو لفظ کے پجاری ہیں۔ ایسے لفظ ہوں جو تن کو چنگاری دکھا دیں۔ ہر دیئے کو پھلجھڑی بنا دیں اور خود شریر کی رنگ پچکاری میں بھیگ جائیں۔ بس یہی ان کی چاہ ہے۔ مہاراج وہ آنکھ نہیں دیکھتے اس کا مٹکنا دیکھتے ہیں۔ شیشہ نہیں دیکھتے اپنی صورت دیکھتے ہیں۔

تو پھر شہر میں کون ہے جو سُر کا پتہ دے سکے آنند کمار نے پوچھا۔

نہ مہاراج کانتا بولی۔ شہر میں نہیں۔ شہر تو مہاراج تن کا پن گھٹ ہے۔ جہاں ہر روے کی جھجھریاں بھری جاتی ہیں۔ شہر تو تن کا بیوپاری ہے۔ تن کا پجاری ہے اور سُر مہاراج وہ تو شگفت کی چیز

نہیں۔ اکیلے کی چیز ہے۔ بَن کا کوئی کھنڈ ہو۔ پہاڑ کی کوئی کھوہ ہو۔ ویرانے میں کوئی مندر ہو وہاں کوئی
سُر کا پجاری مل جائے تو دھن بھاگ۔

کانتا سے ملنے کے بعد آنند کی سُر لگن اور بڑھ گئی۔

اتفاق سے سوامی بھیشن چندر شہر آ گئے۔ ان سے جا ملا۔ سوامی بولے پتر یہ تو کس جھنجھٹ میں پڑ
گیا۔ سُر کا تو کوئی انت نہیں یہ ساری رام لیلا جو ہے یہ سُر کا ہی چمتکار تو ہے۔ کرشن مہاراج بانسری بجا
رہے ہیں اور ہمارے سامنے یہ تماشا ہو رہا ہے۔ سُر کی رچنا جاننا چاہتے ہو پتر تو گوالکا پربت پر تلسی
مہاراج کے مندروا جاؤ اگر تمہارے من کا کان بند نہیں تو سارا بھید کھل جائے گا۔

آنند کمار سوچتا رہا پھر اس نے فیصلہ کر لیا۔ پھر وہ مہاراج سے جا ملا۔ بولا پتا جی مہاراج میں یاترا
جانا چاہتا ہوں آگیا دیجیے۔

یاترا۔ کیسی یاترا مہاراج نے پوچھا۔

مہاراج میں گوالکا پربت پر تلسی مہاراج کے مندروا کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔

مہاراج کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی۔ اتنا دے راج کمار کو تلسی مہاراج کی لگن کیسے لگ گئی۔ اچھا وہ
بولے۔ ہم وچار کر کے بتائیں گے۔

راج کمار کے یاترا جانے کی بات سارے محل میں گونجی۔ باتیں ہوئی۔ ہاتھ چلے سینے تھام لیے
گئے۔ انگلیاں ہونٹوں پر رکھی گئیں۔ راج رانی نے کہا۔ مہاراج ضرور اس میں کوئی بھید ہے۔ کمار کے
بھیدی نوکر کو بلایا گیا۔ بھید کھلنے کے بجائے اور الجھ گیا۔ سیوک ناتھ بولا مہاراج ساری شرارت اَن پُورنی
کی ہے اس نے راج کمار کو بت بنا دیا ہے۔ ان پورنی کو حاضر کیا گیا۔ وہ بولی مہاراج میں نے تو کچھ نہیں
کیا۔ مہارانی بولی۔ بس تو نے غضب کیا کہ کچھ نہ کیا۔ کچھ نہ کر کے تو نے کمار کا دل اچاٹ کر دیا۔ اب جا
کچھ کر، کوئی جتن کر، ویرانے سے ہٹ کر آبادی کی طرف دھیان لگے۔ یاترا کی لگن ٹوٹ جائے۔

اسی رات ان پورنی راج کمار کے چرنوں میں جا بیٹھی۔ آپ میرے کارن جا رہے ہیں نا راج
کمار اس نے پوچھا۔

ہاں تیرے کارن۔

تو نہ جائیے۔ میں داسی بن کر آپ کے ساتھ رہوں گی۔

مجھے داسی نہیں چاہیے۔

ان پورنی آپ کی سنگ ساتھن بن کر رہے گی۔

جاؤ لڑکی مجھے اَن پورنی چاہیے وہ پورنی جسے میں خود سُر سے پورن کروں۔ ان پورنی نے بڑے

جتن کیے پر آخر جان لیا کہ بات اس کے بس سے نکل چکی ہے۔

مہاراج کو پتہ چل گیا کہ راج کمار نہیں رُکے گا۔ روکا گیا تو ٹوٹ جائے گا۔ پھر لوٹ آنے کی صورت بھی نہ رہے گی۔ اس لیے انہوں نے آگیا دے دی۔ ساتھ چھ ایک نوکر کر دیئے انہیں تاکید کر دی کہ ساتھ ساتھ رہیں نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں۔

ان پورنی راج کمار کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو دفعتاً اس نے جانا کہ وہ تو پورن ہو گئی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ کمار راج پاٹھ چھوڑ کر نِر کی نہیں بلکہ اس کی ڈھونڈ پر نکلا ہو۔ اس خیال پر وہ بڑی خوش ہوئی کہ پورن ہو گئی۔ پر یہ خوشی شانت کرنے والی خوشی نہ تھی بلکہ بے کل کرنے والی تھی۔ سو وہ بے کل ہو گئی۔

ایک سال بیت گیا اس کی بے کلی بڑھتی گئی۔

پھر ایک دن راج کمار کے ساتھ گئے ہوئے پانچ نوکر واپس آ گئے۔ بولے مہاراج ہم نے تو کمار کا بڑا دھیان رکھا پر ایک رات راج کمار سیوک ناتھ کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ ہم سوتے ہی رہ گئے پھر ہم نے ڈھونڈ کی۔ آس پاس کو چھان مارا پر کوئی بھولا ہوتا تو گھر آتا۔

ان پورنی نے سنا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ چار ایک دن ٹھنڈی برف پڑی رہی پھر اٹھی۔ اب میں یہاں کس لیے بیٹھی ہوں۔ اب یہاں کون آئے گا۔ جس ڈھونڈ پر میں خود نہ نکلی تھی وہ بے کو اس ڈھونڈ پر لگانے کا مجھے کیا ادھیکار تھا۔ سارا دوش میرا ہے اس نے دھندے کو سمیٹا اور چل نکلی۔ جگہ جگہ گھومی مندر مندر ٹھکانہ کیا۔

میگھ مندر میں شری ہمیش چندر مل گئے۔

بولے پتری تو یہاں میگھ مندر کے ویرانے میں کیا کر رہی ہے۔

ان پورنی بولی۔ مہاراج نِر کی ڈھونڈ میں نکلی ہوں۔

نہ پتری وہ بولے۔ تو نِر کی ڈھونڈ کیسے کرے گی تُو تو صرف دکھ سے واقف ہے۔ نِر کی ڈھونڈ تو وہ کر سکے ہے جو دُکھ کے ساتھ سکھ سے بھی واقف ہو۔ جولو بھ لگن بیت چکا ہو۔ رنگ رلیاں منا چکا ہو۔ جیون کی موم بتی دونوں سروں پر جلا کر دیکھ چکا ہو۔

مہاراج۔ وہ بولی میں نے بھی تو رنگ رلیاں منائی تھیں۔ میں تو ویشیا تھی۔ پالنگاہ چڑھتی رہی۔

اُوں ہُوں وہ مسکائے ویشیا خالی تن کی نہیں ہوتی۔ تن من دونوں کی ہوتی ہے۔ تیرا چت تو نِت میں نہیں ہے۔ تو کیسے ویشیا بنتی۔ نہ نہ پتری پہلے اپنے آپ کو جانو پھر ڈھونڈ پر نکلو اور پھر اپنا آپ تیاگ کر سب کچھ پالو۔ یہی ڈھونڈ کا بھید ہے اور پتری تو استری ہے۔ استری نِر کی ڈھونڈ پر نہیں نکلتی۔ نِر والے کی

ڈھونڈ پر نکلتی ہے۔ ان پورنی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گردن لٹک گئی۔ یہ دیکھ کر سوامی بولے تو ریاست انگاؤ کی ہے کیا۔ ہاں مہاراج پورنی گنگنائی۔ وہ بولے تو نے ہی راج کمار کو نر کی ڈھونڈ پر لگایا تھا۔ وہ چپ ہوگئی۔ وہ مسکائے بولے جا پتری اس کی ڈھونڈ کر جس کی ڈھونڈ پر نکلی ہے۔ خود کو دھوکا نہ دے۔ خود ساتھ نہ دے تو ڈھونڈ کبھی پورن نہیں ہوتی۔

اس رات ان پورنی سوچوں میں پڑی رہی۔ رو رو کر بے حال ہوگئی۔ بے بھگوان میں کیا کروں۔ کس کی ڈھونڈ کروں۔

پھر وہ مندر مندر پھری۔ دیوی دیوتا کے چرنوں میں بیٹھ کر روئی۔ ہا ہا کار کی، بے دیوتا مجھے بھگوان کی ڈھونڈ دے دو۔ نہ نر رہے نہ نر والا رہے۔ نہ بانس رہے نہ بانسری۔ لیکن بیس تو اکر جب وہ سر اٹھاتی تو دیوتا کے جسم پر آنند کمار کا مکھ سجا ہوتا۔

وہ جگہ جگہ پھری۔ استھان استھان گھومی۔

بھگوان کی لگن کے لیے بھجنوں کے بہانے روئی چیخی لیکن ہر دیوی دیوتا کے بت پر آنند کمار کا مکھ اگا رہا۔

آخر وہ ہار گئی۔ ڈھونڈ چھوڑ مادھوری کے ویران مندر میں اک کوٹھڑی میں پڑ رہی۔

بے بھگوان جو تو چاہے دے، نہ چاہے نہ دے پر میرے راستے کا پتھر تو ہٹا دے پاؤں کی بیڑی تو کاٹ دے۔ ایک روز مادھوری مندر کی بوڑھی پجارن دوڑی دوڑی آئی۔ بولی پتری دو سوامی آ رہے ہیں۔ تو دو بڑی کوٹھڑیاں صاف کر دے وہ کچھ دناں یہاں ٹکیں گے۔

کون آ رہے ہیں پجارن۔ ان پورنی نے پوچھا۔

ایک تو سوامی آنند کمار ہیں جو اوپر تھسی مہاراج سے آئے ہیں۔ یہ سن کر ان پورنی کا دل دھک سے رہ گیا با جو کا تپا مہاڑ و گر گیا۔

پجارن نے دیکھا۔ بے بھگوان۔ ہر دے میں اتنی بھیڑ۔ وہ دیکھ نہ سکی۔ منہ پھیر لیا۔ ان دیکھا کر دیا۔ بات جاری رکھی تا کہ دکھسن کا بھید نہ کھلے۔ بولی دو بے سوامی بھیش چندر ہیں پیچھے نارائن گھر سے پدھاریں گے۔

جب سوامی آنند کمار پہنچے تو مندر کی ساری پجارنوں نے باہر نکل کر ان کا سواگت کیا۔ لیکن ان پورنی اپنی کوٹھڑی سے نہ نکلی۔ وہ کواڑ کی درز سے دیکھتی رہی۔۔۔ ہاں، وہی۔ وہی ناک نقش، وہی روپ سروپ لیکن جیسے ہوا بدلی بدلی ہو۔۔۔ ان کے پیچھے پیچھے وہی ان کا نوکر سیوک ناتھ تھا۔

جب شام پڑی تو وہ سیوک ناتھ کے پاس گئی ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ سیوک ناتھ نے پرنام کا جواب دیا۔ بولی تو نے مجھے پہچانا۔۔۔ میں ان پورنی ہوں۔ مجھے سوامی سے ملا دے۔

سیوک ناتھ بولا۔ ان پورنی کوئی اور مانگ۔ مانگ یہ مانگ میرے بس کی نہیں۔ سوامی راہ چلتے مل لیں ویسے کسی سے نہیں ملتے۔

تُو اِک بار کہہ کر تو دیکھ کہ ان پورنی آئی ہے۔

جرور کہوں گا۔ وہ بولا۔

سیوک ناتھ نے ایک بار کہا دو بار کہا تین بار کہا پر کچھ نہ ہوا۔

کچھ نہیں ہوا۔ ان پورنی نے پوچھا۔

اُوں ہُوں سیوک ناتھ نے سر ہلا دیا۔

سوامی جی نے سنا نہیں وہ بولی۔ ٹھہر میں اپنا نام پتر پر موٹا موٹا لکھ کر لاتی ہوں۔ تو سوامی جی کے ہاتھ میں پتر تھما دیجیو۔ سیوک ناتھ پتر اندر لے گیا۔ باہر نکلا تو ان پورنی نے پوچھا۔ کیوں کچھ ہوا۔

ہاں ہوا۔ وہ بولا۔ ان پورنی کا لکھا کھل گیا۔ سیوک بولا۔ سوامی جی نے پتر کو دیکھا۔ بولے کون ان پورنی۔

ان پورنی سن کر وہیں گھاس پر ڈھیر ہو گئی۔

اگلے روز وہ پھر سیوک ناتھ کے پاس آئی۔ بولی بس ایک بار اور سیوک ناتھ ایک بار۔

آخری بار سوامی سے جا کر کہو۔ وہ ان پورنی جسے تم نے چلتے سے کہا تھا۔ ان پورنی میں تجھے آپ سُر سے پورن کروں گا۔

ان پورنی نے بات پوری کر کے سر اٹھایا تو دیکھا کہ سیوک ناتھ کے پیچھے سوامی ہمیش چندر کھڑے مسکا رہے ہیں۔ سوامی بولے۔ ان پورنی اب بیکار ہے پتری۔ اب تیرے لیے وہاں کچھ نہیں دھرا۔ پہلے وہ پورن تھا۔ پر تو نے اسے سُر کی ڈھونڈ دے دی۔ وہ تیری خاطر سُر ڈھونڈتا رہا۔ جو سُر پانے سے پہلے تو اسے اپنا لیتی تو اپنا لیتی۔ پرنتو اس نے سُر کا بھید پا لیا اور سُر نے اسے ان پورن کر کے بھگوان کی ڈھونڈ پر لگا دیا۔ اب وہ تیری خاطر نہیں اپنی خاطر ڈھونڈ میں لگا ہے اب وہ کیا جانے کہ ان پورنی کون ہے۔

ان پورنی کی چیخ نکل گئی۔

مندر کی پجارن باہر نکل آئی۔ کیا ہوا۔ یہ آواج کیسی تھی۔

کچھ نہیں سوامی ہمیش بولے اس پتری کے راستے کا پتھر ہٹ گیا۔ اسے رستہ مل گیا۔ یہ جا رہی ہے پجارن اسے وداع کرو۔ لیکن پجارن نے ان پورنی کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ آنسو۔ سوامی ہمیش مسکرائے۔ بولے یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ جاؤ پتری۔ اب تم آزاد ہو۔ پاؤں کی بیڑی کٹ گئی۔ دھن بھاگ تمہارے۔

سمے کا بندھن

آپی کہا کرتی تھی: سنہرے، سمے کی بات ہوتی ہے۔ ہر سمے کا اپنا رنگ ہوتا ہے، اپنا اثر ہوتا ہے۔ اپنے سمے پہچان، سنہرے۔ اپنے سمے سے باہر نہ نکل۔ جو نکلی تو بھٹک جائے گی۔

اب سمجھ میں آئی آپی کی بات۔ جب سمجھ لیتی تو رستے سے نہ بھٹکتی، آنگنے سے نہ گرتی، سمجھ تو گئی۔ پر کتنی قیمت دینی پڑی سمجھن کی۔ آپی مجھے سنہرے کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ کہتی تھی: تیرے پنڈے کی جھال سنہری ہے۔ جب رس آئے گا تو سونا بن جائے گی، کٹھالی میں پڑے بنا۔ پھر یہ جھال کپڑوں سے نکل نکل کر جھانکے گی۔

پتا نہیں میرا نام کیا تھا۔ پتا نہیں میں کس کی تھی، کہاں سے آئی تھی۔ کوئی لایا تھا۔ بالپن ہی میں آپی کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ اسی کی گود میں پلی۔ اسی کی سُر تال بھری بیٹھک کے جھولنے میں جھول جھول کر جوان ہوئی۔ پھر سنہرا اُمڈ اُمڈ آیا۔ چھپائے نہ چھپتا تھا۔ آپی بولی: نہ دھیے، چھپا نہ۔ جو چھپائے نہ چھپے اُسے کیا چھپانا۔

کبھی کھڑکی سے جھانکتی تو آپی ٹوکتی " یہ کیا کر رہی ہے بیٹی؟ سیانے کہتے ہیں، جس کا کام اسی کو ساجھے۔ تیرا کام دیکھنا نہیں۔ دکھنا ہے۔ تو نظر نہ بن، منظر بن۔ اور جو دیکھے بھی تو تو دکھنے کا گھونگھٹ نکال۔ اس کی اوٹ سے دیکھ۔ پھر سے دیکھ سنہرے۔ ابھی تو شام ہے۔ یہ سمے تو اداسی کا سمے ہے۔ دُکھ کا سمے ہے۔ شام بھئی کٹھن شام نہ آئے۔" آپی گنگنانے لگی " یاد ہے نا یہ بول؟ شام تو نہ آنے کا سمے ہے۔ تیرا آنے کا سمے ہے۔ بیٹی ذرا رُک جا۔ اندھیرا گاڑھا ہونے دے۔ پھر تیرا ہی سمے ہوگا۔ پچھلے پہر تک۔"

ایک دن آپی کا جی اچھا نہ تھا۔ مجھے بلایا۔ گئی۔ لیٹی ہوئی تھی۔ سرہانے تپائی پر سوڈے کی بوتل

دھری تھی۔ ساتھ نمک دانی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سوڈے کی بوتل کے گلے میں شیشے کا گولا پھنسا ہوتا تھا۔ "ٹھا" کر کے کھلتا تھا۔

بولی "سنہرے، بوتل کھول، گلاس میں ڈال۔ چٹکی بھر نمک گھول اور مجھے پلا دے۔ میں نے نمک ڈالا تو جھاگ اُٹھا۔ بلبلے ہی بلبلے۔ آپی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی: دیکھ لڑکی، یہ ہمارا سمے ہے۔ ہمارا سمے وہ ہے جب جاگ اُٹھے۔ ہم میں نہیں۔ دوجے میں اُٹھے۔ دوجے میں جھاگ اُٹھانا یہی ہمارا کام ہے۔ خود شانت دوجا بلبلے ہی بلبلے۔ جب تک جھاگ اُٹھتا ہے، ہمارا سمے۔ جب دوجا شانت ہو جائے، سمجھ لے، ہمارا سمے بیت گیا۔ اور جب سمے بیت جائے تو دھیرج پاؤں دھرنا۔ ٹھمک نہ کرنا۔ ٹھمک کا سمے گیا۔ چمک نہ مارنا۔ چمک کا سمے گیا۔ پایل نہ جھنکارنا۔ پایل کی جھنکار بیرن بھئی۔

پھر وہ لیٹ گئی۔ بولی "سنہرے، میری باتیں پھینک نہ دینا۔ دل میں رکھنا۔ یہ بھیتر کی باتیں ہیں، اوپر کی نہیں، سنی سنائی نہیں، پڑھی پڑھائی نہیں۔ وہ سب چھلکے ہوتی ہیں، بادام نہیں ہوتیں۔ جان لے بٹی بات وہ جو بھیتر کی ہو۔ گری ہو، چھلکا نہ ہو۔ جو بیتی ہو۔ جگ بیتی نہیں۔ آپ بیتی ہو۔ جڑ بیتی۔ باقی سب جھوٹ۔ دکھلاوا۔ بہلاوا۔"

آج مجھے باتیں یاد آ رہی ہیں۔ بیتی باتیں۔ بسری باتیں۔ سانپ گزر گئے۔ لکیریں رہ گئیں۔ لکیریں ہی لکیریں۔ سانپ تو صرف ڈراتے ہیں۔ پھنکارتے ہیں۔ لکیریں کاٹتی ہیں۔ ڈستی ہیں، پتا نہیں، ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لکیروں نے مجھے چھلنی کر رکھا ہے۔ چلتی ہیں۔ چلے جاتی ہیں۔ جیسے دھار چلتی ہے۔ ایک ختم ہوتی ہے دوجی شروع ہو جاتی ہے۔

آپی کی بیٹھک میں ہم تین تھیں: پہلی، روپا اور میں۔ پہلی بڑی، روپا منجھلی اور میں چھوٹی۔ پہلی میں بڑی آن تھی۔ پر مان نہ تھا۔ اس آن میں چھب تھی۔ سندرتا بھرا ٹھہراؤ تھا۔ یوں رعب سے بھری رہتی جیسے غبارہ رس سے بھرا رہتا ہے۔ گردن اُٹھی رہتی۔ مورتی سمان۔

روپا نری سُر تھی۔ مدھ سُر۔ تاروں سے بنی تھی۔ اس کے بند بند میں تار لگے تھے۔ سرتیاں سرتیاں۔ اور وہ گونجتے مدھم میں گونجتے۔ اور پھر سننے والوں کے دلوں کو نہلا دیتے۔ تبھی میں تھی۔ آپی کہتی تھی: سنہرے، تجھ میں دُکھ کی بھیگ ہے۔ تو بھگو دیتی ہے۔ خود بھی ڈوب جاتی ہے دوجے کو بھی ڈبو دیتی ہے۔ پگلی دوجے کو ڈبویا کر، خود نہ ڈوبا کر۔ مجھے تجھ سے ڈر آتا ہے سنہرے۔ کسی دن تو ہم سب کو نہ لے ڈوبے۔

آپی کی بیٹھک کوئی عام بیٹھک نہ تھی کہ جس کا جی چاہا منہ اُٹھایا اور چلا آیا۔ بیٹھک پر دھن دولت کا زور تو چلتا ہی ہے۔ وہ تو چلے گا ہی ہر بیٹھک پر۔ پر آپی نے برتاؤ کا ایسا رنگ چڑھا رکھا تھا کہ خالی دھن

دولت کا زور نہ چلتا تھا۔ نو دولتیے آتے تھے۔ پر ایسے بدمزا ہو کر جاتے کہ پھر رُخ نہ کرتے۔ آپی کی بیٹھک میں نگاہیں نہیں چلتی تھیں۔ اس نے ہمیں سمجھا رکھا تھا کہ لوگ نگاہوں پر اُچھالیں گے تو پڑے اچھالیں۔ لڑکیو تم نہ اچھلنا۔ جو نگاہوں پر اُچھل جاتی ہیں وہ منہ کے بل گرتی ہیں۔ اور جو گر گئی وہ سمجھ لو، نظروں سے گر گئی۔ پھر نہ اپنے جوگی رہی نہ دوسروں جوگی۔

آپی کی بیٹھک میں نظریں نہیں چلتی تھیں۔ کان لگے رہتے تھے۔ دل دھڑکتے تھے۔ وہاں ملاپ کا رنگ نہ ہوتا تھا۔ برہا کا ہوتا۔ رنگ رلیاں نہیں ہوتی تھیں۔ نہ وہاں تماشا ہوتا نہ تماش بین۔

مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب ہمارے ہاں ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تھی۔ دو مہینے میں ایک بار ضرور لگتی تھی۔ ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تو کوئی دوجا نہیں آسکتا تھا۔ صرف ٹھاکر کے سنگی ساتھی۔

ٹھاکر بھی تو عجب تھا۔ اُوپر سے دیکھو تو ریچھ۔ طاقت سے بھرا ہوا۔ اندر جھانکو تو بچہ۔ نرم نرم، گرم گرم۔ ویسے تھا آن بھرا مان بھرا۔ سنگیت کا رسیا۔ یوں لگتا جیسے بھیتر کوئی لگن لگی ہو۔ دھونی رمی ہو۔ آرتی سجی ہو۔

ٹھاکر کی ہمارے ہاں بڑی قدر تھی۔ آپی عزت کرتی تھی۔ بھروسا کرتی تھی۔ ٹھاکر نے بھی کبھی نظر اچھالی نہ تھی۔ جھکائے رکھتا۔ پیتا ضرور تھا، پر ایسی کہ غوں غوں پیتا جاتا اُلٹا دھم پڑتا جاتا۔ آنکھوں کی چمک گُل ہو جاتی۔ آواز کی کڑک بھیگ جاتی۔ اس کا نشہ ہی انوکھا تھا۔ جیسے بوتل کا نہ ہو، بھیتر کا ہو۔ بوتل اک بہانہ ہو۔ بوتل چابی ہو بھیتر کے پٹ کھولنے کی۔

ذرو سکھیو ذرو۔ بھیتر کے نشے سے ذرو۔ بھیتر کے نشے کے سامنے بوتل کا نشہ یوں ہاتھ جوڑے کھڑا ہے جیسے رب کے روبرو دیچ کھڑا ہو۔ بوتل کا تو خالی سر چکراتا ہے۔ بھیتر کا من کا جھولنا جھلا دیتا ہے۔ ذرو سکھیو ذرو بھیتر کے نشے سے ذرو۔ بوتل کا تو کام کاج جوگا نہیں چھوڑتا۔ بھیتر کا کسی جوگا نہیں چھوڑتا۔ خود جوگا بھی نہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ٹھاکر کے نشے کا ریلا مجھے بھی لے ڈوبے گا۔

ہاں تو اس روز ٹھاکر کی بیٹھک ہو رہی تھی۔ بول تھے ''کاٹھری میں کون جتن کر کھولوں۔ مورے پیا کے جیا میں پڑی رہی۔'' گیت نے کچھ ایسا سماں باندھ رکھا تھا کہ ٹھاکر جھوم جھوم جا رہا تھا۔ پھر کبھو، پھر بولو کا جاپ کیے جا رہا تھا۔ نہ جانے کس گرہ کو کھولن کی آرزو جاگی تھی۔ اپنے من یا محبوب کے من کی۔ سمے بیتا جا رہا تھا۔ سمے کی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ سمے جیون سے نکل جاتا ہے کہ کون ہیں، کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ اس روز وہ سمے ایسا ہی سمے تھا۔

دفعتاً گھڑی نے تین بجائے۔ آپی ہاتھ جوڑے اُٹھ بیٹھی۔ بولی ''شما کرو ٹھاکر جی۔ معافی مانگتی ہوں۔ ہمارے سمے بیت گیا۔ اب بیٹھک ختم کرو۔''

ٹھاکر پہلے تو چونکا پھر مسکایا۔ ''نہ آپی'' وہ بولا۔ ابھی تو رات بھیگی ہے۔ آپی بولی ٹھاکر ہم سُو کے پروں والے پنچھی ہیں۔ جب رات بھیگ جاتی ہے تو ہمارا سے بیت جاتا ہے۔ جو ہمارے پر بھیگ گئے تو اڈاری نہ رہے گی۔ فن کار میں اُڈاری نہ رہے تو باقی رہا کیا؟ ٹھاکر نے بڑی منتیں کیں۔ آپی نہ مانی۔

محفل ٹوٹ گئی تو ہم تینوں آپی کے گرد ہو گئیں۔ ''آپی یہ سے کا گورکھ دھندا کیا ہے؟''

آپی بولی ''لڑکیو سے بڑی چیز ہے۔ ہر کام کا الگ سے بنا ہے۔ رات کو گاؤ بجاؤ۔ پیو۔ پلاؤ۔ ملو ملاؤ۔ موج اڑاؤ۔ بس تین بجے تک۔ پھر بھور سے اُس کا سے ہے۔ اس کا نام جپو۔ اسے پکارو۔ فریاد کرو۔ دعائیں مانگو۔ سجدے کرو۔ اس سے میں تم عیش نہیں کر سکتے۔ گناہ نہیں کر سکتے۔ قتل نہیں کر سکتے۔ یہ دھندا جو ہمارا ہے اُس کے سے میں نہیں چل سکتا۔ اُس کے سے میں پاؤں نہ دھرنا۔ اُس نے برا مانا تو ماری جاؤ گی۔ جو وہ راضی ہو گیا تو بھی ماری جاؤ گی۔ اور دیکھو اس کے سے کے نیڑے بھی ایسا گیت نہ گانا جو اسے پکارے۔ بھجن نہ چھیڑنا۔ ڈرو کہیں وہ تمھاری پکار سن کر ہنکارا نہ بھر دے۔

پھر وہ دن آ گیا جب میں نے ان جانے میں سے کا بندھن توڑ دیا۔ اس روز ٹھاکر آئے۔ آپی سے بولے ''بائی کل خواجہ کا دن ہے۔ خواجہ کی نیاز سارے گاؤں کو کھلاؤں گا۔ آج رات خواجہ کی محفل ہو گی ادھر حویلی میں۔ صرف اپنے ہوں گے، گھر کے لوگ۔ تجھے لینے آیا ہوں۔ چل میرے ساتھ میرے گاؤں۔

آپی سوچ میں پڑ گئی۔ بولی ''روپا ماندی ہے۔ وہ تو نہیں جا سکے گی۔ کسی اور دن رکھ لینا نذر نیاز۔''

''خواجہ کا دن میں کیسے بدلوں۔'' وہ بولا۔

''تو کسی اور منڈلی کو لے جا۔''

''اونہوں ٹھاکر نے منہ بنالیا'' خواجہ کی بات نہ ہوتی تو لے جاتا۔ ان کا نام لینے کے لائق تو ہو۔''

''میں کس لائق ہوں جو ان کا نام منہ پر لاؤں۔''

''بس اک تیری ہی بیٹھک ہے باقی جہاں پورا ہے۔ جہاں جسم کا نہیں من کا ٹھکانا ہے۔''

آپی مجبور ہو گئی۔ اس نے روپا کا دھیان رکھنے کے لیے چیلی کو وہاں چھوڑا اور مجھے لے کر ٹھاکر کے گاؤں چلی گئی۔

رات بھر وہاں حویلی میں خواجہ کی محفل لگی۔ وہ تو گھریلو محفل تھی۔ ٹھاکر کی بہنیں، بہوویں، بیٹیاں، ٹھاکرانی سب بیٹھے تھے۔ وہ تو سمجھو بھجن منڈلی تھی اور خواجہ کے گیت ''خواجہ میں تو آن کھڑی تورے دوار'' سے شروع ہوئی تھی۔

آدھی رات کے سے محفل اتنی بھیگی کہ سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل ڈولے۔ آپی کا ڈوب ہی

گیا۔ نھا کر اسے محفل سے اٹھا کر اندر لے گیا، شربت شیرا پلانے کو۔ پھر وہیں لٹا دیا۔ پھر خواجہ کے گیت چلے تو میں بھی بھیگ گئی۔ آنکھیں بھر بھر آئیں۔ میں حیران میں تو کچھ مانگ نہیں رہی۔ میں تو التجا نہیں کر رہی۔ میں تو اک تاجر ہوں۔ پیسہ کمانے کے لیے آئی ہوں۔ میری آنکھیں کیوں بھر بھر آئیں خواہ مخواہ۔ سو میں بنا سوچے سمجھے گائے چلی گئی۔ آنکھیں بھر بھر آتی رہیں۔ دل کو کچھ کچھ ہوتا رہا۔ پر میں بھیگ بھیگ کر گاتی گئی۔ سے بیت گیا اور مجھے دھیان ہی نہ آیا کہ میں اس کے سے میں پاؤں دھر چکی ہوں۔ آپی تھی نہیں جو مجھے ٹوکتی۔

اور پھر مجھے کیا پتا تھا کہ خواجہ کون ہے۔ میں نے تو صرف نام سن رکھا تھا۔ اس کے گیت یاد کر رکھے تھے۔ میں تو صرف یہ جانتی تھی کہ وہ غریب نواز ہے۔ میں تو غریب نہ تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ مجھے بھی نواز دے گا۔ خواہ مخواہ، زبردستی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس میں اتنی بھی سدھ بدھ نہیں کہ کون پکار رہا ہے۔ کون گا رہا ہے۔ کون منگتا ہے۔ کون خالی جھولی پھیلا رہا ہے۔ کون بھری جھولی سمیٹ رہا ہے۔ میں تو یہی سنتی آئی تھی کہ دکھی لوگ پکار پکار کر ہار جاتے ہیں، پر کوئی سنتا نہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اتنا دیالو ہے۔ اتنا تیز ہے۔ اتنے کان کھڑے رکھتا ہے۔

پھر نھا کر بولا "سنہری بائی، بس اک آخری فرمائش: خواجہ پیا موری رنگ دے چنریا۔ ایسی بھی رنگ دے، رنگ نہ چھوٹے۔ دھوبیا دھوئے جائے ساری عمریا۔"

پھر مجھے سدھ بدھ نہ رہی۔ ایسی رنگ پچکاری چلی کہ میں بھیگ گئی۔ اور میں ہی نہیں ساری محفل رنگ رنگ ہو گئی۔ انگ انگ بھیگا۔ خواجہ نے رنگ گھاٹ بنا دیا۔

گھر پہنچی تو گویا میں، میں نہ تھی۔ دل رویا رویا۔ دھیان کھویا کھویا۔ کسی بات میں چت نہ لگتا۔ بیٹھک بے گانہ دکھتی۔ ساز میں طرب نہ رہا۔ سارنگی روئے جاتی۔ استاد گھمو خاں بجاتے پر وہ روئے جاتی۔ طبلہ سر پیٹتا۔ گھنگھرو کہتے پاؤں میں ڈال اور بن کو نکل جا۔ وہاں اس کا جھومر ناچ جو چپے چپے ڈال ڈال سے جھانک رہا ہے۔

روز دن میں تین چار بار ایسی رقت طاری ہوتی کہ بھیں بھیں کر روتی۔ پھر حال کھیلنے لگتی۔ پہلی حیران، روپا کا منہ کھلا، آپی چپ، یہ کیا ہو رہا ہے۔ جب آٹھ دن یہی حالت رہی بلکہ اور بگڑ گئی تو آپی بولی: بس پتر، تیرا اس بیٹھک سے بندھن ٹوٹ گیا۔ دانہ پانی ختم ہو گیا۔ تو نے اس کے سے میں پاؤں دھر دیا۔ اس نے تجھے رنگ دیا۔ اب تو اس دھندے جوگی نہیں رہی۔

"پر کہاں جاؤں آپی؟ اس بیٹھک سے باہر پاؤں دھرنے کی کوئی جگہ بھی ہو میرے لیے۔"

"جس نے بلایا ہے اس کے دربار میں جا" روپا بولی۔

''اُس بھینٹر میں جائے'' آپی بولی'' یہ لڑکی جائے جس کا سنہری پنڈا کپڑوں سے باہر جھانکتا ہے۔ نہیں، یہ کہیں نہیں جائے گی۔ اسی کوٹھڑی میں رہے گی، بیٹھک میں پاؤں نہیں دھرے گی۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ رقت ختم ہوگئی۔ دل میں اک جنون اُٹھا کہ کسی کی ہو جاؤں۔ کسی ایک کی۔ تن من دھن سے اسی کی ہو جاؤں۔ ہو رہوں۔ وہ آئے تو اس کے جوتے اتاروں۔ پنکھا کروں۔ پاؤں دابوں۔ سر میں تیل کی مالش کروں۔ اس کے لیے پکاؤں۔ میز لگاؤں۔ برتن رکھوں۔ اس کی بنیا نیں دھوؤں۔ کپڑے استری کروں۔ آرسی کا کول بناؤں پھر سرہانے کھڑی رہوں کہ کب جاگے، کب پانی مانگے۔

ایک دن آپی بولی'' اب کیا حال ہے دھیے؟'' میں نے رو رو کے ساری بات کہہ دی کہ کہتے ہیں کسی ایک کی ہو جا۔''

بولی'' وہ کون ہے؟ کوئی نظر میں ہے کیا؟''

''اونہوں۔ کوئی نظر میں نہیں۔''

''تا کہ نقشہ دکھتا ہے کبھی؟''

''نہیں آپی۔''

''کوئی بات نہیں'' وہ بولی'' جو کھونٹی پر لٹکنا مقصود ہے تو آپ کھونٹی بھیجے گا۔''

دس ایک دن کے بعد جب بیٹھک راگ رنگ سے بھری ہوئی تھی تو میری کوٹھڑی کا دروازہ بجا۔ آپی داخل ہوئی بولی'' خوجہ نے کھونٹی بھیج دی۔ اب بول کیا کہتی ہے؟''

''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی زمیندار ہے۔ ادھیڑ عمر کا ہے۔ کہتا ہے بس ایک بار بیٹھک میں آیا تھا۔ سنہری بائی کو سنا تھا۔ جب سے اب تک اس کی آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ توجہ ہٹانے کے بہت جتن کیے۔ کوئی پیش نہیں گئی۔ اب ہار کے تیرے در پر آیا ہوں۔ بول تو کیا کہتی ہے؟ منہ مانگا دوں گا۔

میں نے کہا'' دے۔ دے۔ سال کے لیے بخش دے۔ جیسے تیری مرضی۔'' آپی ہنسنے لگی۔ پھر بولی ''چل بیٹھک میں اسے دیکھ لے ایک نظر۔''

''اونہوں'' میں نے سر ہلا دیا'' نہیں آپی۔ انھوں نے بھیجا ہے تو ٹھیک ہے۔ دیکھنے کا مطلب؟''

''کتنی دیر کے لیے مانوں؟''

''جیون بھر کے لیے۔''

''سوچ لے، جو اوباش نکلا تو؟''

"پڑا نکلے۔ کیسا بھی ہے جیسا بھی نکلے۔"

اگلے دن بیٹھک میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ زمیندار نے پیسے کا ڈھیر لگا دیا۔ آپی نے رد کر دیا لوٹا دیا۔ بولی "سودا نہیں کر رہی۔ اپنی دھی وداع کر رہی ہوں۔ اور یاد رکھو یہ خوابوں کی امانت ہے۔ سنبھال کر رکھیو۔"

☆

حویلی یوں اُجڑی ہوئی تھی جیسے دیو پھر گیا ہو۔

ویسے تو سبھی کچھ تھا۔ سازوسامان تھا۔ آرائش تھی۔ قالین بچھے ہوئے تھے۔ صوفے لگے ہوئے تھے۔ قدِ آدم آئینے۔ جھاڑ فانوس سبھی کچھ۔ پھر بھی حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

برآمدے میں آرام کرسی پر چھوٹی چودھرانی بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے تپائی پر چائے کے برتن پڑے تھے۔ مگر اسے خبر ہی نہ تھی کہ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اسے تو خود کی سدھ بدھ نہ تھی کہ کون ہے، کہاں ہے، کیوں ہے۔

اوپر سے شام آ رہی تھی۔ سے کو سے ٹکراتی۔ اُداسیوں کے جھنڈے گاڑتی۔ یادوں کے دیے جلاتی۔ بیتی باتوں کے الاپ گنگناتی۔ دبے پاؤں۔ مدھم۔ یوں جیسے پایل کی جھنکار ہیر نیا ہو۔

دُور، اپنے کوارٹر کے باہر کھاٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار کی نگاہیں چھوٹی چودھرانی پر جمی ہوئی تھیں۔ حقے کا سوٹا لگاتا اور پھر سے چھوٹی چودھرانی کو دیکھنے لگتا۔ یوں جیسے اسے دیکھ دیکھ کر زخمی ہوا جا رہا ہو۔

دُوسری جانب گھاس کے پلاٹ کے کونے پر بوڑھا مالی پودوں کی تراش خراش میں لگا تھا۔ ہر دو گھڑی کے بعد سر اٹھاتا اور چھوٹی چودھرانی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتا۔ پھر چونک کر لمبی ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر سے کاٹ چھانٹ میں لگ جاتا۔

جنت بی بی، جو چھوٹی چودھرانی کا کھانا پکاتی تھی، دو تین بار برآمدے کے پرلے کنارے پر کھڑی ہو کر اسے دیکھ گئی تھی۔ جب دیکھتی تو اس کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں۔ پلو سے پونچھتی پھر لوٹ جاتی۔

سارے نوکر کمین چھوٹی چودھرانی پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کے غم میں گھلے جا رہے تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس پر سخت ناراض بھی تھے۔ اس نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی کیوں ماری تھی؟ کیوں خود کو دوجوں کا محتاج بنا لیا تھا؟ کیوں؟ اپنی اولاد ہوتی تو پھر بھی سہارا ہوتا۔ اپنی اولاد تو تھی نہیں۔

جب چودھری مرنے سے پہلے بقائمی ہوش وحواس اپنی آدھی غیر منقولہ جائیداد چھوٹی چودھرانی کے نام گفٹ کر گیا تو اسے کیا حق تھا کہ اپنا تمام تر حصہ بڑی چودھرانی کے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دے۔ اگر ایک دن بڑی چودھرانی نے اسے حویلی سے نکال باہر کیا تو وہ کیا کرے گی؟ کس کا در دیکھے گا؟

ایک طرف تو اتنی بے نیازی کہ اتنی بڑی جائیداد اپنے ہاتھ سے بانٹ دی، اور دوسری طرف یوں

سوچوں میں گم تصویر بن کر بیٹھ رہتی ہے۔ سارے ہی نوکر حیران تھے کہ چھوٹی چودھرانی کس سوچ میں کھوئی رہتی ہے۔ چودھری کو مرے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔ جب سے یونہی حواس گم تیاس گم بیٹھی رہتی ہے۔ اور اور پھر ٹوٹتی رات سے اس کے کمرے سے گنگنانے کی آواز کیوں آتی ہے؟ کس خواجہ پیا کو بلاتی ہے؟ خواجہ پیا موری لیو خبریا۔ کون خبر لے؟ کیسی خبر لے؟ چھوٹی چودھرانی پر انھیں پیار ضرور آتا تھا۔ پر اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس سوچ میں پڑی رہتی ہے۔

چھوٹی چودھرانی کو صرف ایک سوچ لگی تھی۔ اندر سے ایک آواز اُٹھتی۔ بول تیرا جیون کس کام آیا؟ وہ سوچ سوچ ہار جاتی، پر اس سوال کا جواب ذہن میں نہ آتا۔ اُلجھے اُلجھے خیال اُلجھاتے۔ مجھے چمن سے اکھیڑا۔ بیل بنا کر اِک درخت کے گرد گھما دیا اور اب اس درخت کو اُکھیڑ پھینکا۔ بیل مٹی میں مل گئی۔ اب یہ کس کے گرد گھومے؟ بول میرا جیون کس کام آیا؟

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے روبرو کھڑا ہے۔ سر اٹھایا۔ سامنے گاؤں کا پٹواری کھڑا تھا۔

''کیا ہے؟'' وہ بولی۔

''میں ہوں پٹواری، چھوٹی چودھرانی جی۔''

''تو جا، جا کر بڑی چودھرانی سے مل۔ مجھ سے تیرا کیا کام؟''

''آپ ہی سے کام ہے'' وہ بولا۔

''تو بول کیا کہتا ہے؟''

''گاؤں میں دو درویش آئے ہیں۔ گاؤں والے چاہتے ہیں انھیں چند دن یہاں روکا جائے۔ جو آپ اجازت دیں تو آپ کے مہمان خانے میں ٹھہرا دیں۔''

''ٹھہرا دو۔'' وہ بولی۔

''نوکر چاکر، بندوبست''۔ وہ رک گیا۔

''سب ہو جائے گا۔''

پٹواری سلام کر کے جانے لگا تو پتا نہیں کیوں اس نے سرسری طور پر پوچھا ''کہاں سے آئے ہیں؟''

پٹواری بولا ''اجمیر شریف سے آئے ہیں۔ خواجہ غریب نواز کے فقیر ہیں۔'' اک دھماکا ہوا چھوٹی چودھرانی کی بوٹیاں ہوا میں اچھلیں۔

اگلی شام چھوٹی چودھرانی نے جنت بی بی سے پوچھا ''جنت یہ جو درویش ٹھہرے ہوئے ہیں یہاں، ان کے پاس گاؤں والے آتے ہیں کیا؟''

جنت بولی "لو چھوٹی چودھرانی وہاں تو سارا دن لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ جو منہ سے کہتے ہیں ہو جاتا ہے۔"

"تو تیار ہو جا۔ جنت ہم بھی جائیں گے۔ تو اور میں۔"

"چودھرانی جی وہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔"

"تو چل تو سہی۔" چودھرانی نے خود کو چادر میں لپیٹتے ہوئے کہا" اور دیکھ وہاں مجھے چودھرانی کہہ کر نہ بلانا۔ خبردار!"

جب وہ مہمان خانے پہنچیں تو دروازہ بند تھا۔ جنت نے دروازہ کھٹکھٹایا، کون ہے؟ اندر سے آواز آئی۔ جنت نے پھر دستک دی۔ سفید ریش بوڑھے خادم نے دروازہ کھولا۔ جنت زبردستی اندر داخل ہو گئی۔ پیچھے پیچھے چودھرانی تھی۔ سفید ریش گھبرا گیا۔ بولا: "سائیں بادشاہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔ وہ اس کمرے میں مشغول ہیں۔"

"ہم سائیں بادشاہ سے ملنے نہیں آئے" چھوٹی چودھرانی بولی۔

"تو پھر؟" سفید ریش گھبرا گیا۔

"ایک سوال پوچھنا ہے۔" چودھرانی نے کہا۔

"سائیں بابا اس کے سوال کا جواب نہیں دیں گے۔"

"سائیں بابا نے جواب نہیں دینا۔ انھوں نے پوچھنا ہے" وہ بولی۔

"کس سے پوچھنا ہے؟" خادم بولا۔

"اس سے پوچھنا ہے جس کے وہ بالکے ہیں۔" یہ سن کر سفید ریش خادم سُن ہو کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

"ان سے پوچھو" چھوٹی چودھرانی نے کہا" ایک عورت تیرے دوار پر کھڑی پوچھ رہی ہے۔ اے غریب نواز بتا کہ میرا جیون کس کام آیا؟"

کمرے پر منوں بوجھل خاموشی طاری ہو گئی۔

چھوٹی چودھرانی بولی" کہو وہ عورت پوچھتی ہے۔ تو نے بیٹھک کے گملے سے اک بوٹا اکھیڑا۔ اسے بیل بنا کر ایک درخت کے گرد لپیٹ دیا کہ جا اس پر نثار ہوتی رہ"۔ وہ رک گئی۔ کمرے کی خاموشی اور گہری ہو گئی۔ "اب تو نے اس درخت کو اکھیڑ پھینکا ہے۔ بیل مٹی میں رل گئی۔ وہ بیل پوچھتی ہے۔ بول میرا جیون کس کام آیا؟" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔

"تیرا جیون کس کام آیا۔ تیرا جیون کس کام آیا۔" سفید ریش خادم کے ہونٹ لرزنے لگے۔

''تو پوچھتی ہے تیرا جیون کس کام آیا؟'' وہ رک گیا۔ کمرے کی خاموشی اتنی بوجھل ہو گئی کہ سہاری نہیں جاتی تھی۔

''میری طرف دیکھ'' سفید ریش خادم نے کہا ''سنہری بائی، میری طرف دیکھ کہ تیرا جیون کس کام آیا۔ مجھے نہیں پہچانتی؟ میں تیرا سارنگی نواز تھا۔ دیکھ میں کیا تھا کیا ہو گیا۔''

چھوٹی چودھرانی کے منہ سے ایک چیخ نکلی ''استاد جی، آپ!'' وہ استاد کے چرن چھونے کے لیے آگے بڑھی۔

عین اس وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک بھاری بھر کم نورانی چہرہ برآمد ہوا۔

''سنہری بی بی'' وہ بولا ''مجھ سے پوچھ تیرا جیون کس کام آیا؟''

چھوٹی چودھرانی نے مڑ کر دیکھا۔ ''ٹھاکر'' وہ چلائی۔

ٹھاکر بولا: ''اب ہمیں پتا چلا کہ سرکار نے ہمیں ادھر آنے کا حکم کیوں دیا تھا'' اس نے سنہری بی بی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ بولا: ''بی بی، ہمیں آشیرباد دے۔''

۔☆۔

ایک ہاتھ کی تالی

چلتے چلتے میں رُک گیا: بائیں! یہ کیا؟

میرے سامنے چھوٹی چاردیواری کے درمیان ایک درخت کھڑا تھا، جس کی شاخیں ایک جانب کیکر کی تھیں اور دوسری جانب بیری کی۔

میں نے حیرت سے اس کا جائزہ لیا۔ بظاہر تنا ایک ہی تھا۔ قریب سے دیکھنے کے لیے میں چاردیواری کے اندر داخل ہو گیا۔

چاردیواری کے اندر کھلی زمین تھی، جس میں دو پختہ قبریں بنی ہوئی تھیں۔ دونوں قبروں کے درمیان میں وہ درخت ایستادہ تھا۔ میں نے درخت کے گرد گھوم پھر کر دیکھا۔ وہ ایک ہی درخت تھا، لیکن اوپر دائیں ہاتھ کی ٹہنیاں کیکر کی تھیں اور بائیں ہاتھ کی بیری کی۔ کیکر کی ٹہنیوں پر جابجا زرد رنگ کی دھجیاں بندھی ہوئی تھیں، اور بیری کی ٹہنیوں پر لال رنگ کی۔ میں حیرت سے نت بنا اُسے دیکھتا رہا۔

دفعتہً چاردیواری کے قریب حرکت سی ہوئی۔ میں چونکا۔ دیکھا ایک بوڑھی ضعیف عورت گٹھڑی بنی، دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہے۔ مجھے متوجہ دیکھ کر وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی "کیا دیکھ رہا ہے تو؟"

میں نے کہا "مائی جی، اس درخت کو دیکھ رہا ہوں۔ عجب درخت ہے یہ۔ آدھا کیکر، آدھا بیری۔"

بڑھیا مسکرائی، بولی "یہ ان بابا لوگوں کا معجزہ ہے۔"

"کون بابا لوگ؟" میں نے پوچھا۔

اس نے ہاتھ ہلا کر دونوں قبروں کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان قبروں کو دیکھتی رہی۔ عین اس وقت ایک عمر رسیدہ آدمی داخل ہوا۔ بولا "یہ دائیں ہاتھ والا بابا

کمال کا مزار ہے۔ اور ہائیں والا بابا جمال کا۔ یہ دونوں عشق و محبت کے بابے ہیں، بابو جی۔ یہاں محبت کے مارے لوگ آتے ہیں، منتیں مانتے ہیں۔ ٹہنیوں پر جو تلیاں بندھی ہوئی ہیں، یہ سب محبت کی منتیں ہیں۔ بابا کمال کے دوار پر عورتیں آتی ہیں اور پیلی ٹلی باندھتی ہیں۔ بابا جمال کی خدمت میں مرد آتے ہیں اور لال ٹلی باندھتے ہیں۔"

مجھے بابوں وابوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ ہی میں منتیں ماننے کو اہمیت دیتا ہوں۔ لیکن وہ آدھا کیکر، آدھا بیری کا درخت!۔۔۔ میں تحقیق پر مجبور ہو گیا۔۔۔ ورنہ یہ کہانی ان کہی رہ جاتی۔

☆

سردار بائی باہر میں نہیں بھیتر میں جیتی تھی۔ اس کی ہر بات میں رمز ہوتی۔ بھید انچھتا ضرور تھا، پر ہونٹوں پر نہیں آتا تھا۔ گالوں پر سرخی بن کر جھلکتا۔ آنکھوں میں پھوار بن کر اڑتا۔ لیکن کیا مجال کہ زبان میں جنبش پیدا کرے۔

ایک روز جب چاروں ناچیاں فراغت سے بیٹھی تھیں تو سردار بائی نے برمحل تذکرہ کہا "لڑکیو، ہم یہ شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔"

یہ سن کر تینوں چونکیں۔

بنی کی بھنویں کمان بن گئیں۔ ماتھے پر وہ مخصوص گھوری پڑ گئی جو گھورتی بھی تھی، ساتھ پچکارتی بھی۔ بنی بولی "کیا کہا؟ یہ شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں؟"

سردار بائی نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

چکی کی ناک دھار بن گئی۔ آنکھوں میں پھر کی سی چلی۔ بولی "کیوں جا رہے ہیں ہم؟"

سردار بائی کی آنکھوں میں تبسم کی پھوار اڑی، لیکن اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔

مینا چونکی۔ پھر خود کو سنبھال کر بولی "کہاں جا رہے ہیں ہم؟"

سردار بائی کی آنکھوں میں پھر سے پھلجھڑی چلی، لیکن خاموشی چھائی رہی۔

لڑکیوں کو پتا تھا کہ جب سردار بائی کی آنکھوں میں پھلجھڑی چلے تو سمجھو کہ کوئی بات ہے۔ ضرور ہے۔ پر وہ بھید ہے۔ زبان پر نہیں آئے گی۔ لاکھ پوچھو، کریدو۔۔۔ بے کار۔

ایک ہفتے کے بعد جب ان کا ڈیرہ دور کسی ریاست کے صدر مقام انگوا میں پہنچا تو انھیں پتا چلا کہ یہاں قیام ہوگا۔ "کہاں" کا جواب تو مل گیا "کیوں" بھید ہی رہا۔

نئی رہائش گاہ دیکھی تو وہ حیران رہ گئیں۔ وہ چوبارہ نہیں تھی بنگلہ تھی۔ تھی تو رقص و سرود کے علاقے میں، پر ذرا ہٹ کر، ایک طرف۔ بنگلے کے دروازے پر "آساوری" کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

چوبارے کی شوونڈو سے نکل کر بنگلے کی چاردیواری میں آ گئیں تو انھیں وقار مل گیا۔ سٹیٹس حاصل ہوگیا۔ یوں ان کے ڈیرے کی ریاست میں دھوم مچ گئی۔

سردار بائی کے ڈیرے میں تین لڑکیاں تھیں: بنی، چنکی اور مینا۔ تینوں ٹوٹا ٹوں تھیں۔ ہر ایک اپنے ہی رنگ میں رنگی تھی۔ چھب اپنی اپنی، انداز اپنا اپنا، سجاؤ اپنا اپنا۔

بنی جسم ہی جسم تھی، بھوری، روغنی، ریشمی جسم، سنہرا اور روشن، تناسب کا نمونہ۔ سارے گھر پر جسم نے قبضہ جما رکھا تھا۔ بے چاری گھر والی۔ بنی باہر دہلیز پر پڑی تھی۔

مشکل یہ تھی کہ جسم چھپائے سے چھپتا نہیں تھا۔ کپڑوں سے باہر نکل آتا۔ حواس پر چھا جاتا۔ گردوپیش کا سنہرا، ریشمی کر دیتا۔ حالانکہ ناچ اور گانے میں بڑی دسترس رکھتی تھی۔ گنی تھی۔ لیکن جسم فن کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیتا تھا۔

چنکی چمک کی لہر تھی۔ اتنی تیز تھی، اتنی ٹرت پھرت کہ یوں نکھر جاتی جیسے خربوزے میں نکھری۔ آنکھوں میں دھار تھی۔ ہونٹوں پر طنز۔ لیکن دبی دبی۔ ہاتھ زبت سے بھرے ہوئے تھے۔ پاؤں میں گھنگھرو پہنتی تو وہ حرکت کے بغیر ہی چھن چھن کرتے۔ جسم میں حرکت مقید تھی، یوں جیسے بوتل میں جن۔ اب نکلا کہ اب نکلا۔ جیسے کمان میں تیر پھنسا ہو۔ اب چھوٹا کہ اب چھوٹا۔

پھر مینا تھی۔ اس کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ بالکل ماورائی، جیسے مندر میں جائے نماز بچھی ہو۔ شخصیت میں دو عنصر نمایاں تھے۔ ایک طرف گریس کا دھارا چل رہا تھا، دوسری طرف تمکین کے پہاڑ تنے کھڑے تھے۔

جنبش میں ربط تھا۔ روانی ایسی کہ کہیں دھوکا نہ لگتا تھا۔ نت اور چت میں کوئی ربط نہ تھا۔ بت بیٹھا رہتا، چت گم، نہ جانے کہاں منڈلاتا۔ دیکھنے والا ان جانے میں ڈھونڈ میں مبتلا ہو جاتا۔

سردار بائی کے اکھوا میں آتے ہی ریاست کے امراء اور اہل کاروں کے نوجوان بیٹوں نے ڈیرے کو اپنا لیا۔

نوجوان مل کر شام میں مخصوص کرا لیتے۔ راگ رنگ کی محفلیں ہوتیں۔ گفتگو ہوتی۔ ہنسی مذاق ہوتا۔ کھانا پینا ہوتا۔ نہ تو بدمستی ہوتی نہ ہی تخلیہ۔ سردار بائی نے آنے والوں پر واضح کر رکھا تھا کہ یہاں تفریح ہوگی، تماش بینی نہیں۔ اگر کوئی تخلیے کا خواہش مند ہو تو گھر بلا لے۔

ریاست کے نواب رحم اللہ بیگ ویسے تو ماڈرن خیالات کے حامی تھے، وسیع القلب تھے، لیکن رکھ رکھاؤ کے شدت سے قائل تھے۔ ذرا سا وقار میں فرق آ جاتا تو ان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا۔

انھوں نے اپنے بڑے بیٹے کمال اللہ بیگ پر بارہا واضح کر رکھا تھا کہ بیٹے جو چاہو کرو، ہم کوئی

پابندی عائد نہیں کرتے۔ مگر وقار کو کسی صورت ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ بیٹے، چینی کے برتن میں ایک بار بال آ جائے تو وہ ہمیشہ کے لیے معتوب ہو جاتا ہے۔

وقار بھرے ماحول میں تیس سال گزار کر کمال میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس میں جذب کر لینے کی صلاحیت بیدار ہو چکی تھی۔

کمال کے دوست اسے بار بار مجبور کرتے رہے کہ چلو، بائی کے ڈیرے پر چلیں۔ پہلے تو وہ ٹالتا رہا، لیکن پھر مجبور ہو گیا۔ رُوپ بدل کر جانے کے لیے تیار ہو گیا اور انھیں تاکید کر دی کہ بھید نہ کھولیں۔

گیا تو تفریح کے لیے تھا، لیکن مینا کے ماورائی وقار نے پتا نہیں کیا کر دیا۔ دوستوں کے رُوبرو خود کو سنبھالا۔ بڑی مشکل سے محفل میں حاضر رہا، پر بظاہر۔ اندر سے حاضر نہ تھا۔ ادھر مینا بھی حاضر نہ تھی۔ بُت تھا، چِت نہ تھا۔ اس کا تو خیر یہی معمول تھا۔ کمال مینا کے چِت کی ڈھونڈ میں کھو گیا تھا۔ اگلے روز رات کو خواب گاہ میں مینا کا بت پھر سامنے آ بیٹھا۔ بولا "چت کو ڈھونڈ۔" ساری رات ڈھونڈ میں بیت گئی۔

جب تین چار راتیں یونہی گزریں تو وہ گھبرا گیا۔ ایسا تو کبھی نہ ہُوا تھا۔

دوسری بار جب وہ دوستوں کے ہمراہ ڈیرے پر گیا تو ساتھی بینی اور چِکی کی طرف متوجہ رہے اور کمال کو مینا سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

زیرِ لب بولا "آپ کہاں ہیں؟"

مینا نے چونک کر دیکھا لیکن منہ سے نہ بولی۔

کمال نے کہا "ایک لمحے کے لیے یہاں آ جایئے نا۔"

"کہاں آ جاؤں؟" اس نے پوچھا۔

"جہاں آپ بیٹھی ہیں، وہاں۔"

وہ مسکائی۔ بولی "میں تو یہیں ہوں۔"

"یہاں تو خالی بُت ہے۔"

وہ پھر مسکرائی "خالی بت ہی تو ہوں۔"

"کتنا اچھا ہوتا" کمال نے کہا "اگر خالی بت ہی ہوتیں۔"

"کیوں؟" اس کی بھویں کمان بن گئیں۔

"خالی بت ہوتیں تو میں ڈھونڈ میں نہ پڑتا۔"

اس کے ہونٹوں پر ادھوری مسکان آ گئی۔ بولی "سامنے دھری کی ڈھونڈ کیسی؟"

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر کمال نے زیرِ لب پوچھا "اگر گھر پر بلاؤں تو آ جائیں

گی؟"

"میں آنے جانے والی کون ہوں" وہ بولی "بھیجنے والی سے پوچھیے۔" اُس نے سردار بائی کی طرف اشارہ کیا۔

چار ایک دن بعد محل سے دُور، بائیں باغ کے دیوان خانے کے سامنے ایک بگھی رُکی۔ سیاہ نقاب میں ملفوف خاتون نکلی۔ برآمدے میں نوابزادہ کمال منتظر کھڑا تھا۔

نوابزادے نے کہا "ہمارا نام کمال ہے۔"

"مجھے پتا ہے" وہ بولی "پہلے آپ رئیس زادے تھے، اب نواب زادے ہیں۔"

وہ اسے کمرے میں لے گیا۔ چائے آ گئی، اور وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے چائے پیتے رہے۔

پھر وہ بولا "ہم نے آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ ہمارے لیے آپ سے دُور رہنا مشکل ہو گیا ہے۔"

"میری خوش قسمتی ہے" وہ بولی۔

"اونہوں" وہ بولا "رسمی باتیں نہ کیجیے۔ بھول جائیے کہ آپ کون ہیں، ہم کون ہیں۔"

وہ شرارت سے مسکرائی۔ بولی "بھول گئی۔"

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ بولا "آپ کو علم نہیں ہم بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے ہیں۔"

"کیوں؟ خیریت؟" مینا نے پوچھا۔

وہ رُک گیا۔ بولا "خاتون، ہمیں آپ سے محبت ہو گئی ہے۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ نظریں جھکائے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ محبت کا اظہار تو اس سے زندگی میں کئی ایک نے کیا تھا، مگر نواب زادے کے اظہار کی سُر تال مختلف تھی۔

"آپ سُن رہی ہیں؟" وہ بولا۔

"سُن رہی ہوں۔"

"خدارا جواب میں کچھ تو کہیے" وہ بولا۔

اُس نے سر اٹھایا۔ کہنے لگی "نواب زادہ صاحب، جو خریدی جا ئے اس سے محبت

"ہمیں نت نہیں چاہیے" وہ بولا۔

"نواب زادہ صاحب، چت کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔"

"سچ کہتی ہیں آپ" وہ بولا "چت بس میں نہیں ہوتا۔ ہم خود بے بس ہو رہے ہیں۔"

"بت سے دل بہلائیے، نواب زادہ صاحب، بہلاتے رہیے، حتیٰ کہ دل بھر جائے۔ چت کی ڈھونڈ نہ رہے۔"

دیر تک وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر قریب آ کر ینا کا ہاتھ تھام کر بولا "ہم نے آپ کو دل بہلانے کے لیے نہیں بلایا۔ ہم آپ کو دل بہلاوا نہیں سمجھتے۔"

اس کے ہاتھ میں عجب سا "تک" تھا۔ مدھم گرمی اس کے جسم میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔

دیر تک وہ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر بولی "ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھیے۔"

"برا تو نہیں مانیں گے، آپ؟"

"نہیں۔"

"آپ کو پتا ہے، محبت کسے کہتے ہیں؟"

اس سوال نے اسے ڈنک مارا۔ دیر تک خود کو سنبھالتا رہا۔ پھر بولا "پتا نہیں۔ ایسی کیفیت پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ آپ کو تو پتا ہو گا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔"

"ہاں" وہ بولی "پتا ہے۔ محبت سے جس قدر بائی واقف ہوتی ہے، شائد کوئی اور نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ بائی ہوس کی بدرو کولت پت ہو کر پار ہو چکی ہوتی ہے۔ کامنا سے بے زار ہو چکی ہوتی ہے۔ جسم کے بندھن سے بے نیاز ہو چکی ہوتی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے، ہماری محبت جسم سے بندھی ہے؟"

"پتا نہیں" وہ بولی "لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ آپ ہوس میں لت پت نہیں ہوئے۔ جسم سے بے نیاز نہیں ہوئے۔"

وہ سوچ میں کھو گیا۔ دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

پھر وہ بولا "ایک بات پوچھوں؟"

وہ مسکرائی "نہیں۔ میں برا نہیں مانوں گی۔ پوچھیے۔"

"آپ کو کسی سے محبت ہوئی ہے کیا؟"

"ہاں" وہ بولی "ہوئی ہے۔ ہے۔ رہے گی۔"

وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا "میں نے ناحق آپ کو زحمت دی۔" وہ بولا۔

"خدارا، ناراض نہ ہوں" وہ بولی "مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ آپ پہلے مرد ہیں جو مجھ سے دل کی بات کہہ رہے ہیں۔ آپ پہلے مرد ہیں جس سے میں دل کی بات کہنے میں ہچکچاہٹ

محسوس نہیں کر رہی۔ آپ نے مجھے عورت کی حیثیت دی ہے ورنہ بائی کو فرد کی حیثیت کون دیتا ہے۔ جو بھی ملتا ہے، ہوس کی ڈگڈگی بجانا شروع کر دیتا ہے۔ ہوس کی ڈگڈگی کی لے پر ناچنا ہی ہمارا دھندا ہے۔"

وہ پھر سوچ میں کھو گیا۔ دراصل وہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ مینا ایک ساعت کے لیے ہچکچائی، پھر بولی "پہلے ایک بات کا فیصلہ کر لیجیے۔ کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے یا در پردہ آپ کی خواہش ہے کہ میں آپ سے محبت کروں؟ میرا مطلب ہے کیا توجہ طلبی مقصود ہے؟"

اسے شدید دھچکا لگا۔

وہ اپنی ہی دھن میں کہے گئی "میری دانست میں محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی۔ محبت صرف کی جاتی ہے۔ چاہے دوسرا کرے نہ کرے۔ محبت ایک ہاتھ کی تالی ہے۔ اس میں نہ شکوے کی گنجائش ہے، نہ شکایت کی۔ نہ وفا کی شرط، نہ بے وفائی کا گلہ۔" وہ رک گئی پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولی "محبت لین دین نہیں، صرف دین ہی دین ہے۔" ان جانے میں اس کے منہ سے کراہ سی نکل گئی، جیسے دم رُک رہا ہو۔

اگلے روز کمال رہ رہ کر مینا کی باتوں پر سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ عجیب زاویہ نظر تھا۔ اس نے ایسے کبھی نہیں سوچا تھا۔ مینا کی وہ بات اسے کھا گئی تھی کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں، یا میری توجہ کے طالب ہیں۔

وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ توجہ کا طالب ہے۔ اس کی محبت صرف دین ہی دین نہیں، لین دین ہے۔

اس خیال سے اسے ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ دفعتاً اس کے اندر جذبات کا ایک ریلا اُبھرا۔ زیر لب بولا "نہیں۔ میری محبت توجہ طلبی سے ملوث نہیں ہوگی۔ کبھی نہیں۔"

شام کو اس کا دوست جاہ آ گیا۔ آتے ہی بولا "جی چاہتا ہے ایک بار پھر آساوری چلیں۔ کیا خیال ہے؟"

"بے کار ہے" نواب زادے نے کہا۔

"بے کار؟" جاہ چلایا "اتنی رنگین محفل ہوتی ہے کہ نشہ آ جاتا ہے۔"

"کہیں دل تو نہیں لگ گیا تمھارا؟"

جاہ ہنسا "اونہوں۔ یہ بائیاں دل لگی کی چیز ہیں، دل لگانے کی نہیں۔" پھر دفعتاً اسے یاد آ گیا۔ بولا "پتا ہے، جمال آیا ہوا ہے۔"

جمال ان کا ایک ساتھی تھا۔ بڑا ہی رنگین مزاج تھا۔ محفل میں جان ڈال دیتا تھا۔ لیکن طبیعت اوباشی کی طرف مائل تھی۔ چونکہ تاجر تھا، اس لیے ذہنیت پر تاجرانہ رنگ غالب تھا۔ کمال کو جمال کا کردار

پسند نہ تھا۔ اگرچہ اس نے اپنی ناپسندیدگی کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں جمال کے نام پر ہی دل میں نفرت کی دھار چل جاتی تھی۔

''مجھے ملا تھا'' جاوہ نے کہا'' آپ سے بہت متاثر ہے۔ بڑا احترام کرتا ہے آپ کا۔ دراصل آپ کو اپنا آئیڈیل مانتا ہے۔ پجاری سمجھ لیجیے۔ اب کی بار آساوری جائیں تو اسے ساتھ لے جائیں۔''

''ہوں'' کہہ کر کمال نے بات ٹال دی اور پھر بات کا رُخ بدل دیا۔

اُدھر آساوری میں اُسی روز جب مینا فراغت کے دوران بیٹھی کمال کی باتوں پر سوچ رہی تھی تو سردار بائی آ گئی۔ بولی'' ری نے، رات نواب زادے نے کوئی بات کی؟''

''کیسی بات؟'' مینا نے پوچھا۔

بائی بولی'' وہ تماش بین نہیں دکھتا۔ ضرور کچھ کہنے کے لیے تمہیں بلایا ہوگا۔''

''بس وہی باتیں جو مرد کیا کرتے ہیں۔'' مینا نے بائی کو ٹالنا چاہا۔

سردار بائی مسکرائی۔ بولی'' ری نے، اس بات کو کیا چھپانا جو ماتھے پر لکھی ہو۔ بند بند میں ناچ رہی ہو۔ تُو تو اس بات سے چھلک رہی ہے جو نواب زادے نے رات تجھ سے کی تھی۔''

مینا خاموش بیٹھی رہی۔

بائی بولی'' مجھے پتا ہے تُو نے اپنے دل کا دوار بند کر رکھا ہے، اس لیے کہ تجھے محبت کا روگ لگا ہوا ہے۔ ہم نے قاسم پور صرف اس لیے چھوڑا تھا ری نے، کہ تیرا محبوب وہاں رہتا تھا اور میں ڈرتی تھی کہ تُو کوئی ایسا قدم نہ اُٹھائے کہ واپسی ناممکن ہو جائے۔ اس لیے ہم قاسم پور چھوڑ کر یہاں آ گئے تھے۔''

مینا نے حیرت سے بائی کی طرف دیکھا: اچھا، تو نقل مکانی کی وجہ یہی تھی۔

''دیکھ ری نے'' بائی نے کہا'' تجھے دیکھ کر مجھے اپنی جوانی یاد آ جاتی ہے۔ میں بھی تیری ہی طرح تھی۔ بے پروا، بے نیاز، نڈر۔ مجھے بھی محبت ہو گئی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ میری محبت ایک ہاتھ کی تالی ہے، پھر بھی میں سب کچھ چھوڑ کر اس کے پاس آ گئی تھی۔ اور پتا ہے، ری نے، اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس نے مجھے دھندے پر لگا دیا اور میری کمائی سے اپنی محبوبہ کو عیاشی کرانے لگا۔''

''سردار بائی'' مینا بولی'' مجھے پتا ہے، میرا بھی یہی انجام ہوگا۔ لیکن میں بہت دور نکل آئی ہوں۔ میں نے واپسی کی کشتیاں جلا دی ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ وہ اوباش ہے، ہرجائی ہے۔ لیکن سردار بائی، عورت جب بھی کرتی ہے ذات سے محبت کرتی ہے، صفات سے نہیں۔''

''پتا نہیں، کیا ہونے والا ہے'' سردار بائی نے لمبی آہ بھری'' پر ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ کل ہی میں نے تیرے محبوب کو یہاں دیکھا ہے۔ پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ وہ تو اسی

شہر کا رہنے والا ہے۔ کیا اتفاق ہے۔ آگ سے بچنے کے لیے بھاگے، چولھے میں آ گرے۔"

مینا نے تڑپ کر بائی کی طرف دیکھا۔

"فکر نہ کر" وہ بولی" آج نہیں تو کل تجھ سے ملنے آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ ڈیرے پر۔۔۔ ضرور آئے گا۔ پر تیرے لیے نہیں۔ تفریح کے لیے، دل لگی کے لیے۔"

کمال نے بہت کوشش کی کہ وہ مینا کی محبت سے بے نیاز ہو جائے، لیکن وہ ایسا نہ کر سکا، اور جلد ہی مینا کو گھر بلانے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے بعد وہ دو چار بار ملے۔ جب بھی ملتے کتر کتر باتوں کے ڈھیر لگا دیتے۔ تھک جاتے تو تاش کھیلتے۔ مینا کمال سے شطرنج کھیلنا سیکھتی۔ بار بار چائے پیتے۔ سگریٹ پھونکتے۔ اور پھر سے باتوں میں لگ جاتے۔ یونہی رات گزر جاتی۔ اس دوران میں مینا بار بار کمال سے پوچھتی کہ آپ ڈیرے پر کیوں نہیں آتے۔ اور کمال ہنس کر جواب دیتا "ی نے، میں نے تمھاری خاطر بہت کچھ چھوڑ دیا۔ احساسات، جذبات، خیالات۔ اب ایک جھوٹا وقار باقی رہ گیا ہے۔ وہ تو مجھ سے نہ چھینو۔"

پھر ایک روز دوپہر کے وقت جب وہ کام میں مصروف تھا، تو اس کے خاص ملازم الٰہی بخش نے اسے ایک بند لفافہ دیا۔ کہنے لگا" یہ خط ان کے ڈیرے سے آیا ہے۔" خط میں لکھا تھا:

میری خاطر ایک کام کیجیے۔ بڑی بائی سے کہہ کر مجھے اپنے ہاں بلوائیے۔ آج ہی۔ لیکن کبھی نہ بھیجیے اور میرا انتظار بھی نہ کرنا۔ میں آؤں گی نہیں۔

نیچے نام کی جگہ خالی" م" لکھا ہوا تھا۔

یہ ایک عجیب خط تھا۔ مجھے بلوائیے، لیکن میں آؤں گی نہیں۔ دیر تک وہ سوچتا رہا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ پھر سینے پر چھری سی چل گئی۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ نسیں ڈھنگی کی طرح بجنے لگیں۔ اچھا، تو میری محبت کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ میرے پردے میں کسی سے ملنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔

اس کی ذات کے وقار کو بری طرح ٹھیس لگی۔ سارا دن وہ خود کو سمجھاتا رہا۔ ٹھیک تو ہے۔ یہ تو ایک ہاتھ کی تالی ہے۔ نہ شکوہ نہ شکایت۔ نہ امید نہ توقع۔ لیکن اندر ایک آگ سلگتی رہی۔ ایک شعلہ دل کو چاٹتا رہا۔" جو مزاج یار میں آئے" کا بھرم ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔

سارا دن وہ خود کو سمجھاتا رہا۔ نہیں نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہو گا۔ لیکن ایسا ہوتا رہا۔ ایک بے چینی اسے کھائے جا رہی تھی۔

شام پڑی تو وہ اور بھی مضطرب ہو گیا۔ اضطراب سے اس قدر چھلکنے لگا کہ چھینٹے اڑنے لگے۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ کوئی یہ کیفیت دیکھ نہ لے۔ اگر ابا حضور نے بلا لیا تو؟ اگر امی جان آ گئیں تو؟

اس نے خود کو ایک چغے میں لپیٹا، سر پر کنٹوپ پہنا اور بڑے سے رین کوٹ میں چھپ چھپا کر باہر نکل گیا۔ اسے پتا نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

اس روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کبھی رُک جاتی، کبھی پڑنے لگتی۔ گلیوں میں کیچڑ ہو رہا تھا۔ وہ کیچڑ اور بارش سے بے نیاز چلا جا رہا تھا۔ اس کا احساسِ وقار بری طرح مجروح ہوا تھا۔ اندر سے وہ ایک زخمی پرندے کی طرح تڑپ رہا تھا۔

گلیاں ویران پڑی تھیں۔ لوگ سرِ شام ہی گھروں میں دروازے بند کر کے بیٹھ گئے تھے۔

دفعتہً وہ رُک گیا۔ گلی میں ایک چھجے کے نیچے، سیاہ نقاب میں لپٹی، ایک خاتون دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے کھڑے ہونے کا انداز مانوس سا ہو۔

"کیا میں آپ کی کوئی خدمت۔۔۔؟"

"ارے!" وہ چلائی "آپ ہیں! آپ ادھر کہاں؟"

"اس نے مینا کو پہچان لیا "آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟"

"بارش ہو رہی ہے" وہ بولی۔

"بارش بند کرا دیں کیا؟"

وہ ہنسی "مجھے سامنے والی گلی میں جانا ہے۔"

"تو چلیے۔ میں چھوڑ آؤں۔"

"میں پھسل جاؤں گی" وہ بولی "میرا جوتا خراب ہو جائے گا۔"

"تو چلیے، میں اٹھا کر چھوڑ آؤں۔"

اس نے بڑھ کر اسے بازوؤں میں اٹھا لیا۔

وہ گھبرا گئی۔ کہنے لگی "لوگ دیکھ کر کیا سمجھیں گے؟"

"سمجھیں گے کہ خاتون بیمار ہے۔ معالج کے پاس لے جا رہے ہیں؟"

کچھ دیر کے بعد وہ بولی "رُک جائیے۔"

وہ رُک گیا۔

مینا اس کے بازوؤں سے پھسل کر کھڑی ہو گئی۔ پھر جھک کر آداب بجا لائی "بہت بہت شکریہ۔ خدا حافظ!" یہ کہہ کر وہ دروازے سے مکان میں داخل ہو گئی۔

اتفاقاً کمال کی نگاہ مکان میں لگی ہوئی نیم پلیٹ پر پڑی: صاحبزادہ جمال۔ اس کے سینے میں گویا کسی نے خنجر گھونپ دیا۔ بری طرح سے لڑکھڑایا۔ پھر شرمندگی اور خجالت کے پسینے سے شرابور ہو گیا۔ یہ

ذلت کی انتہا تھی۔

کوئی اور ہوتا تو شاید اسے اس قدر اذیت نہ ہوتی، لیکن جمال ایک خودغرض، اوباش، مطلب پرست، چھوٹا آدمی۔ اس کا رہا سہا وقار خجالت کے پسینے میں بہہ گیا اور اُس نے محسوس کیا جیسے کسی نے اسے اندھیرے کنوئیں میں دھکا دے دیا ہو۔ گردوپیش معدوم ہو گئے۔ ایک نیالے دشت نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر اسے کچھ پتا نہ رہا۔ نہ سمت رہی، نہ رُخ رہا۔ نہ مینا رہی۔

☆

مینا کمرے میں داخل ہوئی تو جمال حیرت سے چلایا "تم آ گئیں! اس بارش میں! میں تو سمجھا تھا تم نہیں آ سکو گی۔"

"دیکھ لو" وہ مسکرا کر بولی "آ ہی گئی۔"

"کمال کر دیا تم نے!"

"آنے والے، آ ہی جاتے ہیں۔" وہ بولی۔

دفعتہً جمال کی نگاہ اس کے جوتے پر پڑی "ارے!" وہ بولا "تمھارے جوتے تو سوکھے ہیں۔ یہ کیسے ہوا؟"

"مجھے وہ چھوڑ گئے ہیں نا" اُس نے جواب دیا۔

"وہ چھوڑ گئے ہیں؟ گاڑی میں چھوڑ گئے ہیں کیا؟"

"نہیں" مینا نے جواب دیا "گاڑی میں نہیں، بانہوں میں اُٹھا کر چھوڑ گئے ہیں۔"

"بانہوں میں اُٹھا کر؟ لیکن کون چھوڑ گئے ہیں؟"

"نواب زادہ کمال" وہ بولی۔

"نواب زادہ کمال!" جمال کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"نواب زادہ کمال!" اسے دھچکا سا لگا "تمھیں چھوڑ گئے ہیں! میرے گھر! بانہوں میں اٹھا کر! نواب زادہ خود!" گردوپیش اس کی نظروں میں دھندلانے لگے۔ دھندلاتے گئے۔ "نواب زادہ کمال!" وہ دیوانہ وار دہراتا رہا "میرے گھر!" پھٹی پھٹی نگاہوں سے وہ مینا کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہ میں مینا دھندلائے جا رہی تھی۔

دفعتہً ایک دھچکا سا لگا، اور مینا معدوم ہو گئی۔

اس نے ایک قہقہہ لگایا "نواب زادہ کمال!" منہ سے جھاگ نکلنے لگے اور وہ دیوانہ وار کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆

انگوا سے رخصت ہوتے وقت جب میں دوبارہ مزاروں پر گیا تو میری توجہ کا مرکز وہ دو رنگا درخت نہ تھا۔ میری نگاہ دونوں مزاروں پر مرکوز تھی۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی درخت کی ٹہنی سے ایک سرخ تلی باندھ دوں۔

بوڑھی عورت بدستور چار دیواری سے ٹیک لگائے، گٹھڑی بنی، اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ دیر تک میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

پھر دفعتہً میرے ذہن میں ایک کرن سی پھوٹی۔ میں نے مدھم آواز میں کہا:

"می نے۔"

وہ یوں تڑپ کر مڑی جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "بیٹا، کیا تم ابھی تک ایک ہاتھ کی تالی بجائے جا رہی ہو؟"

اس کی آنکھوں میں ایک طوفان اُبھر آیا، جیسے سمندر کوزوں میں سما گیا ہو۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

-☆-

سیڑھی سرکار

پتا نہیں، میں سیڑھی سرکار کیسے جا پہنچا۔

مجھ میں ایک اضطراب لہریں لے رہا تھا۔

ایسے لگتا تھا جیسے کوئی سوکھا پتا جھکڑ میں ڈول رہا ہو۔ نہیں۔ میں پتا نہیں تھا۔ میں تو خود جھکڑ تھا۔ منجدھار میں ناؤ نہیں تھا۔ خود منجدھار تھا۔ بیٹھتا تو لٹو کی طرح گھومتا۔ گھومے جاتا۔ چلتا تو شرابی کی طرح ڈولتا، لڑکھڑاتا، جھومتا۔

ایسی حالت میں اللہ نہ کرے کسی کو موٹر سائیکل میسر ہو۔ مجھے تھا، جو جلتی پر تیل چھڑکتا۔ اندر بھی گھاؤں گھاؤں، باہر بھی گھاؤں گھاؤں۔ اندر کا ایکسیلیٹر بھی کھلا، باہر کا بھی۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر غراتا پھرتا۔ بے معنی۔ بے مقصد۔ بے منزل۔

میں نے کئی بار سوچا تھا: الطاف، چھوڑ، اس سائیکل کو کہیں پھینک آ۔ دور بہت دور۔ ورنہ ایک دن یہ سڑک پر لنڈ ورا پڑا ہوگا، اور تیری بوندی یہاں سے وہاں تک بکھری پڑی ہوگی۔

بس سوچتا رہا۔ کچھ کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ کیسے ہوتی؟ اندر چرخیاں چل رہی ہوں تو باہر گڑگڑاہٹ تو ہوگی۔

بظاہر اس اضطراب کی کوئی وجہ نہ تھی۔ میں آزاد تھا۔ مادر پدر آزاد۔ عیش کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ پیسہ عام تھا۔ پیچھے جاگیر تھی۔ یونیورسٹی میں بڑی فیس تھی۔ لڑکے مانتے تھے۔ پروفیسر جانتے تھے۔ لڑکیاں ریجھی ہوئی تھیں۔ دیکھتیں تو منہ سے رال ٹپکتی۔ بس ایک نگاہ التفات کی دیر تھی، پھر یہ اضطراب کیسا؟

نہیں۔ بے وجہ نہ تھا۔ اب جو میں سوچتا ہوں تو وجہ تھی۔ وہ بھی ڈھکی چھپی نہیں۔ سامنے دھری تھی۔

لیکن میں اسے جاننا نہیں چاہتا تھا۔ ماننا نہیں چاہتا تھا۔ ماننا تو تخصیص تھی۔ آزاد منش بھلا اندر کی چھپی ہوئی زنجیروں کو کیسے مانے، ایمنسی پیشن کا دعوے دار اندر کی پھپھوندی کو کیسے مانے۔ دراصل میں ایک نہ تھا، دو تھا، باہر کچھ تھا، اندر کچھ اور تھا۔ دور ہو جاؤ تو تخلو چلتا ہے۔ لٹو گھومتا ہے۔ سمت چھوٹ جاتی ہے۔ پھر بادیہ پیمائی، گھمسن گھیری، زوں زوں، شوں شوں۔ ایک روز چلتے چلتے چونکا۔ رکا۔ جاگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سیڑھی سرکار کے گاؤں کی جانب جا رہا ہوں۔ کہاں شہر کی ریشمی سڑک، کہاں کچا راستہ۔ خود کو روکا۔ یہ کیا کر رہا ہے احمق؟ سنی سنائی پر اعتبار کر لیا؟ خود کا تماشا بنائے گا کیا؟

آٹھ دن کے بعد پھر وہی حادثہ ہوا۔ دیکھا کہ پھر سیڑھی سرکار کی طرف جا رہا ہوں۔ رُک گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر دل میں "سو ہاٹ" کی لہر اٹھی۔ چلو، جو دل اُدھر جانے پر مچلا ہوا ہے تو ٹھیک ہے۔ کون سی قیامت آ جائے گی۔

یہ سارا تخلو دراصل انطو کی وجہ سے تھا۔ اس کا نام انطونیا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی اسے انطو کہتے تھے۔ وہ رومانیہ سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئی تھی۔ جو بھی اسے دیکھتا، کھڑے کا کھڑا رہ جاتا۔ پری زاد نظر آتی تھی۔ کیسے نہ آتی نظر، بھئی کوہ قاف کی جو تھی۔

پہلے روز تو میں بھی اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ پھر میں نے سنبھالا دیا۔ اپنی میں کا بھید یہ تھا کہ لڑکیوں کو گھاس نہ ڈالو۔ وہ پیچھے پھریں، تم نہ پھرو۔۔۔ انطو کو دیکھا۔ پھر منہ موڑ لیا۔ آپ آئے گی سالی۔

اگرچہ دیر کے بعد آئی، مگر آئی۔ پھر ساتھ گھومنے پھرنے لگی۔ کیوں نہ پھرتی؟ دوسروں کے تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ علانیہ ریشہ خطمی ہو جاتے۔ ہم اپنا کلف لگائے رکھتے تھے۔ کھڑ کھڑ کر کے بات کرتے۔

ایک روز بولی "یہ ہوسٹل تو گیلا کمبل ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا مطلب؟"

بولی "ڈیپ اینڈ ڈیپریسنگ۔"

میں نے کہا "وہ تو ہے۔ لڑکیاں لڑکے جدا جدا رہیں گے تو ڈیپ اینڈ ڈیپریسنگ تو ہوگا۔"

بولی "جی چاہتا ہے شہر میں کوئی فلیٹ کرائے پر لے لوں۔"

میں نے کہا "لے لو۔"

بولی "کوئی ساتھی بھی تو ہو جو میرے ساتھ رہے۔"

میں نے کہا "مل جائے گا۔"

بولی "اتنا آزاد خیال کون ہوگا جو میرے ساتھ رہے؟"

''میں نے کہا'' ہم تمھاری پرابلم حل کر دیں گے۔''

بولی'' وہ کیسے؟''

میں نے کہا'' یہ خدمت میں سرانجام دے دوں؟''

بولی'' یو ڈونٹ مائنڈ اِٹ؟''

میں نے کہا'' نو۔ ناٹ می۔''

بولی'' اور دوسرا لوگ؟''

'' نو بل وودم۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔

فلیٹ میں وہ اتنی اچھی ساتھی ثابت ہوئی۔ اتنی اچھی۔ اتنی قریب آ گئی کہ روئیں روئیں میں بس گئی۔ تفریح سنجیدگی میں بدل گئی۔ بات ڈور نکل گئی۔ لیکن اندری اندر، باہروہی کلف لگا رہا۔ بے نیازی کا روپ دھارے رکھا۔

پھر اور لوگ اسے ملنے فلیٹ میں آنے لگے۔

ایک روز بڑی معصومیت سے بولی'' الطی، یو مائنڈ اِٹ۔''

میں نے کہا'' او نو۔ ناٹ می۔''

بولی'' ویٹس گڈ۔ الطی جسم تو اُوپر کی چیز ہے۔ سرسری تعلق۔ اصل تعلق تو دل کا ہوتا ہے۔''

میں نے کہا'' بالکل''۔

'' بولی'' یو ایگری؟''

میں نے کہا'' نو نو۔''

جب اس نے پہلا سرسری تعلق پیدا کیا تو میرے دل پر ایک کرنٹ لگا۔ میں نے دل کو سمجھایا بجھایا: سالے تفریح کو روگ بنا رہا ہے؟ ہشت۔''

دوسرا کرنٹ لگا تو میں ہشت کہنا بھی بھول گیا۔ پھر پے بہ پے لگے تو ساری آزاد خیالی بلبلے بن گئی۔ اندر کا چور بھوت بن کر باہر نکلا۔ اپنی کیٹ دھری کی دھری رہ گئی۔ الطو کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا'' الطو، سٹاپ دِس نانسنس۔''

وہ حیران'' ریئلی الطو، یو مائنڈ اِٹ۔ دیٹ مچ۔''

'' یس، آئی ڈو۔''

'' آئی ام سوساری، الطو۔ بٹ۔'' وہ بٹ کا مفہوم بتائے بغیر رُک گئی۔

شام کو بٹ کا مفہوم واضح ہو گیا۔ وہ فلیٹ چھوڑ کر جا چکی تھی۔ دو چار دن تو میں چوری چوری دل ہی

دل میں انتظار کرتا رہا۔ پھر باہر والی "مَیں" جاال میں آ گئی۔ میں خود کو ڈانٹنے لگا۔ "احمق، یہ محبت تھوڑا ہی تھی۔ یہ تو ایک ارٹجمنٹ تھا۔ تفریح تھی۔ چلی گئی ہے تو چلی جائے۔ اور آ جائے گی۔ تفریح تو رنگا رنگ ہوتی ہے۔ یک رنگی تو بوریت ہوتی ہے۔ یہ تو سمجھو انٹرول ہے۔ تماشا پھر سے شروع ہوگا۔"

لیکن وہ انٹرول جھگڑو بن گیا۔ لٹو گھومنے لگا۔ شرابی لڑکھڑانے لگا۔ موٹر سائیکل نے جلتی پر تیل ڈالا۔ سمت چھوٹ گئی۔ پھر وہی بادیہ پیمائی۔

سارا جھگڑا ادھورا ہونے کی وجہ سے تھا۔ ایک ہوتا تو دُکھ ہوتا۔ جھگڑو نہ ہوتا۔ دُکھ تھا، بہت گہرا۔ مگر میں اسے اپناتا نہ تھا۔ اس لیے جھگڑو چل رہا تھا۔

اس جھگڑو میں کئی ایک آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کسی نے کہا: وہ کسی اور ساتھی کے ساتھ دوسرے فلیٹ میں چلی گئی ہے۔ ایک روز گھومتا پھرتا اُس فلیٹ تک جا پہنچا۔ ایک لمبی سی سیڑھی اوپر تک چلی گئی تھی۔ اوپر دروازہ تھا۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ دن میں گھومتے پھرتے ہر دو تین گھنٹے کے بعد پھر سے وہی سیڑھی آ جاتی۔ کبھی دائیں، کبھی بائیں۔ ساری رات سیڑھیاں چڑھتا رہتا۔ سارا دن سیڑھیوں کو دیکھ کر جی میں آتا کہ چڑھ جاؤں۔ چڑھ جاؤں تو سرسری تعلق ساون کے بلبلوں کی طرح اُڑ جائیں گے لیکن باہر کی "مَیں" ضد کیے بیٹھی رہی۔

چڑھ جاتا تو سیڑھی کے چکر میں نہ پڑتا۔ نہ چڑھا تو ایسا چکر چلا کہ میرے اردگرد چاروں طرف سیڑھیاں ہی سیڑھیاں کھڑی ہو گئیں۔

ایک روز بازار میں سیڑھی سرکار کی بات سن کر کان کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھا، لوگ ہاگ میری بات کر رہے ہیں۔ حیران کہ انھیں کیسے پتا چلا کہ نیچے سیڑھی ہی سیڑھی، اوپر سرکار ہی سرکار۔ بعد میں پتا چلا کہ کوئی اور سیڑھی سرکار ہیں جو عاشقوں کے پیر ہیں۔ اگرچہ میں نے یہ نہیں مانا تھا کہ یہ محبت کی گھمن گھیری ہے۔ پھر بھی دل میں چور تھا۔ اس لیے اَن جانے میں سیڑھی سرکار کی طرف رُخ کرتا رہا۔ اور بالآخر وہاں پہنچ گیا۔

سیڑھی سرکار دراصل شہر کا ایک مضاف ہے۔ چھوٹا سا ایک گاؤں، جس میں سیڑھی سرکار کا مزار ہے۔ مزار بہت فراخ ہے۔ باہر تین ملحقہ چبوترے ہیں، جن پر لوگوں کی بھیڑ رہتی ہے۔ عورتیں زیادہ، ساتھ بچے، مرد کم کم۔ پہلے چبوترے پر جو مزار سے ملحق ہے تین ٹنڈ منڈ درخت ہیں۔ ان کی ٹہنیاں پتوں کی جگہ رنگ برنگی دھجیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے پتوں کی جگہ دھجیاں اُگی ہوئی ہوں۔ یہ دھجیاں لوگوں کی آرزوئیں ہیں، تمنائیں ہیں، محبتیں ہیں، محرومیاں ہیں۔ سب عشق کے بکھیڑے۔

محبوب کی بے رخی، بے وفائی، حالات کی ناسازگاری، ملاپ میں رکاوٹیں۔

سیڑھی سرکار عشق کا پیر ہے۔

درگاہ پر جاؤ، مزار پر سلام کرو، فاتحہ پڑھو، دعا مانگو: سرکار، میری محبت کامیاب کر دے۔ تیرے دربار پر دیگ دوں گا۔ سیڑھی چڑھاؤں گا۔ پھر باہر آ کر کپڑے کی رنگ دار کترن پر اپنا نام لکھو۔ اسے درخت پر باندھو۔ پھر دعا پڑھو۔ منت مانو۔

چبوترے پر چاردیواری کے ساتھ ساتھ سینکڑوں سیڑھیاں لگی کھڑی ہیں۔ میں حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ کیسا چڑھاوا ہے۔ پھر میرے سامنے فلیٹ کی سیڑھیاں آ کھڑی ہوئیں۔ نیچے سیڑھیاں ہی سیڑھیاں۔ اُوپر سرکار۔ پتا نہیں کیوں میں سیڑھی سرکار سے مماثلت سی محسوس کر رہا تھا۔ ویسے میں دو دلا تھا۔ ایک دل چاہتا کہ مزار پر جاؤں: دعا مانگوں، کترن باندھوں، اور پھر فلیٹ کی سیڑھی چڑھ جاؤں۔ دوسرا دل ان ساری باتوں پر تمسخر سے ہنس رہا تھا۔

اس روز سے میرے دل میں ایک لگن لگ گئی کہ سیڑھی سرکار کے بارے میں جانوں وہ کون تھے؟ کیا کرتے تھے؟ کہاں رہتے تھے؟ کیسے سیڑھی سرکار بنے؟ سیڑھی کی ان کی زندگی میں کیا اہمیت تھی؟

سارا دن میں شہر میں آوارہ گردی کرتا، گلیوں میں گھومتا تاکہ سیڑھیاں نظر آئیں۔ مجھے سیڑھی آبسیشن ہو گیا تھا۔ رات کو سیڑھی سرکار پہنچتا اور لوگوں سے پوچھتا پھرتا۔

وہاں سب لوگ سرکار کی کرامتوں سے بھرے پڑے تھے۔ کسی کو علم نہ تھا کہ سرکار کی زندگی کے کوائف کیا تھے۔ انھیں سیڑھی سرکار کیوں کہا جاتا تھا۔

پوچھتے پوچھتے ایک مست سے جا پوچھا۔ وہ بولا "جا، نوری کے پاس جا۔" اور پھر گاؤں کے دوسرے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مست سارا دن چاردیواری سے لگی ہوئی سیڑھیوں سے جان بوجھ کر گرا کرتا تھا۔ پہلے چڑھ جاتا، پھر لڑھکتا۔

نوری بی بی نے میری طرف گھور کر دیکھا، دیکھتی رہی۔ پھر بولی "تو سرکار کی کہانی لکھنا چاہتا ہے؟ کیوں؟"

میں نے جھوٹ بول دیا۔ میں نے کہا "سرکار روز خواب میں آتے ہیں۔ کہتے ہیں: الطاف، اُٹھ، لکھ۔ ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ روز یہی ہوتا ہے۔ وہ میرے سرہانے کھڑے ہو کر اپنا کھونڈ کھڑکاتے ہیں: اُٹھ، لکھ۔"

وہ بہت دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر بولی "اچھا، جو سرکار یہی چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ ویسے ان کی کہانی اس جوگی نہیں کہ سنائی جائے۔ اور کہانی بھی کیا، بس نیچے وہ تھے، اوپر تارا بائی تھی، اور درمیان

میں چوبارے کی اونچی لمبی سیڑھی تھی۔ پہلے دو سال وہ تارا بائی کے لیے چڑھتے رہے۔ پھر دو سال وہ تارا بائی کی سیڑھی سے گرتے رہے۔ پھر وہ اوپر آ بیٹھے۔ تارا نیچے جا بیٹھی۔ پھر نہ تارا بائی رہی نہ وہ رہے۔ نہ میں رہا نہ تُو رہا۔ بس سیڑھی ہی سیڑھی رہ گئی۔ بس اتنی سی تو کہانی ہے"۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

نوری بی بی کی بات سُن کر میں بالکل ہی کنفیوزڈ ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے کہا" میں تو کچھ بھی نہیں سمجھا۔"

وہ مسکرائی۔ بولی" لڑکے، تُو جا۔ پہلے سیڑھی تو چڑھ۔ سیڑھی چڑھنا سیکھ۔ پھر میرے پاس آنا۔ ساری بات سمجھ میں آ جائے گی۔"

میں نے کہا" بی بی، میں تو دو ہوں، ایک نہیں۔ دو ولا سیڑھی کیسے چڑھے؟"

بولی" جب چڑھتے ہیں تو بھی دو دولے ہوتے ہیں۔ پھر گر گر کر ایک ہو جاتے ہیں۔ جب سرکار تارا بائی کی سیڑھیاں چڑھتے تھے تو وہ بھی دو تھے۔ تارا بائی پر اتنے ریجھے کہ ساری جاگیر بیچ کر اسے کھلا دی۔ تارا بائی بھی تو کنڑے کی رانی تھی۔ بڑے بڑے سیٹھ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ اس میں بلا کی بے نیازی تھی۔ سرکار بھی اس بے نیازی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ سب کچھ لٹا کر تارا کے در پر جا بیٹھے۔ ہر چار ایک دن کے بعد وہ تارا کو دیکھنے کے لیے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔ چوبارے کی دہلیز پر پہنچتے تو بائی کے حواری انھیں دھکا دے کر گرا دیتے۔ لڑکھڑاتے ہوئے سیڑھیوں سے گرتے۔ ہڈیاں ٹوٹتیں۔ زخم آتے۔ نیل پڑ جاتے۔ کئی دن زخموں کو سہلاتے رہتے۔ بدن میں پھر سے جان آتی تو پھر سیڑھیاں چڑھنے لگتے۔ پھر دھکے کھا کر لڑھکتے ہوئے نیچے جا گرتے۔

کنڑے کے دکاندار بھاگے بھاگے آتے۔ سرکار کو اٹھاتے۔ روئی سے زخم دھوتے۔ دوائیاں لگاتے۔ پٹیاں باندھتے۔

ایک روز جب سرکار سیڑھیاں چڑھ کر چوبارے کی دہلیز پر پہنچے تو اتفاق سے تارا خود دروازے کے پاس کھڑی تھی۔

تارا نے بڑے ترس سے سرکار کی طرف دیکھا۔ سرکار ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتے رہے۔

تارا بولی" بابا، کیوں خوانخواہ دھکے کھاتے ہو۔ ہڈیاں تڑواتے ہو۔ مجھے دیکھنا ہے تو دیکھ لو۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔ جی بھر کر دیکھ لو۔"

سرکار نے کہا" تو کون ہے؟" یہ کہہ کر نوری بی بی چپ ہو گئی۔

مجھے یوں لگا جیسے ساری کائنات چپ ہو گئی ہو۔ صدیاں بیت گئیں۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ بولی "بس اس ایک جملے نے تارا کو ریزہ ریزہ کر دیا۔"

ہوش آیا تو تارا اُن کی اُنگلی پکڑ کر اس گاؤں میں لے آئی۔ تارا کے سارے جسم پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ ہڈیاں سوجی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ زخم تھے۔ سرکار دوا لگایا کرتے۔ زخم دھوتے۔ پٹیاں باندھتے۔ لیکن جب بھی تارا ان سے بات کرتی تو وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتے۔ پوچھتے ''تو کون ہے؟''

-☆-

گرداس۔ داس گرو

سدگلد بپ کے مہاراج رانی شکنتلے دیوی کے پاس بیٹھے تھے۔ دفعتاً انھوں نے سر اٹھایا۔ بولے
"مہارانی کچھ دنوں سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمارے پاس ہوتے ہوئے بھی ہمارے پاس نہیں ہوتیں۔ یوں لگتا ہے جیسے تم بٹ گئی ہو۔ ایک نہیں رہیں۔ تمھیں کس بات کی چنتا ہے؟"
مہارانی بولی "ہاں، مہاراج۔ یہ سچ ہے کہ مجھے چنتا لگی ہے۔ پر مہاراج، بات اتنی چھوٹی ہے کہ آپ سن کر ہنس دیں گے۔"
مہاراج مسکرائے، بولے "شکنتلے، سیانے کہتے ہیں، بڑی چنتائیں گھن گرج کر آتی ہیں، اور چلی جاتی ہیں۔ بے شک جھنجھوڑتی ہیں، پر کچھ زیادہ نہیں بگاڑتیں۔ لیکن چھوٹی چنتائیں جونک کی طرح لگ جاتی ہیں۔ پتا بھی نہیں چلتا کہ لگی ہوئی ہیں۔ سوامی واسدیو کا کہنا ہے کہ چھوٹی چنتاؤں سے ڈرو۔ انھیں بھیتر میں نہ پالو۔ باہر نکالو۔ انھیں جانو۔ مانو۔ اپناؤ۔ اپنا لو تو دور ہو جاتی ہیں۔ نہ اپناؤ تو چمٹی رہتی ہیں۔"
"آپ سچ کہتے ہیں، مہاراج" مہارانی نے جواب دیا "پر بات میری اپنی نہیں، راج کماری کی ہے۔"
"راج کماری کی؟" مہاراج نے دہرایا۔
"ہاں مہاراج" مہارانی نے جواب دیا "کچھ دنوں سے میں دیکھ رہی ہوں کہ راج کماری کا پاؤں چلے ہے۔ یوں چلے ہے، مہاراج، جیسے انڈا اچھلتے ہوئے تیچ چلتا ہے۔"
"بے وجہ؟" مہاراج نے پوچھا۔
"بے وجہ" مہارانی نے کہا "جب راج کماری بیٹھی پڑھ رہی ہوتی ہے یا آرام سے لیٹی ہوتی ہے تو اس کا دایاں پاؤں آپ ہی آپ چلتا رہتا ہے۔ اور مہاراج، اسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ پاؤں چل رہا

ہے۔"

یہ سن کر مہاراج کا ماتھا ٹھنکا۔ کچھ دیر تک سر جھکائے سوچ میں پڑے رہے۔ پھر بولے "اس لیے تو نہیں کہ راج کماری جوان ہوگئی ہے؟"

"پتا نہیں، مہاراج" مہارانی نے جواب دیا "آج کل کے نوجوانوں کے ڈھنگ کچھ اور ہی ہیں۔ سُر اور ہے، تال اور ہے، رنگ اور ہے۔"

"ہوں" مہاراج پھر سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے "کہیں ایسا تو نہیں کہ راج کماری پریم کے بندھن میں بندھ گئی ہو؟"

"نہیں، مہاراج۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"وشواس سے کہہ رہی ہو، شکنتلے؟"

"ہاں، مہاراج۔ پریم ایک ایسا بندھن ہے، مہاراج، جو چھپائے نہیں چھپتا۔ پھر یہ بھی ہے، مہاراج، کہ نئی پوچ کو بندھن سے چڑ ہے۔ کوئی بندھن ہو، کیسا بھی ہو، باہر کا ہو یا بھیتر کا، انھیں گوارہ نہیں۔"

مہاراج کے دل میں اک پھانس لگ گئی۔ سوچ میں پڑ گئے۔ کس سے پوچھیں؟ ایسے سے انھیں سوامی واسدیو یاد آیا کرتے تھے۔ وہ مہاراج کے گرو تھے۔ ہر بات میں سہارا دیتے۔ ہر الجھن میں راستہ دکھاتے۔ کڑی دھوپ میں سایہ بن جاتے۔ گھور اندھیرے میں دیے سمان ٹمٹماتے۔ لیکن آٹھ برس ہوئے وہ سنگلدیپ چھوڑ کر جا چکے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے ساری دنیا کے پوتر استھانوں کے درشن کر لیں۔ سوامی بہت بوڑھے تھے۔ چلنا مشکل تھا۔ اس لیے ان کے چیلے گردواس نے انھیں اپنی پیٹھ پر اٹھا کر یاترا کرانے کا عہد کیا تھا۔ آٹھ سال سے وہ لاپتا تھے۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔

ایک روز مہاراج نے اپنے وزیر مسٹر منگل رائے سے برسبیل تذکرہ پوچھا "رائے جی، یہ بتایئے، کیا یہ ممکن ہے کہ جسم کا ایک حصہ تو مسلسل حرکت میں رہے لیکن ذہن کو پتا ہی نہ ہو، خبر ہی نہ ہو؟"

رائے مہاراج کے منہ سے یہ بات سن کر ٹھٹھکے۔ بولے "مہاراج، پوری بات کہیے۔ ادھوری سے آپ نے مجھے کنفیوز کر دیا ہے۔"

مہاراج نے کہا "رائے جی، ایک لڑکی کا پاؤں چلتا ہے۔ یوں چلے جاتا ہے۔ جیسے نیلی چڑیا کی دم چلتی ہے یا جیسے انجن کا پسٹن چلتا ہے۔ اور لڑکی کو خبر ہی نہیں ہوتی۔"

رائے یہ سن کر گھبرا گیا۔ بولا "مہاراج، آپ نے یہ بات کس سے سنی؟"

اس سوال پر مہاراج خود حیران رہ گئے۔لیکن خاندانی راجا تھے۔جانتے تھے کہ راجا کو سُننا زیادہ چاہیے،بولنا کم کم۔اس لیے چپ رہے۔

رائے بولا" مہاراج،ایک برس ہوا کہ میں نے کالج کی ایک لڑکی سے بیاہ کیا تھا۔بیاہ کے دو مہینے بعد میں نے اتفاقاً دیکھا کہ میری بیوی کا پاؤں چلتا رہتا ہے۔اَن جانے میں چلتا رہتا ہے۔اس پر میں گھبرا گیا۔سوچا،شاید وہ ناخوش ہے اور پاؤں کا چلنا ناخوشی کا اظہار ہے۔میں نے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ویدوں سے پوچھا۔وہ بولے:شاید یہ گھومنے پھرنے کی دبی دبی خواہش کا اظہار ہو۔تو مہاراج میں نے اپنی بیوی کو باہر بھجوا دیا کہ اسے خوب گھماؤ پھراؤ۔"

"ہوں" مہاراج کی دلچسپی بڑھی" پھر؟"

"چھ مہینے دنیا میں گھومنے پھرنے کے بعد جب وہ گھر لوٹی تو اس کا پاؤں پہلے سے بھی زیادہ چل رہا تھا۔

وزیر کی بپتا سن کر مہاراج بالکل ہی کنفیوزڈ ہو گئے۔وہ سوچتے،یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جسم کا ایک حصہ یوں اضطراب میں،شدت سے،چلے اور ذہن کو خبر ہی نہ ہو۔بھگوان نے یہ کل جسے انسان کا جسم کہتے ہیں،ایسی بنائی ہے جس کا جواب نہیں۔اس کا ہر حصہ دوسرے حصے سے جُڑا ہوا ہے۔پھر اگر پاؤں چلے تو ضرور نسیں بھی چلتی ہوں گی۔آنتیں بھی چلتی ہوں گی۔اندر ایک جھکّو چل رہا ہوگا۔ایسے میں خبر نہ ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے!

اسی رات راج بھون میں ایک سادھو آ گئے۔مہاراج نے راج بھون کے ساتھ ہی پھوس کی چار ایک کٹیائیں بنا رکھی تھیں،جن میں وہ بھگتوں،سادھوؤں اور یوگیوں کو مہمان رکھا کرتے تھے۔نوکروں کو حکم تھا کہ ان کی سیوا میں ذرا فرق نہ آئے۔

مہاراج خود ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے۔حسبِ دستور اس رات وہ سادھو کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ہاتھ جوڑ کر" جی آیاں نوں" کیا۔سادھو نے پاس بٹھا لیا۔سادھو نے چھٹتے ہی کہا" راجا جی،یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟ مکھ پر چِنتا نے جالا بُن رکھا ہے۔اگر یہ چنتا پرجا کی ہے تو ٹھیک ہے۔جو اپنی ہے تو ٹھیک نہیں۔راجا تو سیوا کار ہوتا ہے۔راج پاٹ تو ایک اوٹ ہے۔"

"ہاں،مہاراج،چنتا ہے اور وہ اپنی ہے" مہاراج نے جواب دیا" میری پُتری جوان ہے۔اس کا پاؤں چلتا ہے۔چنتا کی کوئی بات نہیں۔پھر بھی چنتا ہے۔"

سادھو ہنسنے لگا" ہاں،نئی پوچ کا یہی حال ہے۔چنتا کی کوئی بات نہیں،پھر بھی چنتا ہے۔جلدی کی کوئی جرورت نہیں،پھر بھی جلدی ہے۔ہلچل کی لوڑ نہیں،پھر بھی ہلچل ہے۔"

"ایسا کیوں ہے، مہاراج؟" راجا نے پوچھا۔

سادھو نے اپنی ٹھوڑی ٹیک پر رکھ لی اور نگاہیں دور گاڑ دیں۔ بولا "سمے کا چمتکار ہے، مہاراج۔ سمے کی لیلا ہے۔ اک سمے آتا ہے جب لوگ عقل کے پروانے بن جاتے ہیں۔ دلیل کو مانتے ہیں۔ شدھ بدھ کو اُتم جانتے ہیں۔ اس شدھ بدھ کو جو وشواس کو نہیں، پرنتو شک شبہے کو ابھارتی ہے۔ وہ کیوں، کیسے، کس لیے سوچتے ہیں۔

"دوجا سمے آتا ہے جب عقل کا نٹ ٹوٹ جاتا ہے۔ دل کی دھڑکنیں اُبھر آتی ہیں۔ وشواس جاگتا ہے۔ شک شبہے جھاگ بن کر اُڑ جاتے ہیں۔ راجاجی، اب وہ سمے نہیں جب تم پل کر جوان ہوئے تھے۔ وہ سمے بیت گیا۔ نیا نکور سمے آیا ہے۔ پرنتو تم راجا ہو۔ تمھیں کیا خبر کہ کیسا سمے آیا ہے۔"

راجا بولا "سادھو مہاراج، میں اتنا بے خبر نہیں ہوں۔"

"کھنتہ نہ کھاؤ، مہاراج" سادھو بولا "ہر بادشاہ، ہر راجا بے خبر ہوتا ہے۔ اسے خبر اَوش پہنچتی ہے، مگر وہ چھلنی میں چھانی ہوئی خبر ہووے ہے۔"

"چھلنی کیسی، سادھو مہاراج؟" راجا نے پوچھا۔

"دیکھو، مہاراج" سادھو نے کہا "ہر راجا کے گرد جی حضوریوں کا گھیرا ہوتا ہے۔ ان کا کام راجا کو پرسن رکھنا ہوتا ہے۔ یوں کہ جو راجا سننا چاہے، وہی اسے سنایا جائے۔ جو وہ دیکھنا چاہے، وہی اسے دکھایا جائے۔ جو نہ دیکھنا چاہے، نہ سننا چاہے، وہ چھان کر پھینک دیا جائے۔ اس پر پردہ ڈال دیا جائے۔

"ویسے بھی، مہاراج، راجا کو پرجا کی خبر نہیں ہوتی۔ کارن یہ کہ پرجا پہیے سمان ہوتی ہے۔ وہ گھومن میں پڑی رہتی ہے۔ راجا اس پہیے کا دُھرا ہوتا ہے۔ بیچ کا نقطہ۔ وہ گھومتا نہیں۔ قیم رہتا ہے۔ اسی کارن پرانے راجا اور بادشاہ راتوں کے سمے بھیس بدل کر گھوما پھرا کرتے تھے۔ یہ جانن کے لیے کہ پرجا کس حال میں ہے، کس رنگ میں رنگی ہے، کس چال میں چلے ہے۔"

راجا نے سادھو جی سے کہا "مہاراج، ہمارے گھرانے میں پرانی ریت ہے کہ بچے جوان ہو جائیں تو انھیں کچھ دنوں کے لیے آشرم میں بھیج دیتے ہیں تاکہ کس بل نکل جائیں۔ آپ کہیں تو میں اپنی بٹری کو۔۔۔"

سادھو نے مہاراج کی بات کاٹی۔ بولا "نہ نہ نہ۔ آشرم میں ان کو بھیجتے ہیں جن میں پیچھے چلنے کی شکتی ہو۔ جو گرو کو جانتے ہوں۔ گرو دیتا کو مانتے ہوں۔ نئی پوچ میں پیچھے چلنے کا حوصلہ نہیں۔ وہ خود کو دوجے کے حوالے نہیں کر سکتے۔ وہ آگے چلنے کی اُکسا لیے ہوئے ہیں۔ پر کوئی بات نہیں۔ جس نے یہ

لیے آسمان کی طرف تکتا رہا۔ پھر کہنے لگا "نراش نہ ہو، مہاراج۔ تیرے گرو سوامی داس دیو اپنی یاترا پوری کر چکے ہیں۔ وہ پہنچنے والے ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

مہاراج کو سادھو کی باتیں بہت دل لگیں۔ ان کے دل میں پرجا کے متعلق اپنی بے خبری کا احساس اُبھرا۔ ان کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ میں بھی بھیس بدل کر نگر میں گھوموں پھروں اور لوگوں کا حال چال جانوں۔ دقت یہ تھی کہ مہاراج میں اکیلے گھومنے پھرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی ساتھی ہو۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے انھیں انجنا یاد آ گئی۔ انجنا سنگلدیپ کی اونچی نائیکا تھی۔

مہاراج اسے ان دنوں سے جانتے تھے جب وہ خود راج کمار تھے، اور انجنا کی جوانی کی بوتل نئی نئی کھلی تھی۔ نشوں کا عالم تھا۔ بلبلے اٹھتے تھے۔ پھوار اڑتی تھی۔ چوبارے میں آنے والے تو کیا، سارے شہر والے بھیگے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں انجنا کی ناؤ سمان ڈولنے والی آنکھوں سے مہاراج مدھ کے پیالے پیا کرتے تھے۔

تعلق بھی کیا چیز ہے۔ پہاڑی چشمے کی طرح کہاں سے پھوٹتا ہے اور پھر ندی نالہ بن کر کدھر کو بہہ نکلتا ہے۔ انجنا سے مہاراج کا ناتا دل لگی اور خوش وقتی کے لیے جڑا تھا، جو چلتے چلتے جیون ساتھ بن گیا۔ اب انجنا ان کی دوست تھی، ساتھی تھی، سب کچھ تھی۔ جو بات وہ کسی اور کے منہ سے نہیں سن سکتے تھے، انجنا کے منہ سے سنتے، سر دھنتے۔

وہ بوڑھی ہو کر نائیکا بن گئی تھی۔ یہ عمر رسیدہ ہو کر، مہاراج۔ دونوں جوں جوں عمر رسیدہ ہوتے گئے تھے تعلق توں توں بڑ کے درخت کی چھاؤں بنتا گیا تھا۔ گھنی ٹھنڈی چھاؤں۔

بائی بھی عجب مخلوق ہوتی ہے۔ اسے محبوبہ بنا لو تو وہ تم سے کھیلے گی۔ تگنی کا ناچ نچائے گی۔ جلتی پر تیل چھڑکے گی۔ سانس لینے نہ دے گی۔ ماں بنا لو تو تمھاری پاکیزگی کی ضامن ہو جائے گی۔ تمھیں بچا بچا کر رکھے گی۔ اس فکر میں گھلتی رہے گی کہ داغ نہ پڑ جائے۔ دھبا نہ آ جائے۔ ساتھی بنا لو تو تمھارے سر پر بڑ کا درخت بن کر تن جائے گی۔ چھاؤں ہی چھاؤں۔ گھنی چھاؤں۔ خوشبودار چھاؤں۔

رات پڑی تو مہاراج نے بھیس بدلا۔ وہ جب بھی انجنا کے ہاں جاتے، بھیس بدل کر جاتے۔ بائی کے چوبارے میں صدر دروازے سے نہیں، بغلی دروازے سے داخل ہوتے۔

بائی نے جب مہاراج کی آمد کا سنا تو اس نے نخمی، گنڈی اور گلابی کو ہدایات دیں کہ محفل جاری رہے، رقص کی لے بڑھتی جائے اور نرت میں آنکھیں یوں کنکھیوں سے نکل نکل کر باتیں کریں کہ تماش بینوں کے لیے سانس لینا دشوار ہو جائے۔ اور خود پچھلے دالان میں مہاراج کے پاس آ بیٹھی۔

مہاراج پہلے بائی سے ادھر اُدھر کی پوچھتے رہے۔ اصلی بات کھولنے سے پہلے رمی فیتے کناریاں ٹانکتے رہے۔ بائی کا ئیاں تھی اتنے سارے دلوں سے کھیل چکی تھی۔ جانتی تھی کہ باہر کی بات کیا ہوتی ہے، بھیتر کی کیا ہوتی ہے۔ بولی "اے حضور، اب اصلی بات پر آیئے۔ کیسی چنتا لگی ہے؟"

مہاراج ہنس کر بولے "چنتا ہی کو دور کرنے کے لیے تمھارے دوار آئے ہیں۔"

بائی مسکائی "اے حضور، ہم بائیاں چنتائیں دور نہیں کرتیں۔ انھیں پیدا کرتی ہیں۔ اُبھارتی ہیں۔ یوں کہ ان کا تار بندھا رہے۔"

مہاراج نے کہا "اُنجنا، یہ چنتا ہماری نہیں، ہماری پُتری کی ہے۔"

وہ سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئی "کیا ہوا راج کماری کو؟"

"اس کا پاؤں چنتا ہے" مہاراج نے کہا۔

"پاؤں چنتا ہے! یہ تو چنتا کی بات نہیں۔ گھر گھر یہی حال ہے۔ جوان لڑکیوں کے پاؤں یوں چلتے ہیں جیسے گھڑی کا پنڈولم چلتا ہے۔"

"اُنجنا، ان جانے میں چلتا ہے" مہاراج نے کہا۔

"جانے میں تو اتنی تیزی سے چل ہی نہیں سکتا، حضور۔"

"سیانے کہتے ہیں، گھٹن کی وجہ سے چلتا ہے۔"

"نہیں، حضور، ایسا نہیں۔ اب میرا ہی گھر لیجیے۔ یہاں کیا گھٹن ہوگی۔ پر میری سب سے چھوٹی نوچی جو ہے، اس کا پاؤں چلتا ہے۔ میں نے نچوا نچوا کر اس کا پلیتھن نکال دیا۔ پھر بھی چلتا ہے۔ ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا: باجی، میں داس آشرم ہو آؤں؟"

"داس آشرم؟" مہاراج نے دہرایا "یہ کیسا آشرم ہے؟"

"وہ نوجوانوں کا آشرم ہے۔ وہاں جو تھسوی بیٹھا ہے۔ وہ بھی نوجوان ہے۔ وہ خود کو گرو نہیں، بلکہ داس کہتا ہے۔ وہاں وہ نوجوان جاتے ہیں جن کے پاؤں چلتے ہیں۔ نسیں چلتی ہیں۔ دل چلتے ہیں۔ وہاں کوئی روک ٹوک نہیں۔ نوجوان جو جی چاہے، کرتے ہیں۔ ناچتے ہیں۔ گاتے ہیں۔ دارو پیتے ہیں۔ تاش کھیلتے ہیں۔ جب گرو ہی کوئی نہیں تو حضور، بندش کیسی۔ نوجوان وہاں رہنا چاہیں تو نیلے پر کھلے میدان میں پھوس کا جھونپڑا بنا لیتے ہیں۔ بس داس کا ایک مطالبہ ہے کہ رات کے وقت لڑکیاں لڑکوں میں نہ رہیں۔ الگ جھونپڑے میں چلی جائیں۔"

مہاراج بولے "اُنجنا، چلو، ہم بھی وہاں چلیں۔"

"حضور، میرا خود ہی جی چاہتا ہے کہ جا کر دیکھوں۔"

''پھر سوچتی کیا ہو؟''

''وہ ہمیں وہاں نکلنے نہیں دیں گے۔ عمر رسیدہ لوگوں کے لیے داس آشرم کے دوار بند ہیں۔''

''نہ نکلنے دیں'' مہاراج نے کہا'' چلو، ایک نظر ہی دیکھ لیں گے۔ ایک سادھو مہاراج راج بھون آئے تھے۔ کہتے تھے: راجا کو پرجا کے حال کا پتا نہیں ہوتا۔ جو خبر ملتی ہے وہ چھلنی میں چھانی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لیے راجا پر لازم ہے کہ بھیس بدل کر باہر نکلے۔ پرجا کے رنگ ڈھنگ، دکھ درد اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ انجنا، تم میری ساتھی ہوگی؟''

انجنا ہنسی، بولی'' اے حضور، بائی صرف دو کام جانتی ہے۔ ایک تو لوگوں کو لوٹنا۔ انھیں بے وقوف بنانا۔ مونڈنا۔ نچوڑنا۔ اور دوسرے ساتھ دینا۔ تن من دھن سے ساتھ دینا۔ حضور، یہاں بس لوٹنے کا ہی کام ہے۔ میں تو ترسی ہوئی ہوں کہ کوئی ہو جس کا ساتھ دے سکوں۔''

انجنا اور مہاراج دونوں نے گیروے کپڑے پہنے، سادھو سادھنی کا رنگ جمایا اور داس آشرم کو چل پڑے۔ داس آشرم مایا نگر کے پاس ڈنگے ٹبے کی چوٹی پر واقع تھا۔ جب وہ ڈنگے ٹبے کے اوپر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بہت کھلا میدان ہے، جس میں یہاں وہاں بہت سے گھنی چھاؤں کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ درختوں کی چھاؤں میں بیس پچیس پھوس کے جھونپڑے بنے ہوئے ہیں۔ جھونپڑوں کے سامنے، میدان میں، نوجوان ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک ٹولی گانے میں مصروف ہے، دوسری ناچ رہی ہے۔ ایک ٹولی سردائی گھوٹنے میں مصروف ہے۔

سادھو سادھنی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر سب متوجہ ہو گئے۔ گانا بجانا چھوڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ دیکھ کر داس کا بالکا دوڑا ان کے پاس آیا۔ ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ بولا'' سادھو، سادھنی جی، جی آیاں نوں۔ پرنتو کوئی بھول ہے۔ یہ استھان سادھوؤں کے لیے نہیں۔''

سادھنی بولی'' مہاراج، ہم بھول سے ادھر نہیں آئے۔ ہمیں آشرم کے گرو سے ملنا ہے۔''

''نہ، مہاراج'' بالکے نے جواب دیا'' یہاں کوئی گرو نہیں۔ یہ آشرم نہیں، چھوٹوں کی منڈلی ہے۔ چھوٹوں کے داس اُدھر اُس کٹیا میں بیٹھے ہیں۔''

''بس ہمیں انھیں سے ملنا ہے۔ گھبراؤ نہیں، ہم یہاں ٹکیں گے نہیں۔ داس سے ملنے کی آگیا دو۔''

''نہ، سادھنی جی۔ یہاں کوئی آگیا نہیں دی جاتی۔ یہاں کوئی روک نہیں، ٹوک نہیں۔ جب گرو ہی نہیں تو روک ٹوک کیسی۔ یہاں کوئی دوار بند نہیں۔ سب کھلے ہیں۔ وہ سامنے رہا، داس جی کا دوار۔ پدھاریے، سادھو، سادھنی جی۔''

داس ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ بال لٹ پٹ۔ ڈاڑھی گھنی، بھور کالی۔ گیروے رنگ کی جبین اور

تیس۔ آنکھیں مدھ سے مخمور۔ سادھو سادھنی کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ انھیں چٹائی پر بٹھایا۔

سادھنی بولی "یہ کیسا آشرم ہے، مہاراج؟"

داس نے جواب دیا "یہ آشرم نہیں، سادھنی جی، منڈلی ہے۔"

"آشرم نہیں منڈلی ہے۔ گرو نہیں داس ہے۔ یہ کیسا بھید ہے، مہاراج؟"

داس بولا "بس یہی ایک بھید ہے کہ کوئی بھید نہیں۔ اس سنسار کی طرح سادھنی جی، بھید سامنے دھرا ہے۔ لوگ سامنے دھرے کو نہیں دیکھتے۔ کہتے ہیں، بھید ضرور چھپا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ڈھونڈ میں لگے ہیں۔ پربھو نے سامنے دھر کر بھید کو چھپا لیا ہے۔"

"سچ کہتے ہو، داس جی" سادھو گنگنایا۔

سادھنی بولی "بات کھلی نہیں، داس جی مہاراج۔ آپ نے یہ روپ کیوں بدل دیے؟ آشرم کو منڈلی بنا دیا۔ گرو کو داس بنا دیا۔ مہاراج، مدھ تو ایک ہی ہے۔ یہ پیالہ کیوں بدل دیا؟"

"سچ ہے، سادھنی، مدھ تو ایک ہی ہے۔ پر ٹھوٹھے بدلتے رہتے ہیں۔ جیسا سمے ویسا ٹھوٹھا۔ پرانے سمے میں لوگ کہتے تھے: کوئی آگے چلے۔ راستہ دکھائے۔ گرو بنے۔ اب سمے بدل گیا ہے۔ پیچھے چلنے والے لوگ نہیں رہے۔ اب ایسا گرو چاہیے جو پیچھے چلے۔"

"داس جی" سادھو بولا "ایسا کیوں ہے کہ آج کے لوگ پیچھے چلنے والے نہیں؟"

داس مسکرایا۔ بولا "سادھو جی مہاراج، آگے پیچھے کو بھول جاؤ۔ آگے پیچھے کا وشواس ہم نے خود باندھ رکھا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہاں نہ کوئی آگے ہے، نہ پیچھے ہے۔ یہ دیکھو کہ وہ چلنے والے ہیں۔ ان میں چلنے کی لگن ہے۔ ان میں ڈھونڈ ہے۔" وہ رک گیا۔ پھر بولا "مہاراج، جب پرانی راہیں پٹ جاتی ہیں تو پربھو ڈھونڈ کی جوت جگاتے ہیں۔ اور مہاراج، ڈھونڈ اندھی ہوتی ہے۔ آگا پیچھا نہیں دیکھتی۔ بُرا بھلا نہیں دیکھتی۔ انھوں نے کیا نہیں آزمایا۔ دیس تیاگا۔ دولت تیاگی۔ آرام تیاگا۔ ڈگر ڈگر گھومے۔ نشہ اپنایا۔ اب وہ حرکت کی بھینٹ چڑھے ہوئے ہیں۔ جلدی کے چکر میں پڑے ہیں۔ ان کی راہ روکو۔ جنھیں نئی راہ ڈھونڈنا ہوتی ہے انھیں روک سکتے نہیں۔ روکو گے تو ان کے دل چلیں گے، نسیں چلیں گی، پاؤں چلیں گے، وچار چلیں گے۔" داس خاموش ہو گیا۔ کٹیا میں گہری خاموشی چھا گئی۔

"ایک بات پوچھوں، داس مہاراج؟" سادھنی نے خاموشی کو توڑا۔ داس نے سر اٹھایا۔

سادھنی بولی "آپ کا گرو کون ہے؟"

"میرے پتا جی" داس نے کہا۔

''وہ کہاں ہیں؟''

''پتا نہیں'' داس بولا ''جب میں سترہ سال کا تھا، وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انھوں نے پرتگیا کی تھی کہ اپنے گرو سوامی واسدیو کو اپنی پیٹھ پر لاد کر دنیا بھر کے پوتر استھانوں کی یاترا کرائیں گے۔''

''تم۔۔۔تم۔۔۔!'' سادھو حیرت سے بولا ''تم گرو داس کے پتر ہو؟''

''جی، مہاراج'' داس نے جواب دیا ''میرے پتا بہت بڑے داس تھے۔ انھوں نے مجھے داس بننا سکھایا۔ وہ گرو کے داس تھے۔ میں چیلوں کا داس بنوں گا۔ راہ تو ایک ہی ہے۔ چاہے آگے چل کر راہ دکھاؤ۔ چاہے پیچھے چل کر راہ پر لاؤ۔''

''دھن ہو، مہاراج'' سادھو ہاتھ جوڑے فرطِ جذبات سے اُٹھ بیٹھا۔

عین اس وقت باہر میدان سے اک شور بلند ہوا۔ کٹیا میں خاموشی چھا گئی۔ سب کی توجہ شور پر لگی تھی۔ پھر بالک دوار پر آ کر چلایا ''مہاراج، آپ کے پتا جی پدھارے ہیں۔''

''میرے پتا جی!'' داس نے دہرایا اور وہ کٹیا سے باہر نکل گیا۔ پیچھے پیچھے سادھو اور سادھنی تھے۔ سامنے بڑ کے درخت تلے ایک شخص بیٹھا تھا۔ اُس نے اپنے بڈھے گرو کو پیٹھ پر اُٹھایا ہوا تھا۔

درخت کے قریب پہنچ کر سادھو نے ہاتھ جوڑے ''سوامی واسدیو جی مہاراج۔''

سادھنی نے چیخ ماری۔ ''وہ دیکھو! وہ دیکھو!'' وہ چلائی۔ ''گرو کا دھڑ سوکھ کر چیلے کے گرد لٹکا ہوا ہے اور چیلے کا سر سوکھ کر گرو کی چھاتی پر ڈھلکا ہوا ہے۔''

''بھگوان کی لیلا ہے'' داس بولا ''جس چیز کی لوڑ نہ تھی وہ سوکھ کر جھڑ گئی۔ داس کا سر، گرو کا دھڑ، دو جسم ایک بن گئے۔''

بالکا چلایا ''مہاراج، آج گرو اور چیلے کا بھید کھل گیا۔''

''ابھی نہیں'' سادھنی بولی ''اس بھید نے نیا چولا بدل لیا ہے۔ گرو چیلوں کا داس بن گیا ہے۔''

-☆-

نینی اور عفریت

زندگی کا عظیم ترین واقعہ، چھوٹے چھوٹے معمولی واقعات کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ایک چھوٹا سا چشمہ پھوٹتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شوریدہ سر دریا بن کر آپ کی شخصیت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔

وہ اچانک رونما ہوتا ہے، ایسے وقت جبکہ نہ خواہش ہوتی ہے نہ آرزو، نہ اُمید نہ توقع۔ آپ دروازے بند کر چکے ہوتے ہیں۔ اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔ جب آپ بھرپور زندگی بتا چکے ہوتے ہیں، خود سے مطمئن، تکمیل کے احساس سے سرشار۔

اس وقت وہ اچانک رونما ہوتا ہے اور آپ کی شخصیت کے اس شاندار ایوان کو جسے آپ نے سال با سال ایک ایک اینٹ رکھ کر تعمیر کیا تھا، ایک جھٹکے میں مسمار کر دیتا ہے۔

اور پھر جو آپ دیکھتے ہیں تو۔۔۔ کیا دیکھتے ہیں کہ آپ ملبے کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

میں نے بڑی بھرپور زندگی گزاری تھی۔ جوانی میں جذبات کی ایک بھیڑ لگائے رکھی۔ میلہ لگائے رکھا۔ پٹاخے چھوڑے، پھلجھڑیاں چلائیں، ہولیاں کھیلیں، رنگ پچکاریاں چلائیں، ابیر گلال کے تھال بھرے۔

میں جذباتی تھا، شدت پسند تھا۔ جذبات اور شدت میری دانست میں خلوص کے مظہر تھے۔ میرا رخ مثبت تھا، خلوص بھرا، ہمدردی بھرا، حقارت اور نفرت سے پاک۔ میں کہہ دینے والا تھا۔ گونگے اور ٹھنڈے خون والے مجھے پسند نہ تھے۔

میں نے علم حاصل کیا تھا۔ نفسیات میں مجھے دسترس تھی۔ تحلیل نفسی میں خاصی اہلیت تھی۔ دوست

مانتے تھے۔ اچھا جانتے تھے۔ قدر کرتے تھے۔

اپنے ماضی پر مجھے کوئی پشیمانی نہ تھی۔ نہ احساس گناہ، نہ کمتری۔

میں نے عشق کیے، محبتیں کیں، افیئر نہیں۔ یارانے نہیں۔ توجہ کے ہنار ہا۔ ذلتیں اور رسوائیاں جھیلیں۔ فراق و وصال بھی کچھ۔ جبھی تو اب خود سے مطمئن تھا۔ احساس تکمیل سے سرشار۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے: بول کیا مانگتا ہے؟ جو مانگے گا ملے گا۔ تو یقیناً میں سوچ میں پڑ جاؤں گا۔ کیا مانگوں؟ میں مانگ کی دنیا سے دور نکل آیا ہوں۔ سکون اور اطمینان کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔

شور شرابا پیچھے رہ گیا ہے، بہت پیچھے۔

جس راستے پر میں گامزن ہوں، وہ اطمینان سے لبریز ہے۔

سڑک خاموش ہے۔

راستہ ہموار ہے، نہ اونچان نہ نیچان۔ سیدھا، صاف۔ دونوں جانب پیڑ اُگے ہوئے ہیں۔ سرسبز نہیں، پیلے پیلے۔ اونچے لمبے نہیں، بیٹھے بیٹھے، جھکے جھکے، گرد آلود۔

پتے مسلسل جھڑ رہے ہیں۔ کھڑ کھڑ کر رہے ہیں۔

شام گہری ہوتی جا رہی ہے۔

دور دور لگے کھمبوں پر بتیاں ٹمٹما رہی ہیں۔

ان کی زرد لم لم زمین تک نہیں پہنچ پاتی۔

شام کا گھسمسہ بڑھتا جا رہا ہے۔

سڑک پر اکا دکا راہ گیر چل رہے ہیں۔

چپ چاپ، تھکے ہارے، گرد سے اٹے ہوئے۔

ایک دوسرے سے دور دور۔ اکیلے اکیلے۔ تنہا تنہا۔

منظر پر سکون کا ایک خیمہ تنا ہوا ہے۔ بے چینی کی مدھانی مدت سے زنگ آلود ہو چکی ہے۔ میرے دل میں کوئی مد و جزر نہیں۔ ذہن سوچ بچار کی گھاٹیوں سے نکل چکا ہے۔ کیوں، کیسے، کس لیے کے بھنو بھنن بھنن کرنا بھول چکے ہیں۔

میرے سامنے آسمان پر چاند ٹنگا ہوا ہے۔ چاندنی والا چاند نہیں۔ چاندنی تو بکھیر دیتی ہے۔ ایک بڑا سا مدھم مدھم چاند۔ جیسے تانبے کا ایک تھال لٹک رہا ہو۔ میں چلے جا رہا ہوں، چلے جا رہا ہوں۔

دفعتہً پاؤں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ قریب اور قریب۔ یہ کون ہے جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا

میں مڑ کر دیکھتا ہوں: کون ہو تم؟

وہ سر اٹھاتی ہے۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹکتی ہے۔ رُکتی ہے۔ پھر سر جھکا لیتی ہے۔ جواب نہیں دیتی۔
اس کے جسم میں چمک ہے، تازگی ہے، شگفتگی ہے۔ لیکن منہ لٹکا ہوا ہے۔ خدوخال پر بے تکلفی کی دھول جمی ہے۔ تھکا ہارا مردہ چہرہ۔ گردن جھکی ہوئی۔ نگاہیں اُکتائی ہوئی، جیسے بہت کچھ دیکھا ہو، دیکھ دیکھ کر تھک گئی ہوں، جھک گئی ہوں۔ نہ دیکھنے کی چاہ نہ دکھانے کا شوق۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟ کون ہو تم؟''

''میں بھی ہوں'' وہ سر اٹھائے بغیر جواب دیتی ہے۔

جواب میں تلخی ہے۔ لیکن آواز مدھم، پھیکی پھیکی، تھکی تھکی۔ اس میں چمک نہیں۔ تان نہیں۔ لے نہیں۔ لوچ نہیں۔ جیسے ریوڑی بھیگ گئی ہو۔ کڑاکا نہ رہا ہو۔

''لیکن یہ سڑک تو تمہارے لیے نہیں ہے۔ تمہیں تو شاہراہ پر چلنا چاہیے، جہاں رونق ہے، زندگی ہے۔''

''وہیں سے آئی ہوں'' وہ جواب دیتی ہے۔

''لیکن کیوں؟'' ناگاہ میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔

وہ سر اٹھاتی ہے۔ تن کر کھڑی ہو جاتی ہے ''میری مرضی۔''

میں چپ ہو جاتا ہوں۔ چلنے لگتا ہوں۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ لیکن دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔ پتا نہیں غصہ ہے یا کیا۔

پاؤں کی چاپ پھر قریب آ جاتی ہے۔ اور قریب۔

''تم میرے ساتھ ساتھ کیوں چل رہی ہو؟'' ان جانے میں میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔

''ساتھ نہیں۔ میں چل رہی ہوں'' وہ بآواز بلند کہتی ہے۔ پھر زیرِلبی سنائی دیتی ہے۔ ''کوئی کسی کے ساتھ نہیں چلتا۔'' اس کی آواز میں حسرت نہیں، آرزو نہیں، بے تعلقی ہی بے تعلقی ہے۔

میں رُک جاتا ہوں ''دیکھو تو، پاؤں دھیرے دھرو۔ ہم ساتھ ساتھ نہ رہیں۔''

''ہاں'' وہ کہتی ہے ''دھیرے دھرے تھے۔ لیکن۔''

''لیکن کیا؟'' میں پوچھتا ہوں۔

''پھر تم بھی پاؤں دھیرے دھرنے لگے۔ رُک گئے۔''

''میں رُک گیا تھا؟'' مجھے غصہ آنے لگا۔

''ہاں، تم'' وہ جواب دیتی ہے۔ اس کی آواز برف کی سل کی طرح گرتی ہے۔

لیکن وہ چلے جاتی ہے۔ یوں چلے جاتی ہے جیسے کسی نے اُس کا راستہ کاٹا ہی نہ ہو۔ جیسے کسی کو پیچھے چھوڑ کر نہ جا رہی ہو۔۔۔ سچی بات یہ ہے کہ اگرچہ میرے پاؤں رُک گئے ہیں، لیکن میں نہیں رُکا ہوں۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلے جا رہا ہوں۔ چلے جا رہا ہوں۔

دن گزر جاتے ہیں۔ ہفتے گزر جاتے ہیں۔ لیکن میں چل رہا ہوں۔ چلے جا رہا ہوں۔ اس کے پیچھے پیچھے چلے جا رہا ہوں۔

پتا نہیں میں اس کے پیچھے کیوں چلے جا رہا ہوں۔

کوئی خواہش نہیں، آرزو نہیں جو پیچھے چلنے پر اُکسائے۔ حصول کی خواہش نہیں۔ مطلب نہیں۔ مانگ نہیں۔

اسے دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

پوجا کے پھول سوکھ کر کانٹے بن چکے ہیں۔

آرتی کی تھال خالی پڑی ہے۔

بھینٹ چڑھانے کے لیے کچھ بھی تو نہیں ہے۔

پھر بھی چلے جا رہا ہوں۔

نہ مقصد نہ منزل۔

چلتے چلتے ایک دن وہ پھر نظر آ جاتی ہے۔

مجھے یقین نہیں آتا۔ آنکھیں ملتا ہوں۔

نظر تو وہ مجھے مسلسل آتی رہتی ہے۔ آتی رہتی ہے۔ وہ مسکراہٹ، وہ رنگ پچکاری جیسے کسی نے کُن کہہ دیا ہو۔ نہیں نہیں۔۔۔ فریبِ نگاہ نہیں۔ واقعی وہ پارک کے ایک کونے میں، درخت کے مقابل، زمین پر اُکڑوں بیٹھی ہے۔ ہاتھ میں برش ہے۔ پہلو میں بہت سے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ رُوبرُو ایک بڑی سی کینوس فریم پر لگی ہوئی، درخت کے سہارے کھڑی ہے۔

میں دبے پاؤں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوتا ہوں۔

ارے! یہ کینوس پر کیا بنا ہوا ہے؟ اس قدر خوفناک چہرہ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ کوئی عفریت ہے۔ یہ کیا بنا رہی ہے؟ میں دل ہی دل میں سوچتا ہوں۔

دیر تک میں وہاں کھڑا رہتا ہوں۔ کھڑا رہتا ہوں۔

وہ مڑ کر دیکھتی ہے۔ ایک نظر غلط انداز۔۔۔ سرسری۔۔۔ اور پھر سے رنگ بھرنے میں مصروف ہو جاتی ہے، جیسے پیچھے کوئی کھڑا ہی نہ ہو۔ انداز میں نہ تعجب ہے نہ لگاؤ، نہ لاگ۔

"تمھیں اپنے متعلق خوش فہمی ہے کیا؟"

"تمھیں ہے، مجھے نہیں۔ میں خوش فہمیوں کی دنیا سے نکل آئی ہوں۔"

میں رُک جاتا ہوں "میں تمھارے ساتھ نہیں چلوں گا۔"

"تھینک یو" وہ جواب دیتی ہے، اور تیز چلنے لگتی ہے۔

"تھینک یو؟ کس بات پر؟" میں چلّاتا ہوں۔

"میں تمھارے ساتھ چلنا پسند نہیں کرتی" وہ پیچھے مڑے بغیر جواب دیتی ہے۔

غصے سے میری کنپٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ میں اس کے پیچھے بھاگتا ہوں "میرے ساتھ چلنے میں کیا ہے؟ بولو!"

"تم ساتھی نہیں ہو۔"

"لیکن کیوں؟" میں اسے کندھوں سے پکڑ لیتا ہوں۔

"تم اپنی مَیں سے بھرے ہوئے ہو۔ اتنے بھرے ہوئے ہو کہ دوسرے کی گنجائش نہیں۔ تم توجہ دے نہیں سکتے۔ خود توجہ طلب ہو۔"

"تم مجھے جانتی ہو کیا؟"

"جانتی نہیں" وہ جواب دیتی ہے "تمھارے ماتھے پر لکھا ہوا ہے۔"

"تم اسے پڑھ سکتی ہو کیا؟" میں طنزاً پوچھتا ہوں۔

"ہاں" وہ سر اٹھا کر جواب دیتی ہے "میں عورت جو ہوں۔"

مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے سُن کر دیا ہو۔ میں اپنے ہاتھ اس کے کندھوں سے اُٹھا لیتا ہوں۔ میری گردن لٹک جاتی ہے۔

مجھے دیکھ کر اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ کہتی ہے "میں تمھیں دُکھانا نہیں چاہتی۔ دل میلا نہ کرو۔ سچ سننے کی ہمت پیدا کرو۔"

اس نے پہلی بار نگاہیں اٹھائی ہیں۔ مجھ پر بھرپور نظر ڈالی ہے اور مسکرا دی ہے۔

دفعتہً نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ کچھ ہو گیا ہے۔ رنگ پچکاری چل گئی ہے۔ پیڑ تن گئے ہیں۔ پتے ہرے ہو گئے ہیں۔ بتیاں روشن ہو گئی ہیں۔

چاند کی چاندنی نے سارے منظر کو بھگو دیا ہے۔

میرے اردگرد اِک بھیڑ لگ گئی ہے۔

وہ چل پڑتی ہے۔

پورٹریٹ کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں۔ لیکن میرا گلا خشک ہو جاتا ہے۔

وہ میری طرف منت بھری نگاہ سے دیکھتی ہے۔ کہتی ہے "سچ جاننے کا حوصلہ پیدا کرو۔"

دفعتہً پارک کے پھول انگاروں میں بدل جاتے ہیں۔ شعلے اٹھتے ہیں۔ پودے دھڑ دھڑ جلنے لگتے ہیں۔ منظر دھواں دھواں ہو جاتا ہے۔ میں اُٹھ کر بھاگتا ہوں۔ بھاگتا رہتا ہوں۔ پتا نہیں کب تک بھاگتا رہتا ہوں۔

شام کو جب تھکا ہارا گھر پہنچتا ہوں تو دفعتہً لیٹے لیٹے میرے اندر کوئی کہتا ہے: تم خود سے بھاگ رہے ہو۔ میں چونکا ہو جاتا ہوں۔ یہ کیا ہوا؟ کیا میری مَیں کا ایک حصہ باغی ہو گیا ہے؟ ضرور اس لڑکی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے میں خود کو اس کی نظر سے دیکھنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔

نہیں۔ میں خود سے نہیں بھاگ رہا۔ یہ جھوٹ ہے۔ غصے میں میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔ میری بیوی یہ سن کر گھبرا گئی ہے۔ پوچھتی ہے: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اسے کیا جواب دوں؟

اگلے روز صبح باتھ روم میں میری نگاہ آئینے پر پڑتی ہے تو میں چونک پڑتا ہوں۔۔۔ ارے! یہ کیا؟ آئینے میں عفریت مجھے گھور رہا ہے۔ نہیں، نہیں۔ یہ میں نہیں۔ میں تو روز آئینہ دیکھتا ہوں۔

ہنسی کی آواز سن کر میں چونک جاتا ہوں۔

آئینے میں عفریت کے پیچھے، ہاتھ میں برش پکڑے، وہ ہنس رہی ہے۔ کہتی ہے "تم روز آئینے میں وہ دیکھتے ہو جو تم دیکھنا چاہتے ہو۔ وہ نہیں جو تم ہو۔ وہ جو تم سمجھتے ہو کہ ہو۔"

میں آئینے پر پتھر مارتا ہوں۔ تڑاخ کی آواز آتی ہے اور پھر باہر نکل جاتا ہوں۔

شام کو جب میں گھر پہنچتا ہوں تو میری بیوی ایک بڑا سا پیکٹ میرے ہاتھوں میں تھما دیتی ہے۔ کہتی ہے "ایک خاتون دے گئی ہے۔" پیکٹ کاغذ میں لپٹا ہوا ہے۔

میں کاغذ پھاڑتا ہوں۔۔۔ ارے! وہی پورٹریٹ! پورٹریٹ کے کونے میں "عینی" لکھا ہوا ہے۔

تصویر کو دیکھ کر میری بیوی ہونٹوں پر انگلی رکھ لیتی ہے۔ "ہئے، یہ تو کوئی بھوت ہے۔"

میں اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ تصویر کو اُلٹا کر کے دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہوں۔ کچھ دیر کے بعد اچانک جو میں اُدھر دیکھتا ہوں تو سن ہو کر رہ جاتا ہوں تصویر کینوس کی پشت پر اُبھر آتی ہے۔

دیوانہ وار لپک کر میں تصویر کو اُٹھا لیتا ہوں اور باہر نکل جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں: میں اسے ایسی جگہ پھینک آؤں گا جہاں کسی کی نظر نہ پڑے۔

سڑک پر اِکّا دُکّا موٹریں چل رہی ہیں۔ ایک ویگن آ کر رک گئی ہے۔ میری نگاہ اس کی پشت پر پڑتی ہے۔۔۔ ارے! یہ کیا؟۔۔۔ ویگن کی نشست پر وہی تصویر بنی ہوئی ہے۔ گھبرا کر میں منہ موڑ لیتا

جھلکی "نہ بیٹے، نہ۔ اللہ کے واسطے ڈھونڈ میں نہ پڑنا۔"

"کیوں، اماں؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی پسند آ گئی تو، تُو اس کے پیچھے بھاگے گا" وہ رُک گئی۔ اُنگلی سے آنسو پونچھا "پہلے بھی یہی ہوا تھا۔ سولہ سال تو اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا تھا۔ پھر جب وہ مل گئی تو، تُو ساتھ ساتھ نہ چل سکا"۔ وہ رُک گئی۔

"جو پیچھے بھاگنے والے ہوتے ہیں، بیٹا، وہ ڈرتے ہیں کہ مل نہ جائے۔ پیچھے بھاگنے کی لذت ختم نہ ہو جائے"۔ وہ چپ ہو گئی۔ میں سوچنے لگا۔ بات سامنے دھری تھی۔ پر میرے پلے نہ پڑی۔

اب میں نے جانا ہے کہ سامنے دھری نہیں دِکھتی۔ جو ڈھونڈ کا رسیا ہو، اُسے سامنے دھری کیسے دِکھے۔

دیر تک ہم چپ چاپ بیٹھے رہے۔

پھر اماں اٹھی، میرے پاس آئی، ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا، تھپکا۔ بولی "بیٹے، تو سب کچھ جانتا ہے۔ پر خود کو نہیں جانتا۔ میں تجھے جانتی ہوں۔ مجھے پتا ہے۔"

"تو مجھے کیسے جانتی ہے، اماں؟"

"تو اپنے ابا پر گیا ہے نا۔ ہُو بہُو وہی ہے۔ ہُو بہُو۔ اور میں نے ساری زندگی اس کے ساتھ گزاری ہے۔ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ پیچھے بھاگنا محبت ہے۔ بس وہ بھاگتا ہی رہا، زندگی بھر۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ دیر تک کھڑی میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی رہی اور میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"اماں" میں نے خاموشی توڑی "محبت کیا ہوتی ہے؟"

کچھ دیر کے لیے وہ خاموش رہی، پھر بولی "بیٹے، محبت دوڑ بھاگ نہیں ہوتی۔ طوفان نہیں ہوتی، سکون ہوتی ہے۔ دریا نہیں ہوتی، جھیل ہوتی ہے۔ دوپہر نہیں ہوتی، بھورے ہوتی ہے۔ آگ نہیں ہوتی، اُجالا ہوتی ہے۔ اب میں تجھے کیا بتاؤں کہ کیا ہوتی ہے۔ وہ بتانے کی چیز نہیں، بیتنے کی چیز ہے۔ سمجھنے کی چیز نہیں، جاننے کی چیز ہے۔"

☆

اماں کی بات میرا راستہ روک لیتی ہے۔ میں رُک جاتا ہوں۔ لیکن تڑپ بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہتا ہوں۔ دیکھتا رہتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید وہ مڑ کر دیکھے۔ پھر مسکرائے۔ پھر پھلجھڑی چل جائے۔ پھر کُن کہہ دیا جائے۔

"یہ کیا بنا رہی ہو؟" میں پوچھتا ہوں۔

"پورٹریٹ" وہ منہ موڑے بغیر جواب دیتی ہے۔

"کس کی ہے؟"

"ہے کسی کی۔"

"کوئی مفریت ہے کیا؟"

"نہیں۔ مفریت نہیں۔"

"کس کے لیے بنا رہی ہو؟"

"میری اسائنمنٹ ہے" وہ پیچھے دیکھے بغیر جواب دے جا رہی ہے۔

"کانٹوں سے بھری شبیہہ ہے۔"

"ہاں۔ تناؤ ہے۔ تلخی ہے۔ شدت ہے۔ مٹھاس نہیں۔ محبت نہیں۔"

"محبت تو شدت کے بغیر ممکن نہیں" میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔

"نہیں، محبت شدت کی نفی ہے" وہ پہلی بار مڑ کر میری طرف دیکھتی ہے۔ مسکراتی ہے۔ وہی رنگ پکاری۔ فرحت سے بھری ایک پھواری اُڑتی ہے۔ پورٹریٹ کی ساری تلخی دھل جاتی ہے۔

"تم شدت کو بُرا جانتی ہو کیا؟" میں پوچھتا ہوں۔

"شدت خود پرستی کا ایک رُوپ ہے۔ میں اسے بُرا نہیں جانتی۔ بس مجھے گوارا نہیں۔"

"تم محبت کو کیا سمجھتی ہو؟" میں پوچھتا ہوں۔

وہ میری طرف منہ موڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ کہتی ہے "محبت ایک پُرسکون کیفیت ہے۔ وجدان ہے۔ نہیں" وہ زیرلب گویا خود سے کہتی ہے "بتائی نہیں جا سکتی۔ صرف جی جا سکتی ہے۔"

دفعتہً وہ میری طرف دیکھ کر چونکتی ہے "رُک جاؤ! رُک جاؤ!" وہ اُٹھ کر میری طرف آتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے میری ٹھوڑی تھام لیتی ہے۔ پھر ٹھوڑی پر بائیں طرف اُنگلی رکھ کر پوچھتی ہے "یہ کیا ہے؟ سکار ہے یا تِل ہے؟"

"تِل ہے" میں جواب دیتا ہوں۔

وہ پورٹریٹ کی طرف مُڑتی ہے، برش اٹھاتی ہے، اور شبیہہ کی ٹھوڑی کے بائیں طرف کالا نقطہ لگا دیتی ہے۔

غصے سے میرا منہ سُرخ ہو جاتا ہے "کیا مطلب؟ تمھارا مطلب ہے، یہ میری۔۔؟" میں

ہوں۔ سامنے دیوار پر وہی تصویر۔۔۔ ارے! میں بھاگ لیتا ہوں۔ جگہ جگہ ٹریفک سائنز پر وہی عفریت مجھے گھور رہا ہے۔

میں گھر کی طرف بھاگنا شروع کر دیتا ہوں۔

ڈرائنگ روم میں میرا دوست راجا شفیع میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں تصویر کو کمرے کی دیوار سے لگا کر راجا سے ہاتھ ملاتا ہوں۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی ہے۔

ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔

راجا بوڑھے ساتھی سے کہتا ہے" حاجی صاحب، میرا دوست آج کل بہت پریشان رہتا ہے، اس کے لیے دعا کریں۔"

"کیا پریشانی ہے؟" حاجی پوچھتا ہے۔

"میں ایک الجھن میں پھنسا ہوں" میں جواب دیتا ہوں" وہ یہ کہ میں کون ہوں؟"

حاجی مسکرا دیتا ہے۔

میں اپنی بات کی وضاحت کرتا ہوں۔ کہتا ہوں" میرا مطلب ہے، کیا میں وہ ہوں جو خود کو سمجھتا ہوں، یا وہ ہوں جو لوگ مجھے سمجھتے ہیں؟"

حاجی پھر مسکراتا ہے۔ کہتا ہے" چاہے آپ یہ ہیں یا وہ ہیں، آپ اس جھنجھٹ میں کیوں پڑتے ہیں کہ آپ کیا ہیں؟ اپنی مَیں کا بوجھ اپنے کندھوں پر کیوں اٹھائے پھرتے ہیں، خوامخواہ؟"

دفعتہً میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے کندھوں کا بوجھ گر گیا ہے۔ عین اس وقت شفیع چلا کر کہتا ہے "ارے! یہ کینوس تو خالی ہے۔"

میں پورٹریٹ کی طرف دیکھتا ہوں۔ کینوس واقعی خالی ہے۔

-☆-

معروف فارانی

معروف فارانی سے میری ملاقات اتفاقاً ہوئی تھی۔ ویسے میں اسے جانتا تھا۔ میں نے اس کی دو کتابیں پڑھی تھیں اور خاصا متاثر ہوا تھا۔ اس کی تحریر میں دلچسپی تھی شوخی تھی، تھیز تھی۔

پھر اخبار میں اس کی تصویر دیکھی تو میں حیران ہوا۔ اس قدر عمر رسیدہ اور اتنی جوان تحریر۔

اس روز میں پیدل تھا، چلتے چلتے تھک گیا۔ ستانے کے لئے کنٹونمنٹ پارک میں رک گیا۔

پارک ویران تھا۔ سامنے بینچ پر ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔

''میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اثبات میں اشارہ کیا۔

ارے یہ تو معروف معلوم ہوتا ہے میں نے سوچا۔ '' آپ معروف فارانی ہیں نا'' میں نے پوچھا۔

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

'' آپ کی تحریر دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ آپ بوڑھے ہیں''۔

''یہ میری بے یقینی ہے۔'' وہ بولا۔

''ارے ہم تو اسے خوبی سمجھتے ہیں۔''

''میں بھی خوبی سمجھتا رہا۔'' اس نے مدہم آواز میں کہا '' میں نہیں سمجھتا''۔ میں نے حیرت سے کہا۔

'' آپ نہیں سمجھیں گے۔'' وہ بولا۔ '' کوئی بھی نہیں سمجھتا۔'' سیدھی بات پر کوئی نہیں سوچتا جب تک اس میں ٹیڑھ نہ ہو'' سامنے پڑی ہو پھر تو وہ درخور اعتنا ہی نہیں ہوتی چاہے کیسی بھی ہو۔''

اس نے میری طرف دیکھا۔ سمجھ گیا کہ بات میرے پلے نہیں پڑی۔ '' آپ کا نام؟'' اسنے پوچھا۔

سعید۔ میں نے جواب دیا

''سعید صاحب!'' وہ بولا۔ دیکھئے نا۔ سیدھی بات ہے۔ میری تحریر کو مجھ سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ تحریر اور ہے۔ میں اور ہوں یعنی میں ایک نہیں دو ہوں۔ وہ نہیں ہوں جو مجھے ہونا چاہئے۔ ہپوکریٹ کہہ سکتے ہیں۔''

''آپ عجیب باتیں کر رہے ہیں؟'' میں نے کہا

''ہاں۔'' وہ بولا ''ہم سچائی سے اس قدر بیگانہ ہو چکے ہیں کہ سچی بات عجیب لگتی ہے۔''

''مطلب ہے کہ آپ مطمئن نہیں ہیں۔'' میں نے پوچھا

''ہوں۔ بہت مطمئن ہوں۔ نہیں ہونا چاہئے مگر ہوں۔ یہ اطمینان خود ساختہ ہے۔ خود فریبی ہے۔ مجھے وہ کیفیت حاصل نہیں جسے ''یونی سن'' کہتے ہیں۔ وہ رک گیا۔ کچھ دیر کے لئے خاموش رہا۔ پھر بولا۔

''سیانے کہتے ہیں بی وائی سیلف۔ سچ'' کہتے ہیں۔'' میں اپنا سیلف نہیں بھی رہا۔ ایک نمائشی سیلف جی رہا ہوں۔ جو میں نے خود بڑی محنت سے بنا رکھا ہے۔'' وہ کھسیانی ہنسی ہنستا اور پھر آہ بھر کر بولا

''میں ایک نہیں رہا مسٹر سعید۔ دو ہو گیا ہوں۔ ایک وہ جو ہوں۔ ایک وہ جو سمجھتا ہوں کہ ہوں۔ دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ سعید صاحب گھر میں دوج پڑ گئی ہے۔ گھر میں دوج پڑ جائے تو جینا مشکل ہو جاتا ہے۔'' وہ پھر خاموش ہو گیا۔ دیر تک کھویا رہا۔ پھر دفعتاً سر اٹھایا۔ بولا۔ ''اور یہ سب آپ کا قصور ہے۔''

میں گھبرا گیا۔ میرا قصور۔

''ہاں۔ آپ کا۔'' وہ بولا۔ ''آپ قاری ہیں نا۔ آپ کا مطالبہ ہے کہ نوجوان خیالات ہوں۔ شوخیاں ہوں۔ رنگ رس کی ہولی کھیلو۔ پھلجھڑیاں چلاؤں۔ آپ تالی بجاتے رہے۔ میں فریب کھاتا رہا۔ جی کہ دو ہو گیا۔

''سعید صاحب'' وہ تازہ دم ہو کر بولا۔ ''یہاں کوئی بھی کسی کو اپنی عمر کے مطابق جینے نہیں دیتا۔ نوجوانوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ عمر رسیدہ بن کر جئیں۔ بوڑھوں کو اس بات پر مائل کرتے ہیں کہ وہ نوجوان بن کر جئیں۔

ہم زبردستی ایک کو دو بنا دیتے ہیں۔'' دوج ڈال دیتے ہیں۔ اس رات میں معروف کی باتوں پر سوچتا رہا۔ کبھی لگتا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ پھر خیال آتا جناؤ۔ ایک بڈھے خبطی کی باتوں پر کیوں خود کو پریشان کر رہے ہو؟''

دو ایک دن میں اس کی باتوں پر سوچتا رہا پھر اس کا خیال ذہن سے نکل گیا۔

پھر ایک ایسا واقعہ ہوا کہ مجھے معروف یاد آ گیا۔

یہ ایک معمولی سا واقعہ تھا۔

ایک روز اتفاق سے میں بچوں کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت وہاں سبھی لوگ بیٹھے تھے۔ میری بیوی، دو جوان بیٹیاں اور چھوٹا بیٹا۔ وہ سب سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔ کوئی اہم بات زیر بحث تھی۔ میں داخل ہوا تو وہ ایک دم چپ ہو گئے۔ یوں جیسے کوئی بیگانہ آ گیا ہو۔ اس پر مجھے دھچکا لگا۔ سوچ میں پڑ گیا کہ ایسا کیوں ہوا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ پہلے بھی دو ایک بار ایسا ہوا تھا لیکن کیوں، ایسا کیوں ہوا، ایسا کیوں ہوتا ہے، گھر میرا ہے، بیوی میری ہے، بچے میرے ہیں، میں بیگانہ تو نہیں ہوں۔

میں نے شدت سے محسوس کیا کہ گھر میں ہم نہیں رہتے بلکہ وہ رہتے ہیں اور میں رہتا ہوں۔ وہ چار ہیں میں اکیلا ہوں۔ اپنے گھر میں اکیلا۔

جوں جوں میں اس بات پر سوچتا، میرے دل میں دوج پیدا ہوتی گئی۔ دفعتاً مجھے معروف کی بات یاد آ گئی جس گھر میں دوج پیدا ہو جائے وہاں رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیا وہ سچ کہتا ہے کیا ہم ایک سے دو بن جاتے ہیں۔ اس روز مجھے معروف سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ شام کو میں کنونمنٹ پارک جا پہنچا۔ وہ اسی بینچ پر بیٹھا تھا۔ میں نے سلام کیا۔

اچھا آپ ہیں۔ کیا نام ہے؟۔ ہاں سعید صاحب۔ بیٹھے مجھے نام یاد نہیں رہتے۔ میموری کا فیوز اڑ چکا ہے۔ صرف حال ہی حال رہ گیا ہے وہ بھی ایک لمحہ۔ ماضی مٹ گیا ہے۔

آپ کے مزاج اچھے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

بیمار ہوں۔ وہ بولا۔ بہت بیمار ہوں۔ یوں سمجھو کہ آپ بیمار پڑتے ہیں۔ میں بیمار جیتا ہوں۔ اس عمر میں بیماریوں کے ساتھ جینا سیکھنا پڑتا ہے۔ بیچارے اعضاء۔ چل چل کر تھک گئے ہیں۔ کہتے ہیں اب بس کرو۔ بہت ہو گیا۔ لیکن آپ بیمار دکھتے نہیں۔ میں نے کہا۔

ہاں دکھتا نہیں۔ لیکن سعید صاحب۔ بیماری اندر کی چیز ہے، باہر کی نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس نے مجھے ایک گفٹ دے رکھا ہے۔ بیماری کے باوجود ورکنگ فٹ نس قائم رہتی ہے۔

آپ اسے مانتے ہیں۔ میں نے اسے چھیڑا۔

وہ مسکرایا۔ کہنے لگا جس نے تمہیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہو۔ باہر سے۔ اندر سے بھی۔ اسے کون نہیں مانے گا۔ سب مانتے ہیں۔ جو نہیں مانتا وہ جھوٹ بولتا ہے خود فریبی میں جیتا ہے۔ وہ رک گیا پھر بولا۔

آپ جاننے کی بات کر رہے ہیں۔ میں بھی تو اس سے لبالب بھرا بیٹھا ہوں۔ جسم کو ...

بھرا ہوتا ہے۔ اگرچہ میں اس کے احکامات کا عامل نہیں ہوں۔ لیکن یہ سرکشی نہیں نافرمانی نہیں۔ سستی ہے، بے عملی ہے۔ اس کے باوجود اس نے مجھے ریجیکٹ نہیں کیا۔ مجھ سے رابطہ قائم رکھا ہے۔

آپ کی کیا عمر ہوگی؟ میں نے پوچھا۔

۸۵ سال۔ وہ بولا۔ یہ چینج اوور کی عمر ہے اس عمر میں مجھے خود کو ادھر سے کاٹ کر ادھر سے جوڑنا چاہئے۔ ادھر سے بے تعلق ہو کر ادھر سے تعلق پیدا کرنا چاہئے۔

تو آپ ادھر بے تعلق پیدا کرنے کے لئے یہاں پارک میں آبیٹھتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ نہیں۔ وہ بولا۔ بالکل نہیں۔

تو کیا آپ منظر دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

نہیں۔ بولا۔ دراصل میں اپنی بیوی سے جان چھڑانے کے لئے یہاں آتا ہوں۔ گھر میں صرف ہم دو میری بیوی اور میں۔ سارا گھر میری بیوی سے بھرا ہوا ہے۔ اس قدر بھرا ہوا ہے کہ میرا سانس رکنے لگتا ہے اور میں گھبرا کر یہاں آبیٹھتا ہوں۔

گھر میں بچے نہیں کیا۔ میں نے پوچھا۔

ایک بیٹا تھا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد ایک دن اس نے کہا۔ بابا میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں کیا۔

میں نے کہا۔ پوچھو۔

کہنے لگا۔ بابا۔ میں نے تیس سال آپکے خیالات کے مطابق زندگی بسر کی ہے۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو باقی زندگی میں اپنے خیالات کے مطابق بسر کرلوں۔

جواب میں مَیں کیا کہہ سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ بے شک بصد خوشی۔

وہ کینیڈا چلا گیا۔ وہاں اس نے شادی کرلی۔ چار چھ مہینے اس کے خط آتے رہے۔ پھر بند ہو گئے۔ بس۔ جب سے میں اور میری بیوی اکیلے رہ گئے ہیں۔

آپ اپنی بیوی سے جان کیوں چھڑاتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ آئی ہیٹ ہر۔ وہ بولا۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ کھولتی ہوئی نفرت۔

یہ سن کر میں گھبرا گیا۔ گردن جھکا کر بیٹھا رہا۔

کچھ دیر کے بعد وہ بولا۔ سعید صاحب۔ بیوی سے صرف دو قسم کا تعلق ہو سکتا ہے۔ یا آپ اس سے محبت کر سکتے ہیں یا نفرت۔ بیشتر میاں اسے برداشت کرتے ہیں سعید صاحب۔ نسائیت شہد کی طرح ہوتی ہے۔ جب شہد چو جاتا ہے تو پیچھے کھنگارہ جاتا ہے۔ میری بیوی عرصہ دراز سے ایک کھنگا ہے۔

کہتے ہیں کسی نے دانش ور سے پوچھا کہ زندگی میں سب سے حسین چیز کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ عورت۔ پوچھنے والے نے پھر پوچھا کہ زندگی میں سب سے بدصورت چیز کیا ہے۔ اس نے کہا۔ عورت۔ سچ کہا اس نے۔ کیوں سعید صاحب۔ دراصل دنیا میں سب سے حسین چیز نسائیت ہے جب عورت میں سے نسائیت ختم ہو جاتی ہے تو وہ نہ عورت رہتی ہے نہ مرد۔ پتہ نہیں کیا بن جاتی ہے۔

میری بیوی اور میں ہم دو غیر جنس ہیں جو سالہا سال سے ایک پنجرے میں قید ہیں۔ ایک کوا اور ایک کچھوا۔

وہ بولے جا رہا تھا۔ اور میں چپ چاپ سن رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسکے اندر بہت سی باتیں بھری ہوئی تھیں۔ بہت دیر سے اسے کوئی سننے والا نہ ملا تھا۔

آپ یہ باتیں تحریر میں کیوں نہیں لاتے۔ میں نے اسے چھیڑا۔ کیسے لاؤں۔ وہ بولا۔ لوگ میٹھی باتیں سننا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ پھلجھڑیاں چلاؤ۔ تلخ باتیں سننے کے لئے کون تیار ہے۔

سعید صاحب۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑھاپا عمر کا ایک محترم دور ہے۔ پرسکون مطمئن۔ کہتے ہیں تم سلامت رہو ہزار برس۔

انہیں پتہ نہیں کہ بڑھاپے میں جینا کس قدر مشکل ہے۔ اک عذاب ہے۔ صرف وہی لوگ اس عذاب کو جھیل سکتے ہیں جو "اس" سے کو لگا لیتے ہیں۔ یہ سارا عذاب "میں" کا ہے "میں" سے توجہ ہٹا لو عذاب مدہم پڑ جاتا ہے لیکن یہ ایک مشکل کام ہے۔ بہت مشکل۔ کاش کہ میں ایسا کر سکتا۔ اس نے لمبی آہ بھری۔

اب ایک ہی صورت ہے سعید صاحب مجھے چلا جانا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں نا 'گو وائیل دی گوئنگ از گڈ۔ پیشتر اس کے کہ موت رحمت بن جائے۔ میرے لئے دعا کرو سعید صاحب' آپ دعا کو مانتے ہیں' معروف صاحب میں نے پوچھا۔

بہت بہت، وہ بولا۔ بے حد۔ وہ رک گیا۔ پھر کہنے لگا۔ شکر ہے وہ ہماری دعائیں منظور نہیں کرتا ورنہ مصیبت پڑ جائے اور............

میں سمجھا نہیں۔ میں نے اس کی بات کاٹی۔

بھئی ہم بڑے کنفیوزڈ ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ ہمیں پتہ نہیں کہ ہمیں کیا مانگنا چاہئے۔ ہم ایک نہیں دو ہیں۔ ایک ہوتے تو پتہ ہوتا نا لیکن ہم تو بٹے ہوئے ہیں۔ اچھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا مجھے اب جانا چاہیے۔ تکلیف بڑھتی جا رہی ہے۔

چلئے میں چھوڑ آؤں۔ میں نے کہا۔ میرے پاس گاڑی ہے۔

نہیں نہیں وہ بولا۔ وہ سامنے گھر تو ہے میرا۔ سڑک کے پار۔ میں نے اسے سہارا دیا اور ہم دونوں چل پڑے۔

اس ملاقات کے بعد میں نے محسوس کیا کہ معروف سچ کہتا ہے میرے اندر کی کشمکش مجھے نظر آنے لگی۔ ڈھکی چھپی دوج باہر نکل آئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں بھی اپنی بیوی کو صرف برداشت کر رہا ہوں۔ چار ایک دن کے بعد مجھے پھر شوق چرایا کہ معروف سے ملوں۔ پارک میں پہنچا تو بینچ خالی پڑا تھا سوچ میں پڑ گیا کہ گھر جاؤں یا نہ جاؤں۔ اتنے میں باغ کا مالی آ گیا۔ کہنے لگا۔ وہ بڈھا کئی دن سے نہیں آیا۔ بیمار پڑا ہے۔

یہ سن کر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

ایک خاتون بولی۔ کون ہے؟

میں نے کہا۔ میں سعید ہوں معروف صاحب کو دیکھنے آیا ہوں۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر آواز آئی۔ آ جائیے۔

میں اندر داخل ہوا۔ گاؤ تکئے کا سہارا لئے وہ بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ سانس اکھڑا ہوا تھا۔ کرب میں جلتا تھا۔

مدہم آواز میں بولا۔ اب بھی پردہ کرتی ہے جیسے اس کے پاس دیکھنے کے قابل کوئی چیز ہو۔

کیا حال ہے آپ کا۔ میں نے پوچھا

مر رہا ہوں۔ وہ بولا۔ دورے پڑ رہے ہیں۔

کچھ دیر کے بعد پھر دورہ پڑا۔ کرب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ نہیں نہیں۔ وہ دیوانہ وار چلایا۔ میں نہیں مروں گا۔ نہیں مروں گا۔ کیسے مر سکتا ہوں۔ ظاہر تھا کہ وہ جان کنی کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اپنی پوری ول پاور سے موت کے خلاف جدو جہد کر رہا تھا۔

دورہ مدہم ہوا تو اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ بولا۔ تو دیکھتا نہیں۔ نظر نہیں آتا تجھے میں کیسے مر سکتا ہوں۔ بے شک میرے لئے رحمت ہے لیکن اسکا کیا ہوگا۔ مر گیا تو کیا کرے گی۔

میں نے رسماً کہا۔ اللہ ان کو سہارا دینے کی کوئی صورت پیدا کر دیں گے۔

آپ فکر نہ کریں۔

نہیں نہیں وہ بولا۔ کیا نام ہے آپ کا۔ آپ نہیں سمجھتے۔ اسے سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ عورت ہے، عورت۔ یہ اپنے لئے نہیں جیتی دوجے کے لئے جیتی ہے کسی دوجے کا ہونا ضروری ہے جس کے لئے۔ جی سکے۔

یہ میرے لئے جی رہی ہے۔ میرا دھیان رکھنے کے لئے۔ میری ٹہل سیوا کرنے کے لئے۔ میں مر گیا تو یہ کس کے لئے جئے گی۔ نہیں میں نہیں مروں گا۔ مجھے اس کے لئے جینا ہے۔ اگر چہ جینا مشکل ہے۔ بہت مشکل ہے لیکن کیا کیا جائے، مجبوری ہے۔ دروازہ بجا۔ میں نے اٹھ کر کنڈی کھولی۔

ایک جوان لڑکا ہاتھ میں بیگ پکڑے اندر داخل ہوا۔

ہائی ڈیڈی۔ اس نے معروف کی طرف دیکھ کر کہا۔

بڑے وقت پر آئے ہو۔ معروف نے زیر لب کہا اور پھر آرام سے اپنا سر سرہانے پر ٹیک دیا۔

خاتون بیٹے کی آواز سن کر باہر نکل آئی تھی۔ لڑکے نے دوڑ کر ماں کو آغوش میں لے لیا۔

میں نے سوچا۔ اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ میں اٹھا۔

مجھے اجازت دیجئے۔ میں نے معروف سے کہا۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

میں قریب گیا۔

ارے وہ تو جا چکا تھا۔

-☆-

دیکھن دِکھن

لڑکیوں کا آخری ٹولہ کنیا سے نکلا۔ ٹیلے سے نیچے اترتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے کتر کتر باتیں کر رہی تھیں۔ شوخیاں کر رہی تھیں۔ فضا ان کے قہقہوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور تھیں۔ لگتا تھا جیسے دکھ درد سے قطعی طور پر ناواقف ہوں۔ لیکن جب وہ باری باری ہاتھ دکھانے کے لئے اکیلے میں جگن جوتشی سے ملتی تھیں تو دکھ سے بھیگی ہوتیں۔

ایک آہ بھر کر کہتی۔ جوتشی جی دیکھو تو میرا بیاہ ہوگا یا زندگی یونہی اکیلے میں بسر ہوگی۔ دوسری کہتی۔ کیا وہ مجھے مل جائے گا جسے میں چاہتی ہوں۔ کوئی اپنے مجازی خدا کی بے وفائی کی کتھا سناتی، کوئی ظالم سماج کا رونا روتی، کوئی سخت ماں باپ کا۔

جگن جوتشی سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ مل بیٹھتی میں تو زندگی شوخی سے بھرپور ہوتی ہے لیکن اکیلے میں دکھ سے چور چور۔ یہ کیا بھید ہے۔ سوچتے سوچتے وہ کنیا سے باہر نکل آیا۔

سامنے بینچ پر ہنواری بیٹھا تھا۔ ٹھوڑی ہاتھ میں پکڑے، گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ارے یہ کس سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ تو جذبے کا غلام ہے۔ اسے سوچ سے کیا واسطہ۔

پندرہ بیس دنوں کی بات ہے کہ ہنواری اپنی قسمت کا حال جاننے کے لئے جگن جوتشی کی کنیا میں آیا تھا۔ اس نے ایک انوکھا سوال پوچھا تھا۔ کہنے لگا۔ جوتشی میرا ہاتھ دیکھ کر یہ بتاؤ کیا مجھے کوئی ایسی زنانی ملے گی جو جیسی دکھتی ہو ویسی ہی ہو۔ میں اس زنانی کی ڈھونڈ میں ہوں۔ اس سوال پر جگن حیران ہوا۔ ایسی بات تو کسی نے کبھی پوچھی نہ تھی۔ جگن نے غور سے ہنواری کا جائزہ لیا۔

وہ ایک خوبصورت جوان تھا۔ لیکن اسکا حسن پوری طرح دکھتا نہ تھا۔ بن ٹھن سے بے نیاز منہ ان دھلا بال بکھرے ہوئے، موٹا لباس

جگن جوتشی کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اس گاہک سے کیسے نبٹا جائے اس نے سوچا کہ کنفیوزڈ آدمی ہے۔ اسے مزید کنفیوز کر دوں تو شاید بات بن جائے۔ بولا۔ پہلے یہ بتا کہ تیرے دکھن میں خرابی ہے یا اسکے دکھن میں۔

نہ نہ نہ۔ ہنواری نے کہا۔ میرے دکھن میں تو خرابی نہیں۔ میں عینک لگا کر نہیں دیکھتا۔ سارا جھگڑا زنانی کے دکھن کا ہے۔

جگن بولا۔ بھائی میرے دکھن اور دکھن کھچڑی سمان نہیں ہوتے کہ دال الگ کر لو اور چاول الگ۔ وہ تو شربت سمان ہوتے ہیں۔ میٹھا اور پانی یوں گھل مل جاتے ہیں کہ الگ نہیں ہو سکتے۔ جگن نے اسے کنفیوز تو کیا مگر ساتھ بہلایا بھی جیسے ہر جوتشی پر گاہک کو بہلانا لازم ہوتا ہے۔ آخر میں جگن بولا۔ تجھے ایسی عورت ضرور ملے گی جو ویسی ہی ہوگی جیسی دیکھے گی اور تم دونوں ہنسی خوشی دن گزارو گے۔

کب ملے گی؟ وہ بولا۔ میں تو پانچ سال سے گلیوں اور محلوں میں در بدر ہو رہا ہوں۔ لیکن آج تک نہیں ملی۔

مل جائے گی جلدی مل جائے گی۔ جگن بولا۔ پر تو در بدر کیوں ہوتا ہے؟ یہاں آ بیٹھا کر۔ یہاں عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

اچھا۔ ہنواری بولا۔ پر یہاں بیٹھ کر کروں گا کیا؟

کرنا کیا ہے۔ در بدر ہو کر نہیں۔ بیٹھ کر ڈھونڈ۔ میرا بالکا بن جا۔ جو عورت آئے اس کا انٹرویو کر۔ اسے پوچھ کہ وہ چاہتی کیا ہے۔ پھر اسکی پرچی بنا دے اور میں صرف اسے ملوں گا جس کے ہاتھ میں تیری دی ہوئی پرچی ہوگی۔

ہنواری کی باچھیں کھل گئیں۔

جگن نے بات پکی کرنے کے لیے کہا اور جس روز تجھے وہ مل جائے، بے شک لے جانا۔

بول تیری فیس کیا ہے۔ ہنواری نے پوچھا۔

اونہوں۔ جگن بولا۔ کبھی بالکے سے بھی فیس لیا کرتے ہیں؟

عجیب آدمی ہے یہ۔ ہنواری۔ جگن نے سوچا۔ پر یہ کس سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ جگن ہنواری کے قریب جا بیٹھا۔ بولا۔ کس سوچ میں پڑا ہے تو۔ ہنواری نے ٹھنڈی آہ بھری۔ بولا۔ اپنے نصیبے میں تو سوچیں ہی سوچیں ہیں۔

کیوں کیا پیسے کی تنگی ہے؟

نہیں جوتشی پیسہ تو ہنواری کے ہاتھ کا میل ہے۔ جتنا چاہوں کما لوں۔ کل رات تین سو کمایا تھا۔

کیا کام کرتا ہے تو؟

چھابڑی لگا تا ہوں۔ دو گھنٹے میں سارا مال بک جاتا ہے۔ چاہے جتنا بناؤں۔ اللہ کا کچھ ایسا کرم ہے کہ گاہک انتظار کرتے ہیں کہ کب ہنواری چھابڑی لگائے۔

کیا بنا تا ہے تو؟ جگن نے پوچھا۔

پہلے قلفی بنا تا تھا۔ پھر ایک رات خواب میں ایک بابا کو دیکھا۔ بابا نے کہا دیکھ ہنواری وہ چیز نہ بنا جسکی ما نگ گھٹ رہی ہے۔ وہ بنا جو فیشن میں ہے۔ میں نے کہا۔ کیا بناؤں۔ بابا بولا۔ تجھے خود پتہ لگ جائے گا۔ پھر پتہ لگا کیا؟ جگن نے پوچھا۔

ہنواری بولا۔ اگلے دن جی اداس تھا؟۔ باہر جانے کا موڈ نہ تھا۔ مل ٹاپ ہوٹل کا بیرا ادھر سے گزرا تو میں نے کہا یار کچھ کھانے کو بھیج دے لڑکے کے ہاتھ۔ باہر جانے کا موڈ نہیں ہے آج۔ تو اس نے برگر بھیج دیا۔ اسے کھانے لگا تو بابا کی بات یاد آ گئی۔ فٹ سے اسے کھول کر دیکھا کہ کیا کیا مصالحہ پڑا ہے اس میں۔ پھر ایک ہفتہ برگر بنا تا رہا آزمانے کے لئے۔ پہلے روز چھابڑی لگائی تو گوروں کے بچوں نے بھیڑ لگا دی۔ ہوٹل والے ۲۰ روپے لیتے تھے میں نے دس کا لگا دیا۔ جوتشی۔ پیسے کے معاملے میں اللہ نے مجھے دین دے رکھی ہے کہ جتنا چاہے کمالے۔ پر کمائی کا فائدہ۔ جب گھر ہی نہ بنا تو کمائی کس کام کی۔

پر تو اتنا مایوس کیوں ہے؟ جگن نے پوچھا۔

تجھے نہیں پتہ جوتشی کہ میں وہ بوٹ ہوں جو آلنے سے گر پڑا ہے اور جو آلنے سے گرا وہ سدا نہ لے گا۔

یہ پہیلیاں کیوں بوجھوا رہا ہے مجھ سے۔ مجھے بتا کہ تیرے ساتھ کیا بیتی؟۔

کیا بتاؤں جوتشی۔ پہلا قدم ہی غلط پڑا۔ یوں سمجھ لے کہ پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھ دی۔ اب جو اس پر مینار بناؤں تو وہ ٹیڑھا ہی ہوگا نا۔

تجھے محبت ہو گئی کیا؟ جوتشی نے پوچھا۔

ہاں۔ بری طرح سے گھایل ہوا۔ پر میری بدقسمتی۔ اگر کسی زنانی سے گھایل ہوتا تو نپٹ لیتا کسی نہ کسی طرح، پر وہ زنانی تو وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔

ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جگن بولا۔

ارے یہی تو ہوا۔ ہنواری نے جواب دیا۔ وہ زنانی ناٹک میں بستی تھی۔ جب تک ناٹک چلتا، وہ اٹھتی بیٹھتی، چلتی پھرتی، بولتی چالتی تھی۔ ناٹک ختم ہو جاتا تو ساتھ ہی وہ بھی ختم ہو جاتی۔ پر جوتشی، میری عقل پر پتھر پڑ گئے۔ میں سمجھا کہ جو لڑکی ناٹک میں کماری بنتی ہے۔ وہی کماری ہے۔ بس جی اس کے

مکان کے پھیرے لیتا رہا۔ بڑا کھجل ہوا۔ ہنواری چپ ہو گیا۔ دیر تک وہ بیتی ہوئی باتوں کو پھر بتیاتا رہا۔

جگن سمجھ گیا کہ ہنواری پھوڑا اپنا بیٹھا اسے چھیڑنا اچھا نہیں۔ جگن خود زخم خوردہ تھا۔ اسے پتہ تھا کہ جوانی کی بھول کا زخم زندگی بھر رستا رہتا ہے اس لئے وہ بھی چپ بیٹھا رہا۔ صدیاں بیت گئیں۔

پھر ہنواری نے سر اٹھایا۔ آہ بھر کر بولا۔

اگر وہ مجھے نہ ملتی تو اچھا ہوتا۔ ملی تو ایک ہی نظر میں پتہ چل گیا کہ وہ تو رنڈی ہے۔ کماری نہیں۔ اور رنڈی بھی دو ٹکے والی۔ مردار جسکے پنڈے پر گدھوں کی چونچوں کے نشان تھے۔ بس سمجھ میں آ گیا کہ کماری اور ہے روزی اور ہے۔ اور کماری تو وجود ہی نہیں رکھتی۔ اسے کیسے ڈھونڈوں۔ وہ پھر خاموش ہو گیا۔

ٹیلے کے اردگرد کی بتیاں بجھ گئی تھیں۔ ہوا چلنے لگی تھی۔ رات نے اپنا کالا تنبو تان لیا تھا۔ مال روڈ کی فیشن پریڈ ختم ہو چکی تھی۔

صدیاں بیت گئیں وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر ہنواری نے سر اٹھایا اور اپنی ہی لگن میں گنگنانے لگا۔ پھر آہ بھر کر بولا۔ تانک میں کماری اک گیت گایا کرتی تھی۔

کا کہہ کے گھر جاؤں

وہ اپنی بھدی مگر بھیگی آواز میں۔ مکھڑے کو گنگناتا رہا۔ بس یہ گیت جب وہ گاتی تو سمجھو میں مر جاتا تھا۔ روز تانک دیکھتا، روز مرتا۔ پھر اک دن تانک یہاں سے چلا گیا اور جاتے ہوئے مجھے یہ بول دے گیا۔ دو سال میں یہ بول گنگناتا پھرا۔ پاگلوں کی طرح گلیوں میں۔

ایک دن جب میں تھک کر بنگلے کی ایک کھڑکی کے نیچے ستا رہا تھا تو کیا سنتا ہوں بنگلے میں کوئی یہی بول گنگنا رہی ہے۔ سن کر میں تو پاگل ہو گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے کماری میں جان پڑ گئی ہو۔

بنگلے کے چوکیدار سے ملا۔ پتہ چلا کہ بنگلے میں کوئی وزیر اور اس کی بیگم رہتے ہیں۔ میں نے چوکیدار کی منتیں کیں کہ ایک بار مجھے بیگم سے ملا دے۔ وہ نہ مانا۔ پھر میں نے اس کی مٹھی گرم کی اور وہ مان گیا۔

بیگم باہر دروازے پر آ گئی۔ غصے میں بولی۔ کون ہے تو اور کیا چاہتا ہے؟۔ میں نے کہا۔ بیگم صاحب، غصہ نہ کھائیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا۔ ابھی ابھی جو گیت آپ گنگنا رہی تھیں، میں اس گیت کا دیوانہ ہوں۔

پھر میں کیا کروں، وہ غصے میں بولی۔

جو تو کبھی کبھی یہ بول گنگنا دیا کرے تو میرا جیون سپھل ہو جائے۔ غصے میں وہ لوٹ جانے کے لئے مڑی تو میں نے منت کی۔ میں نے کہا۔ دیکھ میں بنگلے میں نہیں آؤں گا۔ باہر کھڑکی تلے بیٹھ کر سن لیا کروں گا۔ تیری مہربانی ہوگی۔ تو صرف اک بار گنگنا دیا کر روز کے روز۔ حسنہ نے میری بات کا جواب نہ

دیا۔ اسکا نام حسنہ تھا۔ پورا ایک ہفتہ میں نے اسکی کھڑکی کے نیچے بیٹھ کر گزار دیا۔ لیکن اس نے مجھے گھاس نہ ڈالی۔

ہنواری نے لمبی آہ بھری۔ بولا۔ پھر اسے مجھ پر ترس آ گیا۔ ایک روز وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی اور کاگو لے گھر جاؤ، گنگنانے لگی۔ اتنا بھیگ کر گایا کہ میرا دل ڈوب گیا۔

پھر یوں ہوا کہ جب بھی میں وہاں پہنچتا۔ کھڑکی بجا دیتا اور وہ مجھے گیت سنا دیتی۔

پھر وہ کھڑکی کھول کر مجھ سے باتیں کرنے لگی اور ایک دن جب وڈیرا شہر سے باہر گیا ہوا تھا اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ باتیں کرتی رہی۔ اس روز مجھے پتہ چلا کہ وہ بیگم نہیں ہے۔ وڈیرے نے اسے گھر ڈال رکھا ہے۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ جی چاہا کہ اسے کچھ دوں۔ دو دن شہر میں گھوم پھر کر میں نے اسکے لئے ایک ہار خریدا۔

ہار کو دیکھ کر حسنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولی، نہ ہنواری تُو تو ایسے نہ کر جیسے دوسرے مرد کرتے ہیں۔ تو پہلا مرد ہے جس نے مجھے دیکھا نہیں۔ محسوس کیا ہے، جانا ہے، تو نے اس حسنہ کو جانا ہے جسے کسی مرد نے بھی نہیں جانا تھا۔ تُو نے تو مجھے یہ بات بھلا دی ہے کہ میں بکاؤ مال ہوں۔ تو مجھے تحفے دیتا اچھا نہیں لگتا۔

جوتشی، ہنواری بولا۔ دو مہینے ہم ملتے رہے، روز کے روز، وہ بھی کیا دن تھے۔ آہ بھر کر پھر خاموش ہو گیا۔

ایک دن وہ بڑے پیار سے کہنے لگی۔ ہنواری، کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہے۔ تجھے مجھ میں کیا نظر آتا ہے؟

میں نے کہا، کچھ نظر آتا ہی ہے تو نثار ہو رہا ہوں۔

بولی، دیکھ ہنواری، میں وہ نہیں ہوں جو تجھے دکھتی ہوں۔

میں نے کہا۔ کیوں نہیں ہے وہ۔ تو۔

بولی، صرف میں ہی نہیں۔ کوئی عورت بھی وہ نہیں ہے جو دکھتی ہے۔ پر کیوں؟ میں نے پوچھا۔

مجھے نہیں پتہ کیوں۔ عورت دکھن پر مجبور ہے۔ کوئی اس کے اندر لٹھ لئے بیٹھا ہے۔ کہتا ہے دکھ۔ اکتائی ہوئی بیٹھی، خود کو نہ دکھانا چاہے۔ پھر بھی دکھنے پر مجبور کر دی جاتی ہے اور اکیلی بیٹھی ہو تو بھی زبردستی ہونٹوں پر مسکان آ جاتی ہے۔

پھر جب وہ آخری بار مجھ سے ملی تو کہنے لگی، ہنواری۔ تو واحد مرد ہے جو مرد بن کر مجھ سے نہیں ملا۔ مجھے دکھمن دکھن کے چکر میں نہیں ڈالا

میں نے کہا، وکھ حسنی۔ میں نے اس روز پہلی بار اسے حسنی کہہ کر بلایا تھا۔ میں نے کہا حسنی میں نے کبھی تجھے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ میں تو آنکھیں بند کر کے تیرے پاس بیٹھ جاتا ہوں اور مجھے لگتا ہے جیسے میرے قریب کوئی ہے۔ کوئی میرا ساتھ دے رہی ہے۔ گھر پر بھی جب میں بیٹھا ہوں تو "تو" ساتھ ہوتی ہے۔ میں تو کبھی اکیلا نہیں ہوا۔ ان دونوں کے جواب میں وہ بولی۔ ہنواری، "تو" تو میری ہڈیوں میں بیٹھ گیا ہے۔ پتہ نہیں میں تیرے بغیر رہ بھی سکوں گی یا نہیں۔ اگر تو دکھن دکھن کا چکر چلا دیتا تو۔ "تو" میری ہڈیوں میں نہ بیٹھتا۔

مجھے نہیں پتہ تھا کہ حسنی آخری بار مجھ سے مل رہی ہے۔ ہنواری نے آہ بھر کر کہا۔ اگلے روز میں بنگلے پر گیا تو بنگلہ خالی پڑا تھا۔ پھر آوارہ پھرتے پھرتے میں تیرے پاس آیا۔ میں نے سوچا چلو جوتشی سے پوچھ دیکھو۔ تو نے میرا حوصلہ بندھایا کہ وہ ضرور ملے گی۔ تو میں آس کی دھونی رما کر یہاں بیٹھ گیا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔

دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

دفعتاً جگن چلایا۔ نہیں، نہیں، نہیں، نہیں، جیسے اسے کسی نے زبردستی بولنے پر مجبور کر دیا ہو، ہنواری چونکا۔ کیا نہیں؟

میں بھی وہ نہیں، جگن بولا۔ جو تجھے دکھتا ہوں۔ میں جوتشی نہیں ہوں۔ مجھے نہیں پتہ کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ مجھے نہیں پتہ کہ ہاتھ کی لکیریں کیا کہتی ہیں۔ میں نے تو جوتشی کا سوانگ بھر رکھا ہے۔ میں تو لوگوں کو وہ کچھ بتاتا ہوں جو وہ سننا چاہتے ہیں۔ تیرا دل رکھنے کے لئے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ تجھے ضرور ملے گی۔ یہ سن کر ہنواری کو دھچکا لگا۔ بولا جو یہ بات ہے تو میں یہاں کس آس پر بیٹھا ہوں۔

میں بھی خود سے یہی سوال پوچھا کرتا ہوں کہ جگن جی تم یہاں کس آس پر بیٹھے ہو۔ جگن نے کہا۔ مجھے اس سوال کا کبھی جواب نہیں ملا۔ لگتا ہے ہم سب آس کی دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اس دھوئیں سے کچھ برآمد نہیں ہوگا۔ پھر بھی بیٹھے ہیں۔ جگن نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی کہانی سنانے لگا۔ بولا۔ ہنواری میں بھی دکھن دکھن کا مارا ہوا ہوں۔

اسے دیکھتے ہی میں تن من دھن سے اسکا ہو گیا۔ وہ بھی میری ہو گئی۔ ہم روز ملتے تھے۔ ایک سال کے بعد اس نے میری بات مان لی۔ وہ میری ہو گئی۔ ہم نے بیاہ کر لیا۔ ایک سال ہم اکٹھے رہے۔ یوں رہے جیسے دو بچے مل کر کھیلتے ہیں۔

پھر ایک دن وہ مجھے چھوڑ کر دوجے کے ساتھ چلی گئی۔ پیچھے ایک رقعہ چھوڑ گئی۔ لکھا تھا۔

اب میں نے جانا ہے کہ تو وہ نہیں ہے جو دکھتا تھا۔ میں نے دکھن میں بھول کی۔ میں جا رہی

ہوں۔ میرا پیچھا نہ کرنا۔ جگن خاموش ہو گیا۔ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر جگن نے بات شروع کی۔ بولا۔ ماں نے کہا۔ بیٹے، میں تیرا دو جا بیاہ کر دیتی ہوں۔ گھر بسا کر بیٹھ جا۔ میں نے کہا، نہیں۔ ماں، میرا دل ٹھکانے پر نہیں رہا۔ مجھے جانے دے۔ آوارہ پھروں گا تو شاید دل ٹھکانے لگ جائے۔ پھر گاؤں کا بابا فقیرا آ گیا۔ ماں نے اسے ساری بات سنائی، کہنے لگی، بابا۔ اسے سمجھا کہ یہ بیاہ کر لے۔ گھر بسا لے در بدر نہ پھرے۔

بابا فقیرا نے ساری بات سن کر سر جھکا لیا۔ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔ نہ بی بی اسے نہ روک۔ اسے جانے دے۔ شاید باہر جا کر پھر دیکھن دکھن کے چکر میں پھنس جائے۔ جب تک یہ دیکھن دکھن کے چکر میں نہیں پھنسے گا، آباد نہیں ہو گا۔

بابا۔ میں نے پوچھا یہ دیکھن دکھن کا چکر ہے؟

بولا۔ پتر یہ دیکھن دکھن کا چکر اک پردہ ہے۔

پردہ، کس کا پردہ؟

بولا پتر وہ جو ڈال ڈال پات پات میں دکھتا ہے، جو ذرے ذرے میں دکھتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ ہم اسے دیکھیں، اس لئے اس نے ہمیں دیکھن دکھن کے چکر میں ڈال رکھا ہے کہ ہمارا دھیان ادھر لگا رہے ادھر نہ جائے۔

اور جس کا دھیان دیکھن دکھن کے چکر سے نکل جائے اسے گیان ہوتا ہے بابا؟۔

جو دیکھن دکھن کے چکر سے نکل جاؤ تو پھر کچھ بھی نہیں رہتا۔ نہ میں رہتا ہے نہ تُو۔ نہ دکھ نہ سکھ، نہ روشنی نہ اندھیرا، کچھ بھی نہیں رہتا۔ صرف وہ رہ جاتا ہے۔ صرف وہ جگن کی بات سن کر ہنواری کی گردن لٹک گئی۔ اسے ایسے لگا جیسے کچھ بھی نہ رہا ہو۔ کچھ بھی نہیں۔

عین اس وقت روشنی کی اک کرن چمکی۔ کوئی آ رہا تھا۔ اسکے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔

بنگلے کا چوکیدار ہنواری کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بولا۔ یہ تجھے شام سے ڈھونڈ رہی ہے۔

حسنہ ہنواری کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ بولی ہنواری میں آ گئی۔ آئے بغیر رہا نہ گیا۔ مجبور ہو گئی۔ اب تو جان نہ جان۔ وہ بینچ پر بیٹھ گئی۔ بولی، میں نے خود کو بہت سمجھایا کہ نہ جا۔ کیوں؟ ہنواری نے پوچھا۔

حسنہ نے اپنا سر ہنواری کے کندھے پر رکھ دیا اور گنگنانے لگی۔

کا مکھ لے گھر جاؤں

اس کی آواز میں اتنی بھیگ تھی کہ یوں لگا جیسے ٹیلے پر بوندیاں برس رہی ہوں۔

۔☆۔

پھیلاؤ کی زیر لبی

اخبار کے تلاش گمشدہ کے کالم میں اپنی تصویر دیکھ کر سید اکبر چونکا۔ اس نے دو تین بار غور سے اشتہار کو پڑھا۔ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔

سامنے کرسی پر اس کی بیوی رئیسہ آ بیٹھی۔ گلابی جسم ریشمی پیراہن سے کرسی لبالب بھر گئی۔ خوشبو کا ایک لپٹا آیا۔ "یہ تم نے کیا کیا؟ سید!" اس نے تیوری چڑھا کر کہا۔

سید اکبر نے گھبرا کر نگاہیں پھیر لیں دوسری جانب نوراں اس کے پلنگ کی پائنتی کے پائے سے لگی بیٹھی تھی۔ اشارے کی منتظر۔ جذبہ خدمت میں بھیگی ہوئی۔

"ادھر دیکھو" رئیسہ بولی۔ "یہ گنوار لوگ، یہ ویرانہ گھر چھوڑ کر، یہ تم کہاں آ بیٹھے ہو"۔

پھر اس کی بیٹی پونی ٹیل جھلاتی ہوئی آ گئی۔ ڈیڈی ایم بورڈ ٹو ڈیتھ۔ کم ہوم ڈیڈی"۔

اس کے پیچھے عاصم تھا۔ وہ غصے میں چلا رہا تھا۔ "ڈیڈم واٹ از دس نانسینس۔ ہو یو گان آؤٹ آف مائنڈ۔"

گھر کی یادوں نے سید اکبر پر یورش کر دی۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اگرچہ کبھی کبھار ہوتا ہے لیکن ایسا ہوتا ہے۔ سید اکبر کی زندگی میں بیٹھے بٹھائے بلاوجہ ایسا ہو گیا۔

شاید یہ شام کی شرارت ہو۔ شام وقت نہیں ہوتا ایک عالم ہوتا ہے۔ ایک پراسرار فضا۔ ایسے جیسے کسی اکیلی دکھی ودھوا نے بال کھول دیئے ہوں۔ جیسے الوداع بے آواز گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ جیسے کسی بے نام اداسی نے چاروں طرف تنبو تان دیا ہو۔

وہ ایک ایسی ہی شام تھی۔ بھیگی بھیگی۔ سسکتی شام۔ اس شام کو سید اکبر نے اپنے گرد چاروں طرف

دیکھا۔اور دفعتاً محسوس کیا کہ یہ سب تو کچھ بھی نہیں۔

حالانکہ اس کے گردوپیش بھی کچھ تھا۔ ریشم سے لدی ہوئی، سونے سے پھندی ہوئی پاؤڈر سرخی سے تھپی ہوئی۔ ممتاز محل کی طرح محکم پلستر کی ہوئی، اپ ٹو ڈیٹ بیگم۔

ذہین، سمارٹ، بے چین، ہوکیٹرز ٹائپ، بگڑے ہوئے دو نوجوان بیٹے۔

لڑکے اور لڑکی کے درمیان لٹکی ہوئی ایک بیٹی۔ پھلوں، کریموں، جوسوں اور فاسٹ فوڈز سے لدے ہوئے فرج اور ڈیپ فریزرز، کاروں سے لبالب دو گیراج، نوکروں سے بھری ہوئی انیکسی، طرح طرح کے کھانوں کی خوشبو سے بھرا ہوا کچن، دعوت زدہ ڈائننگ روم، وزیٹرز کی آمد و رفت کا عادی ڈرائنگ روم۔

اس کے گردوپیش اتنا کچھ تھا۔کیا نہ تھا

سید اکبر ایک کامیاب بزنس مین تھا۔سیلف میڈ۔

اس کی کامیابی زور بازو کا نتیجہ تھی۔ زور بازو کا نتیجہ ہو تو بازو اکڑ جاتا ہے، گردن تن جاتی ہے، چہرے پر کلف لگ جاتا ہے، یہ بات بھول جاتی ہے کہ بیسیوں بازو زور لگاتے ہیں۔ لگائے رکھتے ہیں۔ لیکن زور لگتا نہیں۔ یہ احساس نہیں ہوتا کہ زور بازو میں صرف بازو کا زور نہیں ہوتا زور بازو کا احساس اللہ سے بے نیاز کر دیتا ہے خود کو خدا بنا دیتا ہے۔

سید اکبر جب گردوپیش پر نظر ڈالا کرتا تھا تو تفاخر سے اس کی گردن تن جاتی۔ اس باغ کا وہ واحد مالی تھا۔

اس نے بنجر زمین پر گلستان تخلیق کیا تھا۔ اس تخلیق کاری پر وہ اپنے ہاتھ چوما کرتا تھا۔۔۔لیکن اس شام کو سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ سب تو کچھ بھی نہیں۔ یہ خیال اس کے ذہن پر بجلی کی طرح کوندا۔ لیکن بجلی کی طرح معدوم نہ ہوا۔ الٹا قیام پکڑ گیا۔ یوں قائم ہو گیا جیسے تیل کی دھار قائم ہو جاتی ہے۔

چالیس سال پہلے جب وہ لٹا پٹا پاکستان آیا تھا۔ تو اک عام سا نوجوان تھا۔ کھاتے پیتے باعزت گھر کا نوجوان۔ جس کے پاس دو بازوؤں کے سوا کچھ نہ تھا یہاں آتے ہی وہ محنت و مشقت میں جت گیا۔

پہلے اس لئے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے پھر اس لئے کہ گزارہ ہوتا رہے۔ گزارہ ہونے لگا تو بھی وہ محنت میں لگا رہا۔ اس لئے کہ آرام دہ زندگی میسر ہو۔ آرام دہ زندگی میسر ہو گئی تو وہ اور بھی شدت سے کام کرنے لگا کہ سٹیٹس حاصل ہو۔ سٹیٹس حاصل ہو گیا تو یہ آرزو پیدا ہوئی کہ لوگ سر

اٹھا اٹھا کر دیکھیں۔ اب لوگ سر اٹھا اٹھا کر دیکھتے تھے۔

لوگ تو دیکھتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ گھر والے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ باغ تو دیکھتے تھے لیکن باغ کے مالی کو نہیں دیکھتے تھے گھر میں کسی کا احساس نہ تھا کہ کس مالی نے پسینہ بہا بہا کر وہ گل بوٹے اگائے تھے۔

بچے سمجھتے تھے کہ باغ اچھا ہے۔ خاصہ ہے۔ او کے ہے اسے ہونا ہی چاہئے تھا۔ اس لئے ہے۔

بیگم، جس نے آدھی زندگی میاں کی مسلسل مشقت کی اڑتی ہوئی دھول میں کاٹی تھی، وہ بھی ماضی کو بھول چکی تھی۔ مشقت کو، دھول کو، مزدور معمار کو وہ سمجھنے لگی تھی جیسے وہ ہمیشہ سے ایسے ہی رہتی رہی ہو جیسے کہ اب رہ رہی تھی۔ جیسے ایسا رہنا اس کا پیدائشی حق ہو

ماضی صرف سید اکبر کو یاد آتا تھا۔ کبھی کبھی۔ مگر آتا تھا۔

شاید اس لئے کہ یاد اس میں تفاخر پیدا کرتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ گھر والوں کو بھی اس تخلیق کار کا احساس ہو۔ لیکن وہ بوٹے جو چلی نہر کے کنارے اُگے ہوتے ہیں۔ وہ کیا جانیں کہ پانی کیا ہوتا ہے

کبھی کبھی اسے گھر والوں کی بے حسی پر غصہ آتا تھا۔ کبھی کبھار۔ آتا اور چلا جاتا لیکن ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا کہ وہ سب کچھ۔ اتنا کچھ دفعتاً یوں نظر آئے جیسے کچھ بھی نہ ہو۔

چند ایک روز تو وہ اس اداس کن خیال کو دباتا رہا۔۔۔ دب تو جاتا تھا۔ لیکن اتنے ہی زور سے پھر ابھرتا تھا۔

پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے کہ جب اتنا کچھ۔ کچھ بھی نہیں معلوم دینے لگے تو وہ واقعی میں کچھ بھی نہیں ہو کر رہ جاتا ہے اور جب ارد گرد کچھ بھی نہیں کا صحرا پھیل جائے تو دل صحرا نوردی پر مچل جاتا ہے۔

اس کچھ بھی نہیں کو دیکھ دیکھ کر سید اکبر کا دل اچاٹ ہو گیا اور ایک روز وہ چپ چاپ کسی کو بتائے بغیر اپنا ٹریولنگ بیگ اٹھا کر گھر سے باہر نکل گیا پھر جواسے ہوش آیا تو وہ سانگھڑ میں تھا۔

سانگھڑ ایک بے آب و گیاہ صحرا تھا جہاں سارا دن تیز ہوا چلتی تھی۔ بظاہر جس کا مقصد چاروں طرف پھیلی ہوئی ریت اڑانا اور ٹیلوں کو از سر نو ترتیب دینا تھا۔ اس صحرا میں کہیں کہیں جھگی نما بستیاں تھیں۔ چار چھ سال میں ایک بار بارش ہوتی تھی۔ پانی چھپڑوں میں محفوظ کر لیا جاتا۔ چھپڑ سوکھ جاتا تو بستی کے لوگ مراجعت کر جاتے۔

چند ایک سال پہلے سید اکبر کو پتہ چلا تھا کہ سرکار سانگھڑ میں نہر چلانے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ سروے ہو چکا ہے کسی کو بتائے بغیر اس نے سانگھڑ میں دس مربع زمین کوڑیوں کے بھاؤ خرید لی تھی۔ اس

امید پر کہ نہر چل پڑی تو لاکھوں کی املاک بن جائے گی۔ مٹھی کھوئی بستی کے قریب چار ایک کوٹھڑیاں بنوائی تھیں۔ اور ان میں مختصر سا رہائشی سامان رکھوا دیا تھا کہ بوقت ضرورت کام آئے۔

مٹھی کھوئی پہنچ کر پہلے دو دن تو سید اکبر اردگرد پھیلے ہوئے منظر کو دیکھتا رہا۔ اس کے سامنے موجیں مارتا ہوا ریت کا پھیلاؤ تھا۔ اس کچھ بھی نہیں اور کچھ بھی نہیں میں کتنا فرق تھا۔ وہ سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ کچھ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہاں تنگی تھی، مخملی تنگی، ریشمی تنگی، افراط زدہ تنگی۔ یہاں وسعت تھی۔ بے پناہ وسعت، وسیع پھیلاؤ کے اوپر پھیکا آسمان تنبو کی طرح تنا ہوا تھا۔ وہاں اس نے کبھی آسمان نہ دیکھا تھا۔ یہاں ریت کے پھیلاؤ کی ویرانی اور اداسی سے گھبرا کر نگاہ آسمان کی طرف اٹھ جاتی۔

یوں محسوس ہوتا کہ وہاں کوئی ہو۔ خوانخواہ اک امید بندھ جاتی کہ کوئی ہے۔ پھر ایک زیرلبی سنائی دیتی۔ ''میں ہوں۔ ہاں۔ میں ہوں''

سیاح کہتے ہیں کہ اگر میں کے بوجھ سے آزاد ہونا چاہتے ہو۔ اگر ذہنی کشمکش کی کھینچا تانی سے بچنا چاہتے ہو تو کسی پھیلاؤ میں جا رہو چاہے وہ پانی کا پھیلاؤ ہو، ریت کا ہو یا آسمان کا' پھیلاؤ سے رشتہ استوار رکھو گے تو دل تنگ نہ ہوگا۔ آسمان سے تعلق قائم کرو گے تو ایک امید سی بندھی رہے گی۔

دو دن میں ہی سائگمنز کے دوسرے پھیلاؤ نے اس کے ذہن سے پانی بھر بھر مشکیں پانے والے مائی کو نکال دیا۔ اس کے ساتھ ہی سب شکوے شکایت نکل گئے۔ مَیں کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اندر کا محنت کش جاگا۔ یہاں کچھ کرنا چاہئے۔ شاید ہینڈ پمپ لگ سکے' کنواں کھد سکے۔ ٹیوب ویل لگ سکے۔ اپنے لئے نہیں، سائگمنز کے لئے' ویرانہ خود کے لئے سوچنے نہیں دیتا۔

سید اکبر کی آمد پر بستی میں شور مچ گیا کہ زمین دار آیا ہوا ہے۔ بستی کے لوگ سلام کرنے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے تحفے تھے۔ کوئی اچار کا بھانڈا لایا، کوئی سوکھی سبزی کی پوٹلی، کوئی گڑ کی بھیلی۔ وہ سب غربت کے مارے ہوئے تھے لیکن ان کے چہروں پر عجیب سا سکون تھا، تشکر تھا، انداز میں بے چینی نہ تھی۔

ان کے ساتھ مائی عنداں بھی آئی۔ بولی۔ ''مینڈا سائیں۔ میں بھلا کیا دوں گی تجھے' میں تو لینے آئی ہوں۔ کوئی گولی دے مجھے' سر پیڑ سے جان چھوٹے۔ سورج چڑھتا ہے تو ٹیس پڑنی شروع ہوتی ہے۔ غروب ہونے تک چلتی ہے۔

اگلے روز مائی عنداں نے ساری بستی میں شور مچا دیا کہ شاہ صاحب کی گولی نے تو جادو کر دیا۔ پیڑ کا نام نشان نہیں رہا۔

اگلے روز بستی کی پانچ عورتیں پیڑ گولی لینے کے لئے آ گئیں۔ ایک کمر درد سے لاچار تھی دوسری کا گھٹنا دکھتا تھا تیسری کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ چوتھی پیٹ تلے کی درد کی ماری ہوئی تھی۔ یونہی مریضوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔

سید اکبر کو احساس ہوا کہ اسی طرح مریضوں کا تانتا بندھا رہا تو بکسا بھر کر گولیاں لانی پڑیں گی۔ اس لئے وہ جیپ لے کر شہر کی طرف بھاگا۔ شہر میں وہ پہلے ٹیوب ویل والوں سے ملا پھر ایک جنریٹر خریدا۔ جب وہ کیمسٹ ہول سیلر کے پاس دوائیاں خرید رہا تھا تو ماسٹر محمد اکرم مل گئے جو کسی زمانے میں اسے پڑھایا کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب اسے گھر لے گئے۔ دوائیوں کی پیٹی دیکھ کر بولے۔ اتنی ساری گولیاں؟ سید اکبر نے انہیں گاؤں کی بات سنائی۔ وہ بولے۔ بے شک یہ گولیاں بہت اچھی ہیں۔ چونکہ درد سے نجات دلاتی ہیں لیکن سید اکبر یہ طریقہ علاج تو افاقہ سسٹم ہے گولی کھاؤ پھر گولی کھاؤ اور پھر اچھے ہو جاؤ۔ اگر تم چاہتے ہو کہ مریض کو شفا ہو جائے تو یہ گولیاں کام نہ دیں گی۔

ماسٹر صاحب نے ایک پیٹی ہومیو پیتھک دواؤں کی بندھوا دی ساتھ دو کتابیں خرید دیں۔ بولے اس کتاب کو کھولنا ہر بیماری کے سامنے دوا کا نام لکھا تھا۔ اللہ کا نام لے کر وہ دوا دے دینا۔

سید اکبر ایک عقلی آدمی تھا۔ وہ کاز اور ایفیکٹ کو مانتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ محنت کے بوٹے پر کامیابی کا پھل لگتا ہے۔ دوا کی پگ ڈنڈی پر شفا کی منزل واقع ہے۔ گاؤں پہنچ کر اس نے کئی ایک دن ہومیو دوائیوں کی پیٹی کو نہ کھولا اور گولیاں ہی بانٹتا رہا۔

سید اکبر کی ماڑی میں دور دور سے مریض آنے لگے۔ مریضوں کو گولیاں دیتے ہوئے اسے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ یہ خوشی اک نئی خوشی تھی۔ دینے کی خوشی۔ شہر میں بھی اس سے لیتے تھے۔ وہ دیتا نہیں تھا۔ لے کر وہ یوں اس کی طرف دیکھتے تھے جیسے لینا ان کا حق تھا اس کا احسان نہ تھا۔ یہاں وہ لوگوں کو دیتا تھا۔ اور لینے والے احساس شکر سے بھیگی ہوئی نگاہ سے اسے دیکھتے تھے۔ اس نگاہ میں پتہ نہیں کیا کیا تھا۔ شکر گزاری، احترام، عقیدت اور دعائیں۔ وہ نگاہ اسے ایسے لگتی جیسے نگاہ نہیں بلکہ سجدہ ہو۔

سیانے کہتے ہیں، دینا ایک مشکل عمل ہے۔ جب آپ دینے لگتے ہیں تو اندر سے اک بریک لگ جاتی ہے۔ اور ہاتھ آگے نہیں بڑھتا، رک جاتا ہے۔ کیا یہ حاجت مند ہے۔ حق دار ہے۔ یہ حق دار نہیں۔ یہ تو منگتا ہے۔ مشٹنڈا ہے کام کیوں نہیں کرتا۔

دینے کے عمل میں ایک ساؤنڈ بیریئر رکاوٹ آ جاتی ہے۔ اگر یہ ساؤنڈ بیریئر ٹوٹ جائے تو پھر دینے کے عمل میں ایک لذت ایک نشہ ابھرتا ہے اور دینے والا گھر اجاڑ تماشہ دیکھنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

سید اکبر کا بیر یئرٹوٹ چکا تھا۔ پہلے وہ میٹھی کھوئی میں گولیاں بانٹتا رہا۔ پھر دور دور کی بستیوں میں جانے لگا اور نگاہوں کے بجدے اسے گھیرے میں لیتے گئے۔

پھر ایک معجزہ رونما ہوا۔ اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ یہ کیا ہوا۔ کون تھا یہ۔

ہوا یہ کہ دور کی ایک بستی میں ایک ادھیڑ بیوہ نوراں کا نوجوان بیٹا شیدا دو سال سے اپاہج تھا۔ دونوں ٹانگیں جڑی ہوئی تھیں۔ سید اکبر ماں بیٹے کو جیپ میں ڈال کر سید مازی لے آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سی گولی دے۔ وہ بے چین تھا۔ پھر اسے یاد آیا اس نے ہومیو پیتھک ادویات کی چھپی کھولی رات بھر وہ کتاب پڑھتا رہا۔ اگلے دن اس نے کتاب میں لکھی ہوئی دوا تلاش کی۔ شیشی ہاتھ میں اٹھائے باہر نکلا۔

بھورے نے ریت کے اس پھیلاؤ کو ایک عجیب نورانیت بخش رکھی تھی۔ اس نے انجانے میں آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے بھورے میں آسمان اور زمین ایک ہو چکے ہوں۔ اور چاروں طرف ایک اثبات بھری مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہو۔ اس نے نوراں کے بیٹے شیدے کے منہ میں دوا کا ایک قطرہ ڈال دیا۔ تین دنوں میں شیدے کی ٹانگیں کھل گئیں۔ شیدے کو خود یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ٹانگیں کھل گئی ہیں۔ نوراں کبھی بیٹے کی ٹانگوں کی طرف دیکھتی کبھی سید اکبر کی طرف۔

بستی میں شور مچ گیا کہ شیدا اچل پھر رہا ہے۔ چار ایک دن کے بعد شیدے نے ماں سے کہا ماں میں شہر جاؤں گا۔ کمائی کروں گا۔ ڈھیروں پیسہ تجھے بھیجوں گا۔ اب تو کسی کی محتاج نہیں رہے گی''۔ سوائے خدا کے

شیدے کے جانے کے بعد بھی نوراں سید اکبر کے ڈیرے پر رہی۔ وہ صبح اس کا ناشتہ بناتی۔ جیپ میں اس کے ساتھ بستی بستی جاتی۔ لوگوں کو گولیاں بانٹتی۔ دوپہر کو اس کا کھانا پکاتی کپڑے دھوتی اور پھر دروازے سے لگ کر کھڑی رہتی کہ کب شاہ جی کو ضرورت پڑے اور وہ اس کی خدمت میں لگ جائے۔

ایک روز سید اکبر نے پوچھا۔ ''نوراں تو اپنے گھر کیوں نہیں جاتی''؟ وہ بولی۔ ''سائیں مینڈا! اب یہی میرا گھر ہے جس نے میرے بیٹے کو جیون دیا ہے۔ اس کی خدمت میں مَیں سارا جیون بتا دوں تو بھی کم ہے۔

اس کے بعد جب بھی سید اکبر دیکھتا نوراں یا تو دروازے سے لگی ہوتی یا اس کے پلنگ کی پائنتی پر سر رکھے اس انتظار میں بیٹھی ہوتی کہ کب وہ اشارہ کرے اور وہ اسے پانی پلائے' چائے بنا کر دے۔ سید اکبر حیرت سے نوراں کی طرف دیکھتا۔ اسے ایسے لگتا جیسے نوراں بھی عقیدت کا ایک سمٹا ہوا پھیلاؤ ہو۔

گھر کے خیال نے سید اکبر کو ایک ریشمی مخملی تھیلی میں قید کر دیا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ گھبرا کر وہ باہر نکل آیا۔ باہر سرمئی ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔

سید اکبر سوچ رہا تھا کہ گم شدہ اشتہار کا جواب دے یا نہ دے۔ اسے صرف ایک فکر دامن گیر تھی۔ اس کے ذاتی اکاؤنٹ میں صرف تیس ہزار کی رقم باقی تھی۔ کیا وہ زندگی بھر اس حقیر رقم سے علاقے کے لوگوں میں دوائیاں بانٹ سکے گا۔

یاس کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ ستارے اس کی طرف اشارے کر کے ایک دوسرے کو کہنیاں مار کر ہنس رہے تھے۔ صرف تیس ہزار، صرف تیس ہزار۔ پھر آسمان کی اوٹ سے ایک گمبھیر سرگوشی ابھری۔ ہم جو ہیں۔ سارا پھیلاؤ ادب سے سمٹ کر ساکت ہو گیا۔

اس نے اچانک کمرے کی طرف دیکھا۔ نوراں سمٹ کر دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ جیسے اک ہنگامہ ساکت ہو گیا ہو۔

''تو یہاں کھڑی ہے''۔ وہ بولا۔ آ۔ اندر آ جا۔ اس نے نوراں کی بانہہ پکڑ لی۔ اسے اندر لے گیا۔ ''بیٹھ جا'' اس نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا..... ''نہیں نیچے نہیں یہاں پلنگ پر۔ نہیں سائیں مینڈا اساڈ سے برابر بیٹھوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے''۔ نوراں بولی''۔

''میری طرف دیکھ''۔ وہ بولا۔ تو میرے ساتھ نکاح پڑھائے گی کیا''؟ ایک ساعت کے لئے عقیدت کے پھیلاؤ کی دھول میں دبی ہوئی عورت نے سر نکالا۔ گالوں پر سرخی دوڑی۔ آنکھوں سے سینے کی ایک لاٹ نکلی چمکی اور پھر سے اسی دھول میں دب گئی۔ بجھ گئی۔

''نہ مینڈا سائیں''۔ مدھم آواز آئی۔ ''میں تیرے لائق نہیں ہوں''۔

سید اکبر نے اخبار اٹھایا اور ان جانے میں اسے پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

رئیسہ حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ''یہ کیا کر رہا ہے تو''۔ نوراں پلنگ کی پائنتی پر سر ٹیکے یوں پڑی تھی جیسے سجدہ میں ہو۔

-☆-

چوہا

اس بنے بجے آرام دہ کمرے میں ہم دو تھے۔ لیکن دونوں ہی اکیلے، تنہا۔ اگر ہم دونوں اکیلے اکیلے ہوتے تو یقیناً اس قدر اکیلے نہ ہوتے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ بہت دور۔ وہ مجھ سے بیزار تھی، میں اس سے بیزار تھا۔ چالیس سال ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے آئے تھے۔

چالیس سال پہلے ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی، عشق تھا۔ ایک دوسرے کے بغیر دم نکلتا تھا۔ مجھے ایک فکر دامن گیر تھی اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں کیا کروں گا۔ اسے ایک غم تھا۔ اگر ناپ نہ ہوا تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ خوش قسمتی سے بات بن گئی۔ ہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ایک پھلجھڑی سی چل گئی۔ پھر کئی ایک سال ہم محبت میں لت پت رہے۔ لت پت۔ وہ میرے لئے جیتی تھی۔ میں اس کے لئے جیتا تھا۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ آہستہ آہستہ اسے پتہ چلتا گیا کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھتی تھی کہ ہوں۔ آہستہ آہستہ مجھ پر انکشاف ہوتا رہا کہ اس کی کچھ عادتیں ناقابل برداشت ہیں۔ پھر جھگڑے شروع ہو گئے۔ کئی ایک سال ہم ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہے۔ لڑتے جھگڑتے رہے۔ یہ صورت حال اس قدر بڑھ گئی کہ لڑنے جھگڑنے کے سوا ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی سروکار نہ رہا۔

اور اب، اب ہم دونوں بوڑھے ہو چکے ہیں۔ لڑ لڑ، جھگڑ جھگڑ کر تھک گئے ہیں۔ اب اتنا تعلق بھی نہیں رہا کہ ایک دوسرے سے لڑیں۔ جھگڑیں اب ہم ایک دوسرے کو برداشت کر رہے ہیں۔ وہ مجھے گوارا کر رہی ہے۔ مجبوراً میں اسے گوارا کر رہا ہوں۔ مجبوراً۔ وہ کہتی ہے۔ اس کا تو دماغ خراب ہے۔ یہ سمجھے گا۔ میں کہتا ہوں، اس کا تو دماغ سرے سے ہے ہی نہیں۔ سمجھانے کی کوشش عبث ہے۔

یوں ہم ایک دوسرے کے ساتھ لیکن ایک دوسرے سے دور گاؤں کی حویلی میں بڑے سکون سے

زندگی بسر کر رہے تھے۔

میرے پاس اسے کہنے کے لئے کوئی بات نہ تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنے کی روادار نہ تھی۔ دن میں دو ایک بار بات کرنے کی ضرورت پڑ جاتی۔ وہ آلو چھیلتے ہوئے چاقو سے مخاطب ہو کر کہتی، آلو میں بینگن ڈال لوں۔ میں شیو کرتے ہوئے استرے سے کہتا، ڈال لو۔ اکثر بولنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ بات اشاروں کی مدد سے ہو جاتی۔ وہ بن بولے سمجھا دیتی۔ میں بن کہے سمجھا دیتا۔

اب جب سے ہم دونوں کراچی اپنے بیٹے سکندر کے گھر آئے ہیں۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ وہ چپ چاپ اپنے بستر پر بیٹھ کر کھڑکی کو گھورتی رہتی ہے۔ میں کرسی میں بیٹھ کر نیچے سڑک پر چلنے والی ٹریفک کو دیکھتا رہتا ہوں۔ کتنا سکون ہے۔ کتنا اطمینان ہے۔ کسے را با کسے کارے نہ باشد۔

پہلے ہم گاؤں میں رہتے تھے۔ تھی تو حویلی لیکن سال ہا سال سے مرمت نہیں ہوئی تھی۔ ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ سکندر سے کئی بار مرمت کے لئے کہا۔ اس نے پرواہ نہ کی۔ بات ٹال دی۔ سکندر ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ گاؤں میں زیادہ دیر نہیں رہا۔ پہلے شہر میں پڑھنے کے لئے بورڈنگ میں رہا پھر بڑا افسر بن گیا۔ بیوی بھی شہر کی ملی۔ اس نے ہم سے پوچھے بنا خود ڈھونڈ لی جیسے میں نے ڈھونڈ لی تھی اور اب اس کی محبت میں لت پت ہو رہا ہے جس طرح میں ہوا تھا۔ سکندر اور اس کی بیوی دونوں کراچی میں صاحبوں کی طرح ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ بال بچہ ہے نہیں۔ بس ایک دوسرے میں ہی ڈوبے رہتے ہیں۔

گاؤں کی حویلی کے مغربی حصے کے تین کمرے ٹھیک ٹھاک ہیں۔ وہاں ہم دونوں رہتے تھے گاؤں سے ذرا فاصلے پر، شور شرابے سے دور حویلی سے سو پچاس قدم پر سائیں دروٹ کا مزار تھا۔ ہماری کھڑکیوں سے صاف نظر آتا تھا۔ انہیں سائیں چپ شاہ بھی کہتے ہیں۔

مشہور ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کسی سے بات نہیں کی تھی۔ بس اشاروں سے ہی بات کہہ دیتے تھے۔ میں پیروں فقیروں کی نہیں مانتا۔ لیکن دو ایک بار میں اتا پتا لگانے کے لئے مزار پر گیا تھا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کر سائیں جی کا اصل نام۔ دڑ۔ وٹ۔ تھا۔ جو غلط العام ہو کر دروٹ بن گیا۔ سائیں جی نے عمر بھر دڑ وٹی رکھی تھی۔ یہ جان کر مجھے سائیں جی سے دلچسپی ہو گئی۔ اس لئے کہ ہم بھی سائیں جی کی طرح دڑ۔ وٹی۔ زندگی بسر کر رہے تھے۔

مزار پر ایک شخص باقاعدہ حاضری دیتا تھا۔ اور جھاڑ پونچھ میں لگا رہتا تھا۔ اس کا نام فضلا تھا۔ فضلا شہر میں رہتا تھا۔ مگر جب بھی چھٹی ملتی مزار کی طرف چل پڑتا۔ مجھے فضلے پر بڑا ترس آتا ہے۔ بے چارہ احمق خواہ مخواہ سائیں کی لگن لگائے بیٹھا ہے۔

پھر ہم دونوں۔ میں اور میری بیوی میں چوہے کی بات چل نکلی۔ ایسی چلی، ایسی چلی کہ سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ پتہ نہیں کیا ہوا، نہ وہ، وہ رہی نہ میں، میں رہا۔ چوہے کی بات ابھی چل ہی رہی تھی کہ سکندر آ گیا اور وہ ہمیں زبردستی کراچی لے آیا۔

کراچی میں تین چار ہفتے تو ہم جگہیں دیکھنے میں مصروف رہے۔ ہوا بندر، منگھو پیر، کیماڑی اور پتہ نہیں کیا کیا۔ لیکن آخر جگہیں ختم ہو گئیں اور ہم اس نئی نئی انڈے کی طرح چمکتی ہوئی فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔

سکندر اور اس کی بیگم صبح اپنے اپنے دفتر چلے جاتے شام کو کوئی پارٹی یا ڈنر ہوتا۔ گھر میں صرف ہم ہوتے یا نوکر ہوتے۔

پھر وہ نئی نئی تنہائی کھلنے لگتی۔ وہ کمرے کی سجاوٹ، وہ آرام، وہ صبح و شام، وہ تکلف، وہ رکھ رکھاؤ، وہ سب کچھ اک بوجھ بن جاتا۔ دم گھٹنے لگتا۔ گاؤں میں یہ بات نہ تھی۔ وہاں تنہائی تو تھی پر دم نہیں گھٹتا تھا۔ وہاں ہم دونوں اس قدر اکیلے نہ تھے۔ بے زاری اتنی گاڑھی نہ تھی۔

گاؤں میں وہ میرے لئے چائے بناتی تھی۔ کھانا پکاتی تھی، میں کبھی کبھار بازار سے سودا لے آتا۔ کراچی میں نہ کھانا پکانے کی بات تھی نہ سودا لانے کی۔ اس لئے ہم ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہو گئے تھے۔ میں سارا دن برآمدے میں بیٹھ کر نیچے چلتی ہوئی شاہراہ کا نظارہ کرتا رہتا۔ وہ پتہ نہیں اندر بیٹھی کیا کرتی رہتی۔

ایک دن جب میں سڑک کا نظارہ کر رہا تھا تو اس کی آواز سنائی دی۔ بولی شہروں میں چوہے نہیں ہوتے کیا۔ میں نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔ وہ ٹائیلوں کے فرش پر نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی جیسے مجھ سے نہیں بلکہ ان سے پوچھ رہی ہو۔

چوہے کی بات سن کر میرا دل ڈوب گیا۔ لو یہاں بھی چوہا آ پہنچا۔ کتنی مشکل سے گاؤں میں اس سے جان چھڑائی تھی۔ ہوتے ہوں گے۔ میں نے سڑک سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر اس کی آواز آئی۔ یہاں تو چوہا نہیں آیا کوئی۔

یہاں نہیں آیا تو میں کیا کروں۔ یہ کیا میرا قصور ہے۔ مجھے غصہ آ گیا۔ مڑ کر دیکھا۔ عابدہ گملے پر جھکی ہوئی تھی یوں جیسے یہ سوال اس نے گملے سے کیا ہو۔

میں نے اپنے سلیپر کو مخاطب کر کے کہا۔ چوہا یہاں ٹائیلوں میں بل کیسے بنائے۔ کمرے میں دیر تک خاموشی طاری رہی۔

پھر وہ چھت سے مخاطب ہو کر بولی۔ بے شک بل نہ بنائے پر آئے تو سہی۔

اس پر مجھے بہت غصہ آیا۔ اس عورت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ جب گاؤں میں تھی تو کہتی تھی چوہا کیوں آتا۔ اب کہہ رہی ہے چوہا کیوں نہیں آتا۔

گاؤں میں چوہے کی بات اچانک چل پڑی تھی۔ ہوا یوں کہ گاؤں میں ایک رات میں جاگا تو دیکھا کہ عابدہ چارپائی پر گٹھڑی بن کر بیٹھی ہے۔ میں نے سوچا چلو بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے۔ اپنا کیا جاتا ہے۔ پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

کیا ہوا، میں نے پوچھا۔

خوف زدہ آوز میں بولی۔ چوہا ہے۔

اس پر مجھے غصہ آ گیا۔ چوہا ہے تو پڑا ہو۔ گاؤں میں چوہا تو ہوگا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ رضائی لی اور پھر سے سو گیا۔

دوبارہ جاگا تو دیکھا کہ وہ جوں کی توں بیٹھی ہے۔

سوتی کیوں نہیں۔ میں نے کہا۔

نیند نہیں آتی۔

کیوں نہیں آتی؟

ڈر لگتا ہے۔

ڈر کیسا؟

چوہا جو ہے۔

کیا کرے گا چوہا؟

کاٹ لے گا۔

لاحول ولا قوۃ۔ یہ محترمہ سمجھتی ہے کہ اس کا گوشت اس قدر لذیذ ہے کہ چوہا اسے کاٹنے کے لئے اتنی دور سے چل کر آیا ہے۔

اگلے روز اس نے مجھے ایک سوراخ دکھایا، کہنے لگی۔ چوہا یہاں سے آتا ہے۔ میں نے اس سوراخ کے مطابق ایک پتھر تلاش کیا اور ہتھوڑے سے پتھر کو اس سوراخ میں ٹھونک دیا۔ لو میں نے اسے مخاطب کئے بغیر کہا۔ اب چوہا نہیں آئے گا۔

رات کو اس نے مجھے جگا دیا۔ بولی چوہا تو آیا ہوا ہے۔ ذرا سنو تو۔

میں نے سنا۔ واقعی ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی۔

اگلے دن اس نے ایک اور سوراخ ڈھونڈ لیا بولی، یہاں سے آتا ہے۔ آٹھ دس دن ہم سوراخ

ڈھونڈتے اور بند کرتے رہے۔ اس کے باوجود چوہا آتا رہا۔

پھر میں نے ایک ترکیب سوچی۔ میں نے کہا۔ دیکھ چوہا تجھے کاٹنے کے لئے نہیں آتا بلکہ کچھ کھانے کے لئے آتا ہے۔ اگر ڈیوڑھی میں کھانے کے لئے کوئی چیز رکھ دی جائے تو وہ نہ تو باورچی خانے میں جائے گا نہ ہمارے کمرے میں آئے گا۔

اس نے میری بات مان لی۔ دو تین دن وہ سارے گھر میں بڑبڑ کرتی پھری۔ چوہا کون سی چیز خوشی سے کھاتا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ چوہا کیا کھاتا ہے اس لئے میں خاموش رہا۔ تیسرے دن پتہ نہیں وہ کہاں سے سن آئی کہ چوہا پنیر بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ روز وہ رومال میں دہی باندھ کر لٹکا دیتی تا کہ شام تک پنیر تیار ہو جائے۔

اگلے روز صبح سویرے وہ دوڑی دوڑی آئی۔ بولی، چوہے نے سارا پنیر کھالیا ہے۔ اس کے بعد جب بھی میں باہر نکلتا تو ڈیوڑھی میں چوہے کی تھالی کو غور سے دیکھتا کہ چوہے نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ رات کو آنکھ کھلتی تو کان لگا کر آواز سنتا رہتا کہ چوہا ٹک ٹک کر رہا ہے یا نہیں۔

دس پندرہ دنوں کے بعد عابدہ منہ لٹکائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ بولی، چوہا نہیں آیا۔

چوہا نہیں آیا؟ میرے منہ سے نکل گیا۔ کیوں نہیں آیا؟

دیکھ تو، وہ بولی۔ روٹی اور پنیر ویسے ہی پڑے ہیں تھالی میں۔

میں اٹھ کر ڈیوڑھی میں گیا۔ دیکھا تو چوہے کی تھالی پر ایک چڑیا بیٹھی ٹھونگے مار رہی ہے۔ میں نے عابدہ کو آواز دی۔ یہ دیکھو چوہے کا پنیر چڑیا کھا رہی ہے۔

وہ دروازے میں آ کھڑی ہوئی، بولی۔ کھانے دو بے چاری بھوکی ہے۔

اس کے بعد روز صبح عابدہ مجھے آواز دیتی۔ چوہا آج بھی نہیں آیا۔ انہی دنوں سکندر آ گیا اور زبردستی ہمیں کراچی لے آیا۔

کراچی میں آنے کے بعد میں چوہے کو بالکل بھول چکا تھا۔ اس روز اچانک اس نے چوہے کی بات چھیڑ کر مجھے پریشان کر دیا۔ دراصل میں اس بات پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ گاؤں میں اس نے چوہے کی بات چلا کر مجھے احمق بنایا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چوہے کی بات کا جواب نہیں دوں گا۔

دو روز وہ کسی نہ کسی بہانے چوہے کی بات کرتی رہی مگر میں نے جواب نہ دیا۔ تیسرے دن واپس گاؤں جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ سکندر نے بڑی کوشش کی کہ وہ رک جائے لیکن وہ نہ مانی۔ اگلے روز ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔

راستے میں وہ بار بار اپنے آپ سے کہتی رہی۔ چوہا ہماری راہ دیکھ رہا ہوگا۔ لیکن میں نے جواب

نہ دیا۔

اگلے روز ہم ریل گاڑی سے سٹیشن پر اترے جہاں سے تانگہ پر بیٹھ کر گاؤں جانا تھا۔ تو وہاں فضلا مل گیا۔

میں نے کہا۔ فضلے تو کہاں سے آ رہا ہے؟

وہ بولا۔ شہر سے آیا ہوں۔ سائیں جی کی حاضری دینے گاؤں جا رہا ہوں۔

میں نے کہا۔ فضلے تو سائیں وروٹ کو مانتا ہے کیا؟

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بولا۔ میں نے سائیں کو دیکھا ہی نہیں تو ماننا کیسا؟

پھر تو مزار پر حاضری کیوں دیتا ہے۔ باقاعدہ؟ میں نے پوچھا۔

اس میں ایک بھید ہے۔ وہ بولا۔

کیا بھید ہے؟ میں نے پوچھا۔

بس اتنا سا بھید ہے۔ فضلے نے کہا کہ دھیان خود سے ہٹا کر دوجے پر لگا دو چاہے وہ پیر ہو فقیر ہو یا چوہا ہو۔

چوہا ہو۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

ہاں وہ بولا۔ چاہے چوہا ہو اور پھر معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔ بولا آپ چلیں چوہدری جی۔ میں نذر نیاز لے کر گاؤں پہنچ جاؤں گا۔

تانگہ چلنے لگا تو میں نے سوچا تانگا والے سے کہا ذرا رک جا۔ اور پھر بے سوچے سمجھے بولا عابدہ۔

عابدہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کتنے سالوں بعد میں نے نام لے کر اسے بلایا تھا۔ میں نے کہا عابدہ، اس کے لئے کچھ لے جائیں یہاں سے۔

اس کی آنکھوں میں تبسم کی ایک لہر جھلکی۔ بولی، میں لے آئی ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے تھیلے سے ولائتی پنیر کا ایک ڈبہ نکالا۔ اور فکرمند آواز سے بولی۔ سکندر کے ابا، وہ ولائتی پنیر کھا لے گا کیا؟

۔☆۔

بوتل کا کاگ

وہ چہرہ اسے ہانٹ کر رہا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے وہ چہرہ اس کے سامنے معلق ہو جاتا۔ اس چہرے کی عجیب خصوصیت تھی۔ دیکھ کر محسوس ہوتا جیسے کوئی عظیم واردات بیت گئی ہو۔ اور چہرے پر اپنے نقوش چھوڑ گئی ہو۔

وہ اپنے البم کھول کر بیٹھ جاتی۔ ان البموں میں دنیا کے بڑے مصوروں کے بنائے ہوئے چہرے تھے۔ شدت سے سوجے ہوئے چہرے، غصیلے چہرے، دہشت گردی سے اٹے ہوئے چہرے، سفاک چہرے، پراسرار چہرے۔

وہ بار بار ان البموں کے صفحے الٹتی لیکن ان میں کوئی چہرہ اس نوعیت کا نہ تھا۔ یہ چہرے فرد کی کسی نفسی کیفیت کا اظہار کرتے تھے لیکن وہ چہرہ اس بات کا غماز تھا کہ اس پر کیا کچھ بیت گیا ہے۔

اس چہرے کی آنکھیں لال سرخ تھیں جیسے دو پیالیوں میں خون چھلک رہا ہو۔ اس کے باوجود آنکھوں کو دیکھ کر خوف طاری نہ ہوتا تھا۔ ان آنکھوں میں عجیب سی مستی تھی۔ بے نیاز مستی۔ صرف آنکھوں ہی نہیں چہرے کے بند بند میں مستی یوں رچی بسی ہوئی تھی جیسے گندھے آٹے میں پانی رچا بسا ہوتا ہے۔

البموں سے مایوس ہو کر وہ باہر لان میں جا بیٹھتی اور سڑک پر آتے جاتے چہروں کو دیکھنے لگتی۔ شہری چہرے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں۔ ذہانت، مصروفیت اور دکھاوے کی چمک کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ عورتوں کے چہرے میک اپ نے ڈھانپ رکھے ہوتے ہیں۔ افسروں کے چہروں پر ڈرائنگ رومیت کے پس منظر پر سٹینس کے احساس کا غلاف چڑھا ہوتا ہے۔ متمول لوگوں کے چہرے تو بالکل سپاٹ ہوتے ہیں۔ ان پر افلوئنس کی پھٹکار پڑی ہوتی ہے۔ نوجوانوں کے چہروں زندگی تو ہوتی

بے لیکن بے چینی اور سوہاٹ کی مدد جزر انہیں گرگٹ بنا دیتی ہے۔

سڑک سے مایوس ہو کر وہ مزدور پارک کی اس بینچ پر جا بیٹھتی جو تین فیکٹریوں کے عین سامنے لگا ہوا تھا۔ فیکٹریوں میں چھٹی ہوتی تو سائیکلوں پر سوار چہروں کا اک ہجوم سامنے سے گزرتا۔ وہ چہرے اصلی تھے۔ ملفوف نہ تھے لیکن وقت یہ تھی کہ ہجوم چہرے کی انفرادیت مسخ کر دیتا ہے۔ چہرہ ایک ایسا دروازہ ہے جو اکیلے میں کھلتا ہے۔ دو کیلے میں بند ہو جاتا ہے

اس کی خواہش تھی کہ دیہات میں جا کر چہروں کا مطالعہ کرے۔ شاید دیہات میں وہ چہرہ مل جائے جس نے اسے اس شدت سے متاثر کیا تھا۔ لیکن دیہات میں جانے کا اسے کبھی موقعہ نہ ملا تھا۔

ایمی کو زندگی میں دو جنون تھے۔ ایک تو وہ سیماب ذہن تھی۔ بند بوتل میں طوفان چلتا تھا۔ یہ دور جدید کی بخشش تھی۔ دوسرے اسے چہروں کا خبط تھا۔ یہ درس و تدریس کی دین تھی۔

یونیورسٹی میں اس نے نفسیات میں ایم ایس سی کیا تھا۔ پرسنیلٹی سے متاثر ہوتی تھی۔ سمجھتی تھی کہ انسانی شخصیت عظیم تخلیق ہے۔ اور اسی وجہ سے اس نے پورٹریٹ پینٹنگ کو ہابی بنا لیا تھا۔ کہتے ہیں فیس از دی انڈکس آف مائنڈ۔ ایمی کو اس کہاوت سے اتفاق نہ تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ چہرے کو ذہن کی نسبت پرسنیلٹی سے زیادہ تعلق ہے۔ اس لئے چہرے کو دیکھ کر پرسنیلٹی کی عظمت اس بات میں ہے کہ وہ پیرا ڈاکس کا مجموعہ ہوتی ہے۔ تضاد ہی تضاد اور اس کے باوجود اکائی۔

ایمی کو دوسری لگن ایک حسرت تھی۔ اسے یہ شکایت تھی کہ زندگی میں کچھ ہوتا نہ تھا صبح ہوتی شام ہو جاتی پھر صبح ہوتی اور شام ہو جاتی مگر کچھ بھی نہ ہوتا۔ وہی روکھی پھیکی روٹین یہ کرو، یہ نہ کرو۔ یوں کرو یوں نہ کرو والے تلقین شاہی ابا۔ وہی جذبات کے گاڑھے شیرے سے لت پت۔ بچوں سے جی جی اور میاں سے جی جی کرنے والی امی۔ صبح شام نمازیں پڑھنے والی میاں کے قدموں میں جنت ڈھونڈنے والی اور پیروں فقیروں کی درگاہوں پر حاضری دینے والی ماں سے بھلا کیا بات کی جا سکتی ہے۔

ایک چھوٹا بھائی تھا جو بریک ڈانس کا شیدائی تھا۔ سارا دن وی سی آر پر انگریزی گانے سنتا رہتا۔ سُر کا اندھا۔ تال کا رسیا۔ سارا دن جسم کو تال پر جھلاتا رہتا۔ ''دھن دھن نا'' جرک کرتا ہوا آتا۔ ''تن تن نا'' بدن تھرکاتا ہوا چلا جاتا۔ جو ہر وقت جسم کا جھنکنا چھنکاتے رہتے ہیں۔ ان سے کوئی بات ہو سکتی ہے کیا۔ اور چھوٹا بھائی تو ویسے بھی آؤٹ آف کوئسچن ہوتا ہے۔

ایمی کی آرزو تھی کہ کچھ ہو جائے۔ خواہش شدید تھی لیکن کچھ کے بارے میں تخیل مبہم تھا۔ بس ہو جائے۔ کچھ بھی ہو، کیسا بھی ہو، ہو جائے۔ دن چڑھتا۔ غروب ہو جاتا۔ مہینہ آتا چلا جاتا۔ یونہی سال بیت جاتا اور کچھ بھی نہ ہوتا۔

ان کا گھر، گھر نہیں تھا۔ ایک سمندر تھا جس میں دور دور چار جزیرے واقع تھے ایک الماری تھی جس میں چار بند بوتلیں دھری ہوئی تھیں، ایک دوسرے سے بیگانہ۔ ایک دوسرے سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ گھر تو ہانڈی کے مصداق ہوتا ہے بوٹیاں، سبزی، مصالحے شوربہ، سب ایک ہی برتن میں ملے جلے ہو تے ہیں۔

ایمی کی کوئی سہیلی بھی نہ تھی۔ چار ایک بنا دیکھی تھیں۔ بیٹھ کر گھنٹوں کپڑا، میک اپ، ہیر سٹائل کی باتیں کون سنے۔ وہ تو سمجھتی ہیں کہ لڑکی کی زندگی میں ایک ہی واقعہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔...... بیاہ۔ ایمی کو بیاہ کا چاؤ نہ تھا۔ بیاہ تو مون شائن ہوتا ہے۔ چار دن کی چاندنی اور پھر عمر بھر کی بوریت۔ دراصل ایمی نائٹ رائڈر جیسی فلموں پر پلی تھی۔ وہ دھماکے کی خواہاں تھی۔ کوئی فٹ فٹ قسم کا دھماکہ۔ کوئی وزا، وزا، روم۔ ااا اور پھر فضا میں اڑتے ہوئے ٹکڑے کوئی پستول والا ڈاکو جو اغوا کر کے بالو ں سے گھسیٹتا ہوا غار میں لے جائے۔ کوئی ایسا واقعہ جو اسے انڈے کی طرح پھینٹ کر رکھ دے۔

ایمی ایک بند بوتل تھی جس کے اندر ایک طوفان چل رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ باہر بھی ایک ایسا ہی طوفان چلے اور دونوں طوفان ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جائیں۔

رومان سے اسے چنداں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو اک فیشنی پاس ٹائم ہوتا ہے۔ یونیورسٹی میں وہ رومان کے نمونے دیکھ چکی تھی۔ چار ایک لڑکوں نے اسے اڑو سنے کی کوشش کی تھی جیسے وہ کٹی ہوئی پتنگ ہو۔

ایک تو حامد تھا۔ کبوتر سی آنکھیں۔ دل پر ہاتھ، ہونٹوں پر آہ۔ جیب میں منتخب شعروں کی کاپی۔ وہ پیچھے پیچھے چلنے والا تھا۔ پورا ایک سال وہ اس کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ جب بھی ایمی کو پتہ چلتا کہ وہ پیچھے پیچھے آرہا ہے تو اسے غصہ آجاتا۔ یہ کیا حرکت ہے کہ پیچھے پیچھے چلو۔ سامنے کیوں نہیں آتا۔ رستہ کیوں نہیں روکتا۔

مرد تو وہ ہوتا ہے جس میں جھپٹ ہو۔ یہ تو نرا الف لف ہے۔ پلپلا کیڑا۔ پھر وہ جلیل تھا۔ اس کی آنکھوں میں چھیڑ نہ تھی۔ بات بات پر ٹھٹھا ہنستا۔ ہنستا تو آنکھوں سے پھوار اڑتی۔ ہر راہ چلتی کو چھیڑتا تھا۔ لیکن بڑے مہذب انداز میں۔ تہذیب سے بھیگی ہوئی چھیڑ بھی کیا چھیڑ ہوتی ہے بھلا۔ بھڑ کا ڈنک نکال دو تو باقی کیا رہ گیا۔ نری بھوں بھوں۔

پھر کچھ ڈرائنگ روم یے تھے۔ سوٹ ٹائی۔ شوشائن۔ جنٹلمین۔ سلف کالر۔ ان کا رومان محفل تھا جو اپنے لرائس اور برتاؤ کے دھیان میں ڈوبے ہوں۔ میں کیسے لگتا ہوں میں کھوئے ہوئے ہوں۔ وہ دوسرے کو کیسے توجہ دے سکتے ہیں بھلا۔

پھر وہ جا جاتا تھا کسی ماجھے کا بھائی ہوگا۔ بات کم شور زیادہ۔ بات بات پر قہقہہ۔ قہقہہ کم کم ٹھاٹھا زیادہ آوازیں کستا۔ چیختا چلاتا۔ نعرے لگاتا۔ سٹوڈنٹ کم لیڈرز زیادہ۔ جلوسی انداز لیکن لڑکی کو دیکھ کر اس کا اپنا جلوس نکل جاتا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے۔ بری طرح سے لڑکی کانشس تھا۔ یونیورسٹی میں سبھی لڑکی کانشس تھے۔ کیا طلبا، کیا پروفیسر۔ بات ایک ہی تھی۔ اظہار جدا جدا تھے۔ لڑکی آتی تو باادب با ملاحظہ۔ ہوشیار ہو جاتے۔

ایمی چاہتی تھی کوئی ایسا ساتھی ملے جو لڑکی آگہی کی حس سے بے نیاز ہو۔ جو اسے اپنے جیسا انسان سمجھے۔ لڑے، جھگڑے، گتھم گتھا ہو جائے اور احساس ہی نہ ہو کہ لڑکا ہے یا لڑکی۔

یونیورسٹی کے دور میں اگرچہ کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ لیکن ارد گرد ایک ہنگامہ تو رہتا تھا۔ تحصیل علم کے بعد اب وہ گھر میں آکر ٹھپ ہو کر رہ گئی تھی۔

یا تو لان میں بیٹھ کر چہرے دیکھتی رہتی۔ اور یا آنکھیں بند کر کے کچھ ہونے کے خواب دیکھتی رہتی۔

ایک روز جب وہ آنکھیں بند کر کے کچھ ہو جانے کا خواب بیت رہی تھی تو پیچھے آہٹ ہوئی۔

وہ چونکی۔ مڑ کر دیکھا۔ ارے۔ وہ بھونچکی رہ گئی۔ اس کے روبرو آہنی پھاٹک سے باہر ایک چہرہ معلق تھا۔ دو لال سرخ آنکھیں جیسے پیالوں سے خون چھلک رہا ہو۔ منہ سوجا ہوا۔ اس سوجن میں کرب تھا۔ کرب کا وہ مقام جہاں وہ مستی میں بدل جاتا ہے۔ کرب اور مستی آپس میں یوں گندھے ہوئے تھے جیسے پانی آنے میں گندھا ہوتا ہے۔

اس چہرے کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس پر کوئی بڑا واقعہ گزر گیا ہو۔ کوئی عظیم حادثہ جس نے شخصیت کو واقعہ ہاتھ کر کے رکھ دیا ہو۔ کوئی ایسا ہی واقعہ جیسا ایمی چاہتی تھی کہ اس پر گزر جائے۔

چار ایک دن وہ مری ہوئی چوہیا کی طرح بستر پر پڑی رہی۔ رہ رہ کر وہ چہرہ اس کے سامنے معلق ہو جاتا۔ اس کا بند بند لرز جاتا۔ وہ سوچ میں پڑ جاتی۔ پتہ نہیں اس پر کیا افتاد پڑی ہوگی جس نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ شیشے کا گلاس کرچی کرچی ہو گیا ہے مگر پھر بھی جوں کا توں جڑا ہوا ہے۔ ذرا سی ٹھوکر لگے تو ریزہ ریزہ ہو کر ڈھیر ہو جائے۔ پھر وہ چہرہ اسے ہانٹ کرنے لگا۔

مسلسل دو مہینے ایمی اس چہرے کی ڈھونڈ میں سرگرداں رہی۔ سڑکوں پر، گلیوں میں، بازاروں میں۔ سینما کے ٹکٹ گھروں پر، نمائشوں میں، ثقافتی میلوں میں۔

ایک روز اچانک اسے خیال آیا کہ کسی سے پوچھ کر دیکھوں شاید اتا پتا مل جائے۔ اس نے چوکیدار کو بلایا۔ کہنے لگی خان نے "کچھ دنوں کی بات ہے ایک فقیر آیا تھا جس کی آنکھیں لال سرخ تھی، بوٹی

کی طرح۔تم نے دیکھا تھا اسے۔''

''ہاں بیگم صاحبہ!'' وہ بولا۔'' آپ اسے دیکھ کر ڈر گیا تھا۔''

''ہاں......کون تھا وہ۔؟''

''وہ کوئی مست تھا۔شاید کسی قلندر کا بالکا ہو۔''

''وہ پھر نہیں آیا کبھی۔''

''نہیں'' یہ'' بالکا لوک اک جگہ نہیں ٹکتا۔گھومتا پھرتا رہتا ہے۔''

قلندر کا بالکا۔یہ الفاظ ایلی کے لئے مفہوم سے خالی تھے۔

ایلی کی ماں کبھی کبھی پیروں فقیروں کی بات کیا کرتی تھی۔گھر میں سب اسے ضعیف الاعتقاد سمجھا کرتے تھے اور اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

جب ایلی نے ماں سے پوچھا امی قلندر کسے کہتے ہیں تو وہ چونکی۔پھر خیال آیا شاید ایلی مذاق کر رہی ہے۔اس نے ایلی کی طرف غور سے دیکھا۔تو وہ سنجیدہ تھی۔

ماں نے کہا۔مجھے نہیں پتہ قلندر کون ہوتا ہے۔میں تو صرف سیہون شریف کے قلندر کو جانتی ہوں۔وہ بہت بڑے بزرگ تھے۔میں تو ان کے عرس پر حاضری دیا کرتی ہوں۔

''قلندر کے بالکے بھی ہوتے ہیں کیا۔'' ایلی نے پوچھا۔

''بالکل ہوتے ہیں۔'' ماں نے جواب دیا۔'' جس پر قلندر کی خاص نظر پڑ جائے وہ اس کا بالکا بن جاتا ہے۔''

دو تین دنوں کے بعد ایلی نے ماں سے پوچھا۔امی' سیہون شریف کا عرس کب ہوگا۔'' تو وہ حیران رہ گئی۔اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے۔یہ تو ان باتوں کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔کیوں خیر تو ہے تو کیوں پوچھ رہی ہے۔

اب کی بار آپ سیہون شریف جائیں تو میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ماں بکی بکی رہ گئی۔

جب وہ ماں کے ساتھ عرس پر سیہون شریف گئی تو اتنا بڑا ہجوم دیکھ کر حیران رہ گئی۔اس کے ارد گرد لاکھوں چہرے تھے۔اصلی چہرے جیتے جاگتے چہرے۔جذبے سے سرشار چہرے۔دکھاوے سے بے نیاز لگن سے بھیگے ہوئے۔

حیرت اس بات پر تھی کہ ان چہروں پر انفرادیت کے نشانات بے حد مدھم تھے۔لگن میں اس قدر سرشار تھے کہ میں کی لکیریں مدھم پڑ چکی تھیں۔ایلی نے کبھی لگن سے سرشار چہرے نہ دیکھے تھے۔وہ نفسیات کی طالبہ تھی۔سمجھتی تھی کہ چہرے پر شخصیت کے نشانات ابھر آتے ہیں۔چہرے خدوخال اور سلوٹو

ں میں "منیں" کے نقوش ہویدا ہوتے ہیں۔ زائرین کے چہروں کی لگن کی بھڑاس نکل رہی تھی۔ چاروں طرف سے عقیدت کی پھوار پڑ رہی تھی۔ "میں" کے نقوش کو "تو" لگن نے ڈھانپ رکھا تھا۔ لاکھوں آدمی ایک جذبے سے سرشار تھے۔ جذبے کی شدت دیوانگی کا عالم برپا کئے جاری تھی۔ سارا مجمع شرابور ہوا جا رہا تھا۔

فرد کے اوپر رکھ رکھاؤ کا خول اتر چکا تھا۔ ہر کوئی سپردگی اور حواگی سے جھوم رہا تھا۔ تمام تر توجہ ایک فرد واحد پر مرکوز تھی۔ خیال اور جذبے میں ہم آہنگی پیدا ہو چکی تھی۔

پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے۔ مگر ایسے ہوتا ہے۔ جب لاکھوں افراد ایک ہی جذبے سے سرشار ہوں تو ایک مقناطیسی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور انبوہ کو جھٹکے لگتے ہیں۔

مزار کے اندرونی احاطے میں بیٹھے ہوئے ایمی کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس کے اندر سے جذبے کے بھبھاکے اٹھ رہے تھے۔ بوتل میں اک طوفان مچا ہوا تھا۔

اس وقت اس کے ذہن سے قلندر کا بالکل نکل چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے وہ خود قلندر کا بالکا ہو اور قلندر کی خصوصی نظر اس کا گھیراؤ کئے ہوئے ہو۔

دل دھک دھک کر رہا تھا۔ سانس لینا دشوار ہوا جا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے کوئی عظیم واقعہ۔

دفعتہً دف پر ضرب پڑی۔ اس کے سارے وجود میں اک گونج تھرائی۔ بوتل کا کاگ اک زنانے سے اڑا۔ چھلانگ مار کر وہ بھیڑ سے باہر نکلی اور دفوں کے قریب اپنے بالوں کو جھٹکے سے کھول کر دھمال ڈالنے لگی۔

☆

ممتا کا بھید

بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ اس جگ میں کئی واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو سالہا سال کے بعد پھر دہرائے جاتے ہیں۔

مثلاً پچھلے بسنت کے مہینے میں پورنماشی کی رات کو جگماں گاؤں کے لوگ چھتوں پر چڑھ کر حیرت سے بگی پہاڑی کی چوٹی کے ویرانے پر واقع جگ ماں کے صدیوں پرانے ٹوٹے پھوٹے مندر کی گھنٹیوں کی آوازیں سن رہے تھے۔

اور گاؤں کا سو سالہ بوڑھا اوردھے چیخ چیخ کر لوگوں کو بتا رہا تھا۔ لوگو۔ آج سے ساٹھ برس پہلے بسنت کی پورنماشی کی رات کو جگ ماں مندر سے گھنٹیوں کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ پھر وہ آوازیں بند ہو گئیں اور ساٹھ سال کے بعد پھر سے گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ بھگوان خیر کرے۔ پتہ نہیں کیا بھید ہے۔

جہاں آج جگ ماں گاؤں آباد ہے وہاں سالہا سال پہلے ایک شہر آباد تھا جو راجہ شاں پرادھے کی راجدھانی تھی۔ راجہ کو عورتوں سے گھرے رہنے کا بڑا چاؤ تھا۔ اس لئے اس کے اردگرد بنی ٹھنی ہاکی چنچل عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ راجہ کی پہلی رانی بڑی حسین عورت تھی۔ لیکن جب سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا تھا، اس نے راجہ کی محفل میں حاضری دینا چھوڑ دیا تھا۔ اس پر راجہ کو بہت غصہ آیا تھا۔

ایک روز راجہ مہارانی پرن متوا کے پاس آیا۔ غصے میں بولا۔ ”مہارانی! دوجی رانیاں سب ہمارے گرد پھیرے لیتی رہتی ہیں۔ اس بات کی خواہش مند رہتی ہیں کہ ہماری توجہ حاصل کریں۔ لیکن تم ہماری محفل میں حاضری نہیں دیتی۔ کیا تجھے ہماری پرواہ نہیں؟“ رہی۔

مہارانی بولی۔ ”مہاراج! وہ جو آپ کے گرد پھیرے لیتی ہیں انہیں آپ کا لوبھ ہے۔ وہ ناریاں ہیں مہاراج! وہ اپنی آگ میں جل رہی ہیں۔ میں ناری نہیں ہوں۔ ماں ہوں۔ میں نے آپ کو جنم دیا

ہے۔ بالک کے روپ میں آپ ہردم میرے پاس رہتے ہیں۔اب میں آپکی سیوا میں حاضری دینے کی محتاج نہیں رہی۔اب جو آپ مجھ سے ملنا چاہیں تو آپ کو خود میرے پاس آنا ہوگا۔"

یہ سن کر راجہ غصے سے بھوت بن گیا۔اس نے بگی پہاڑی کی چوٹی پر ایک جھونپڑی بنوائی اور مہارانی کو دیس نکالا دے کر ایک باندی کے ساتھ اس جھونپڑی میں بھجوا دیا۔

مہارانی نے اپنی جوانی اس جھونپڑی میں اکیلے میں گزاری۔لوگوں کے دلوں میں مہارانی کی بڑی عزت پیدا ہوگئی۔اور وہ اسے جگت ماں کے نام سے پکارنے لگے۔

راجہ جب بوڑھا ہوگیا اور عورتوں نے اس کے ارد گرد پھیرے لینے چھوڑ دیئے تو دفعتاً اسے مہارانی پرن متوا یاد آئی اور وہ اپنے رویئے پر بڑا نادم ہوا۔

ایک روز وہ اکیلا پہاڑی پر چڑھ کر مہارانی کی خدمت میں جا پہنچا۔کہنے لگا" اے جگت ماتا! میں آگیا"۔

اس کے بعد راجہ عمر بھر جگت ماتا کے ساتھ جھونپڑی میں رہا۔اس نے اپنے بیٹے کو تخت پر بٹھادیا اور خود گیان دھیان میں عمر گزار دی جب جگت ماتا فوت ہوئی تو راجہ نے اس کی یاد میں وہاں ایک مندر بنوایا۔جو جگت ماں کے نام سے مشہور ہوا۔

ساری شرارت اس حادثے کی تھی جو نوشہر پر رونما ہوا تھا۔

اگر نوشہر پر حادثہ رونما نہ ہوتا تو نومان حرکت کے فریب میں نہ آتا۔

اگر نومان حرکت کے فریب میں نہ آتا تو امنا میں ممتا کا مان نہ جاگتا۔

اور اگر امنا میں ممتا کا مان نہ جاگتا تو جگ ماں کے مندر میں پورنماشی کی رات گھنٹیاں نہ بجتیں اور ممتا کا بھید نہ کھلتا۔

وہ حادثہ عام حادثہ نہ تھا بلکہ گپت حادثہ تھا۔

نوشہر میں کسی کو احساس نہ ہوا کہ ہم حادثہ سے گزر رہے ہیں کہ حادثہ ہم پر وقوع پذیر ہوا ہے۔اور ہمیں کیا سے کیا بنا گیا ہے۔عین اس طرح جس طرح برسات میں چیونٹیوں کو پر لگ جاتے ہیں۔وہ اڑنے لگتی ہیں لیکن انہیں احساس نہیں ہوتا کہ وہ اڑ رہی ہیں۔وہ سمجھتی ہیں کہ ہم حسب معمول رینگ رہی ہیں۔

پتہ نہیں اس حادثے کا محرک کون تھا بہر حال اس کا مرکز نوشہر کا گھنٹہ گھر تھا جو شہر کے عین درمیان میں ایستادہ تھا۔گھنٹہ گھر کا گھڑیال اتنا خوش آواز اور سریلا تھا کہ شہر کے ہر گھر میں اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔نوشہر کے رہنے والے ہر صبح اپنی گھڑیاں گھڑیال سے ملا لیا کرتے تھے۔

ایک روز جب وہ بیدار ہوئے۔ گھڑیاں بجا تو وہ حیران رہ گئے۔ ان کی گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے تھیں پھر کئی ایک دن مسلسل یونہی ہوتا رہا۔ روز گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے ہوتیں۔ مجبوراً انہوں نے گھڑیوں کی رفتار تیز کر دی۔ تا کہ روز روز گھڑیاں ملانے کی کوفت سے نجات ملے۔

گھڑیاں ٹک ٹکا ٹک بجنے لگیں تو ان کا اثر سارے ماحول پر ہوا۔ نبضیں تیز ہو گئیں۔ دوران خون میں شدت پیدا ہو گئی۔ دل کچھ زیادہ ہی دھڑکنے لگے۔ جذبات میں بلبلے اٹھنے لگے۔ خیالات میں گھمن گھیریاں پیدا ہو گئیں۔ آوازیں شور شرابے میں بدل گئیں۔ محبتیں چشمز میں بدل گئیں۔ خواہشوں میں مستی پیدا ہو گئیں۔ خوش بوئیں تیز بوئیں بن گئیں سری پنچم ہو گئیں۔ لے لیت سے درست ہو گئی۔ ٹمپو چڑھ گئے۔ گیت دل کی بجائے جسم کو جھلانے لگے۔ قیام معدوم ہو گئے۔ حرکت چل نکلی۔ ایمان کے ٹھیرے پانیوں میں شکوک کے چھینٹے اڑنے لگے۔

چونکہ یہ تبدیلی انفرادی نہ تھی۔ شہر کے سب لوگ اسی منڈل میں بیٹھے تھے۔ اس لئے کسی کو احساس نہ ہوا کہ کچھ ہوا ہے کہ کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ کہ شہر جو لکی چال چل رہا تھا۔ سرپٹ دوڑنے لگا ہے۔

نوشہر کے اس حادثے کو شہر کے ارد گرد واقع گاؤں والوں نے محسوس کیا۔ اگر چہ وہ شہر سے دور تھے لیکن شہر کی آوازیں ان تک پہنچتی تھیں۔ انہوں نے سنا کہ شہر جو پہلے تک تک اچھلا کرتا تھا اب ٹک ٹکا ٹک چلنے لگا ہے۔ وہ اس بات پر حیران ہوئے۔ انہیں بات سمجھ میں نہ آئی کہ شہر کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ سمجھے کہ کچھ ہو گیا ہے کچھ ہوتا جا رہا ہے۔ کچھ ایسا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ گاؤں والوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ آنکھیں شہر پر مرکوز ہو گئیں۔

گاؤں کے نوجوان ان انوکھی باتوں کو شوق سے دیکھنے لگے۔ ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شہر میں کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ ہونے والا ہے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے خوف زدہ ہو گئے۔ اللہ خیر کرے شہر میں کچھ ہونے والا ہے۔

نگی ...... پہاڑی کے نیچے اعوان حویلی میں بیگماں کی آنکھیں شہر پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ دن میں کئی ایک بار حویلی کی چھت پر چڑھ کر گھنٹوں شہر کی طرف دیکھتی رہتی تھی۔ بیگماں کے دل میں امنا کے متعلق بے نام اندیشے اٹھ رہے تھے۔ امنا اس کی بیٹی تھی جو نوشہر میں بیاہی ہوئی تھی اور ان دنوں پہلی جنائی کے لئے گاؤں آئی ہوئی تھی۔

چند ایک روز تو بیگماں شہر کی طرف تشویش بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر اس نے اپنے بڑے بیٹے حسن کو بلایا۔ کہنے لگی ''پتر یہ شہر کو کیا ہو رہا ہے؟ مجھے شہر کے تیور اچھے نہیں دکھتے''۔

حسن بولا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ شہر میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے اماں"۔
"نہ بیٹا" وہ بولی۔ "یہ ہوتا وہ ہونا نہیں۔ یہ ہوتے رہنے والا ہوتا نہیں۔ تو امنا کو سسرال لے جاتا کہ امنا پر بھی وہ کچھ ہو جائے جو نومان پر ہو رہا ہے۔ لڑکی پیچھے نہ رہ جائے۔ اگر امنا پیچھے رہ گئی تو گھر والے سے اس کا میل نہ ہو سکے گا۔ اور جو یہ اس کے ساتھ پاؤں ملا کر نہ چل سکی تو بچھڑ جائے گی"۔
"اچھا ماں اگر تو چاہتی ہے تو میں اسے شہر چھوڑ آتا ہوں۔ تو امنا کو تیار کر دے"۔ حسن نے کہا۔
امنا گاؤں کی ضیا تھی۔ وہ سراپا حسن تھی لیکن اسکا حسن شہر والیوں سے ہٹ کر تھا۔ وہ حسن جو قیام میں پیدا ہوتا ہے۔ ہر حرکت کے دوران وہ کئی ایک قیام پیدا کرتی تھی۔ کئی ایک تصویریں بن جاتیں خوبصورت پوز۔ دلکش فریم۔
امنا میں لڑکی کم کم تھی، ضیا زیادہ۔ شوخی کم کم تھی وقار زیادہ۔ بے چینی کم کم تھی خمار زیادہ۔ کالج کی لڑکیوں میں وہ الگ تھلگ نظر آتی تھی۔ جیسے چلتی فلم میں ایک سٹل آ جائے۔
ایک دن جب وہ کالج کے گیٹ پر کھڑی اپنی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ تو نومان نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے گاڑی روک لی اور دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔
پھر وہ روز اسے دیکھنے کے لئے کالج گیٹ پر رک کر انتظار کرنے لگا۔
نومان شہر کے متمول آدمیوں میں سے تھا۔ وہ کارخانے دار تھا۔ باپ فوت ہو چکا تھا۔ گھر میں صرف ماں ہی ماں تھی۔
ماں دیر سے خواہشمند تھی کہ لڑکا گھر بسا لے۔ لیکن نومان کاروبار کی طرف اس حد تک متوجہ تھا کہ شادی کرنے پر رضامند نہ ہوتا تھا۔
بیٹے نے جب ماں سے امنا کی بات کی تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ اتا پتا لگانے کے لئے خود بیگماں ..... گاؤں گئی۔ جب اسے پتہ چلا کہ امنا کا بھائی گاؤں کا چوہدری ہے۔ خاندان اچھا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے تو اس نے پیغام دیدیا اور دو مہینے کے اندر اندر نومان امنا کی شادی ہو گئی ایک سال بعد امنا امید سے ہو گئی اور پہلی جنائی کے لئے میکے آ گئی۔
بیٹے نے ہامی بھر لی تو بیگماں مطمئن ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ رات کو امنا سے بات کرے گی اور اسے شہر جانے پر آمادہ کر لے گی۔
شام کے وقت دروازہ بجا۔ بیگماں نے کواڑ کھولا تو سامنے نومان کا نوکر احمد میاں کھڑا تھا۔ احمد میاں نے کہا۔ "مجھے بڑی بیگم نے بھیجا ہے۔ میں بہو بیگم کو لینے آیا ہوں۔ بڑی بیگم نے کہا ہے امنا بی بی جیسی بھی ہوں، جس حالت میں بھی ہوں فوراً گھر آ جائیں۔ اگر آنے میں دیر کی تو پتہ نہیں یہاں کیا

ہو جائے گا۔

احمد میاں بولے۔ ''بی بی جی شہر تو حرکت کے پھیر میں آ گیا ہے۔ وہاں بگولے چلنے لگے ہیں۔ ...... کمسن گھیریوں کی زد میں آ گیا ہے۔ صاحب کے گرد کئی ایک ترت پھرت لڑکیاں گھومنے لگی ہیں۔ روز کے روز پارٹیاں ہوتی ہیں۔ کیسٹ بجتے ہیں۔ ڈسکو ہوتا ہے۔ بڑی بیگم سخت گھبرائی ہوئی ہیں''۔

احمد میاں سے متعلق انتظامات سے فارغ ہو کر بیگماں امنا کے کمرے میں داخل ہوئی۔

امنا یوں مطمئن بیٹھی تھی جیسے رس سے بھرا آم ہو۔ اس کے اطمینان میں مستی کی جھلک تھی۔ ایسی مستی جو چھلکتی نہیں۔ ایسی مستی جو صرف ممتا پیدا کر سکتی ہے۔

بیگماں بولی۔ ''بیٹی! احمد میاں تجھے لینے آیا ہے۔

احمد میاں۔۔۔ امنا بولی۔ اماں اگر وہ خود آتے تو میں چلی جاتی۔ احمد میاں کے ساتھ نہیں جاؤں گی''۔

''احمد میاں کو بڑی بیگم نے بھیجا ہے''۔ ماں نے کہا۔ ''وہ کہتی ہیں شہر میں بگولے چل رہے ہیں۔ کمسن ...... گھیریاں گھوم رہی ہیں''۔

''نہیں اماں''۔ امنا نے کہا۔ ''میں ...... کمسن ...... گھیریاں جوگی نہیں ہوں۔ میں تو تنکا تنکا ہو کر بکھر جاؤں گی''۔

''نہیں بیٹے تیری ساس نے تجھے بلایا ہے کہ جو نومان پر ہو رہا ہے تجھ پر بھی ہو جائے۔ نہیں تو تُو پیچھے رہ جائے گی۔ نومان سے تیرا ساتھ چھوٹ جائے گا''۔

''نہیں ماں''۔ وہ بولی۔ میرا ساتھ ان سے کیسے چھوٹ سکتا ہے۔ وہ تو میرے اندر ہیں ماں۔ میرے جسم کا بند بندان سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ انہوں نے میرے ہر دیئے میں ممتا کا دیپ جلا دیا ہے''۔

نہیں بیٹی تو نہیں سمجھتی۔ بیوی کا کام ہے کہ وہ میاں کے ساتھ قدم ملا کر چلے''۔

تو کیا بیوی کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی''۔ امنا بولی۔

''نہیں بیٹی''۔ بیگماں بولی۔ جو ''لبھانے کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ انکی اپنی مرضی نہیں ہوتی۔ ہم عورتوں کا کام مردوں کو لبھانا ہے۔ اگر مرد لمبے بال پسند کرتے ہیں تو ہم بال بڑھا لیں گی۔ اگر چھوٹے بال پسند کرتے ہیں تو ہم بال کٹوا دیں گی۔ اگر انہیں بھرا بھرا جسم اچھا لگے گا تو ہم ٹمیار بن جائیں گی اگر انہیں ترت پھرت اچھی لگے گی تو ہم ہڈیاں نکال لیں گی۔ پہلے وہ وفا کو پسند کرتے تھے تو عورتوں نے وفا اپنائی تھی۔ اب وہ ہرجائی پسند کرتے ہیں تو عورتیں ہرجائی ہو گئی ہیں''۔

''نہیں ماں'' امنا نے کہا۔''وہ عورتیں نہیں۔ وہ تو ناریاں ہیں جن کا کام مردوں کو لبھانا ہے۔ ناری بن کر عورت نے اپنی قدر گنوادی ہے۔ عورت تو ممتا کے لئے بنی ہے جس میں ممتا جاگ اٹھے وہ تو آپ محبت بانٹے گی۔ وہ محبت کی بھیک کیوں مانگے''۔

امنا کی بات سن کر بیگماں چلائی۔''یا اللہ میں اس لڑکی کو کیسے سمجھاؤں یا اللہ!''۔

امنا مسکرادی۔ بولی۔''ماں جسے تو پکار رہی ہے وہ تو آپ ماں ہے جگت ماں''۔

''یہ ممتا اسی کی دین ہے۔ اس نے اپنے نور سے ممتا کی ایک کرن ماں کو دان کردی ہے''۔ یہ سن کر دیر تک بیگماں یوں چپ چاپ کھڑی رہی جیسے اثر سے بھیگ گئی ہو۔

پھر جو اس نے سر اٹھا کر دیکھا دروازے پر احمد میاں کھڑا تھا۔

احمد میاں آگے بڑھا۔ بولا۔''بہو بیگم! آپ کا نوشہرجانا ضروری ہے۔ وہاں سب کچھ بدل گیا ہے۔ گھر وہ گھر نہیں رہا۔ صاحب وہ صاحب نہیں رہے''۔

امنا بولی۔''احمد میاں! اگر وہ صاحب ہی نہیں ہے جن کا مجھ سے سمبندھ ہوا تھا تو میرا وہاں جانا کس کام کا''۔

ابھی امنا بات کر رہی تھی کہ ایک شور سنائی دیا۔ وہ گھبرا کر باہر نکلے، دیکھا کہ گاؤں کے سب لوگ چھتوں پر چڑھے ہوئے تھے اور حیرت سے ...... ٹکی ...... پہاڑی کی چوٹی کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں ...... جگماں ...... مندر کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور گاؤں کا بوڑھا وردھے ...... سیس نوائے، ہاتھ جوڑے کھڑا وجدان بھری مستی میں گنگنا رہا تھا۔ دھن ہے جگ ماں۔ تو دھن ہے۔

۔☆۔

کہانی کی تلاش

تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ تھک کر چور ہو گیا تو میں رک گیا۔ وہ بھی رک گیا۔ سڑک کے کنارے ایک تھڑے پر میں بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گیا۔

مجھے اس کا ساتھ پسند نہیں۔ بڑا نکتہ چیں ہے۔ بات بات پر ٹوکتا ہے۔ لیکن وہ میری مجبوری ہے۔ میں اس سے پیچھا چھڑا نہیں سکتا۔

میں نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی۔ پاکستان کا حسین ترین شہر اسلام آباد میرے ارد گرد پھیلا ہوا تھا کیوں نا اسلام آباد پر کہانی لکھوں۔ دفعتاً مجھے خیال آیا۔

اونہوں۔ وہ بولا۔ یہ شہر ہمارا شہر نہیں ہے۔ کیوں۔ میں نے غصے سے اسے دیکھا۔ اس میں اپنوں کا رنگ نہیں ہے۔ بیگانہ ہے۔ اسلامی مملکت کا دارالخلافہ ہے بھئی۔ حرف نام کا اسلامی ہے۔ مساوات کا بیری ہے۔

ذات پات کا شوقین۔ اونچ نیچ کا مارا ہوا۔

کون سی ذات پات۔ میں نے پوچھا۔

عہدوں کی۔ گریڈوں کی۔ تم اس پر کہانی نہیں لکھ سکتے۔

کہانی تو اپنوں کی ہوتی ہے۔ بے گانوں کی نہیں۔

میں نے اسکی بات کا جواب نہ دیا۔

دیر تک ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

میری مشکل یہ ہے کہ جب تک مرکزی خیال نہ ہو میں کہانی نہیں لکھ سکتا۔ اگر کہانی کے پاس کچھ کہنے کو نہیں ہے تو کیا فائدہ۔ گونگی کہانی کو کوئی کیا کرے۔ پھر یہ بھی ہے کہ کہانی چیخ کر نہ بولے۔ لب نہ

کھولے۔ آنکھ سے بولے۔ اکھ نال گل کر گئی۔ کئی ایک دن سے میں کہانی کی تلاش میں تھا۔ کیا لکھوں، کس موضوع پر لکھوں۔ ایسی بین بجاؤں کہ سانپ نکل آئے۔

وہ ہنسا۔ بولا۔ بغل میں کٹورہ۔

کہاں ہے کٹورہ۔ میں نے پوچھا۔

اس نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ تم اس موضوع پر کیوں نہیں لکھتے۔ سارے لکھار اس پر لکھتے ہیں۔ آج کے دور کا من بھاتا موضوع ہے۔ آج کے بوٹے پر لگا ہوا پھل ہے میں نے مڑ کر دیکھا، درختوں کے پیچھے کچی آبادی تھی۔ انتظامیہ نے اسے درختوں اور دیواروں کے پیچھے چھپا رکھا تھا کہ دودھ میں مکھی کوئی دیکھ نہ لے۔

میں سڑک کے نیچے اتر گیا۔ درختوں کے جھنڈ سے دیکھا، وہاں بیس تیس جھونپڑے تھے۔ دو رویہ مکانوں کے درمیان میں کھلا میدان تھا۔ میدان میں یہاں وہاں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ لوگ بیٹھے تھے۔ حقے چل رہے تھے۔ بچے چارپائیوں کے ارد گرد دوڑ رہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔ چلا رہے تھے۔ عورتیں اوپن ایئر باورچی خانوں میں چولہوں پر ہانڈیاں چڑھائے بیٹھی تھیں۔ ہاتھ چل رہے تھے۔ چوڑیاں چھنک رہی تھیں باتیں ہو رہی تھیں۔

اے بابو! قریب ہی آواز آئی۔ دیکھا تو پاس ہی ایک بڈھا بیٹھا جوتے گانٹھ رہا تھا۔

کسی سے ملنا ہے؟ مجھے اس نے پوچھا۔

کسی سے بھی نہیں۔

پھر دیکھ کیا رہا ہے تو؟

دیکھ رہا ہوں کتنی غربت ہے۔ کتنا دکھ ہے۔

کہاں ہے دکھ۔ وہ بولا۔ یہاں تو میلہ لگا ہوا ہے۔ بابو جا۔ سارے اسلام آباد کا چکر لگا۔ گھوم پھر کے دیکھ۔ کہیں بھی ایسا میلہ نہیں لگا ہوگا۔ سب کمروں میں بند ہیں۔ نہ بول نہ بلارہ۔ بوہے بند، ہونٹ بند، دل بند۔

اور بابو یہ کچی آبادی جو تو دیکھ رہا ہے یہ آبادی نہیں ہے۔ یہ تو ایک کنبہ ہے۔ ایک کو پیڑ ہووے ہے تو دوجا دردسے ہائے ہائے کرے ہے۔ ایک کا چولہا نہیں جلے ہے تو دوجا ہانڈی میں ایک منٹھ دال اور ڈال لے ہے۔ تو غربت کو کیا سمجھے ہے بابو۔ غربت میں لوگ اک دوجے کے نیڑے آجاویں ہیں۔ امارت میں دور ہٹ جاویں ہیں۔

اور تجھے پتہ ہے بابو۔ پاکستان پر کیا بپتا پڑی ہوئی ہے ہمیں جتنے کی ضرورت تھی۔ اس سے زیادہ

مل گیا ہے۔ زیادہ مل جائے تو شر جاگ اٹھے ہے۔ فساد کے بلبلے پیدا ہو جاویں ہیں۔

تو مسلمان ہے کیا؟ بڈھے نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر تو اس کو جانتا ہے۔

کس کو۔

وہ جو سب سے بڑا بندہ تھا۔ جو اللہ کا پیارا تھا۔ اللہ نے کہا میرے پیارے۔ بول تو کیا چاہتا ہے۔ تو جو مانگے گا۔ ملے گا۔ جو چاہے گا۔ بتا امارت میں رہنا چاہے گا یا غربت میں۔ اس نے غربت مانگ لی۔ غربت میں کوئی صفت ہوگی ہی نا کہ اس نے غربت مانگی۔

مایوس ہو کر میں پھر چل پڑا۔

کہانی کی ڈھونڈ میرے سر پر جنون بن کر سوار تھی۔

چلتے چلتے میں رک گیا۔ وہ بھی رک گیا۔

میرے سامنے وہ کھڑی تھی۔

گلاب کا ایک بوٹا۔ اوپر ایک ڈوڈی۔ ادھ کھلی ادھ بند۔ ادھ گلابی ادھ ہری۔

ہونٹ بند تھے۔ آنکھیں باتیں کر رہی تھیں۔

انگلیوں سے میگنیٹک لہریں نکل رہی تھی۔

آؤ۔ وہ بولی۔ میں ہوں وہ کہانی جسے تم ڈھونڈ رہے ہو۔

اونہوں۔ مت جاؤ۔ میرا ساتھی زیر لبی میں بولا۔ اس کی کہانی تو تم سالہا سال سے لکھ رہے ہو۔

میری کہانی۔ وہ بولی۔ سبھی لکھ رہے ہیں۔ نہ جانے کب سے لکھ رہے ہیں۔ لیکن کوئی لکھ نہیں پایا۔

اگر میری کہانی لکھی جاتی تو آج میں صرف آرائش و زیبائش نہ سمجھی جاتی۔ میری حیثیت دکھن دکھن تک محدود نہ ہوتی۔ تیرے بھائی بند مجھے خوش وقتی نہ سمجھتے

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ مجھے سب باہر سے دیکھتے ہیں۔ کسی نے میرے اندر جھانک کر نہیں دیکھا۔ کسی نے مجھے نہیں جانا۔ وہ خاموش ہوگئی۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ دفعتاً اس نے سر اٹھایا اور میرے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔

میں تجھے جانتی ہوں۔ وہ بولی۔ تو ایلی ہے نا۔ میں ایلن ہوں۔ سنا تو نے۔ میں ایلن ہوں۔

اس نے ایک پوز بنایا اور یوں کھڑی ہوگئی جیسے مٹھاس اس کی اک پھوار ہو۔

مجھے ایسے لگا جیسے ورق میں لپٹی ہوئی مصری کی ڈلی ہو۔ جی میں آیا کہ منہ میں ڈال کر چوس جاؤں۔

دفعتاً میرا ساتھی بولا۔ ہوش کر میرا تو منہ ہی نہیں ہے۔ جب تھا تب جرأت نہ تھی۔ اب خالی جرأت کا جھنجھنا بجانے سے فائدہ؟

دیکھا۔ وہ بولی۔ مجھ میں دونوں روپ ہیں۔ دیوی بھی ہوں۔ ناری بھی ہوں۔ انگاروں سے بھسم بھی کر سکتی ہوں۔ سوکھے کو ہرا بھرا بھی کر سکتی ہوں۔ میں تیری کہانی ہوں۔

میرے ہوتے ہوئے تو کسی اور پر کہانی نہیں لکھ سکتا۔

میں لکھوں گا تجھ پر کہانی۔ میں نے کہا۔

رک جا۔ میرا ساتھی بولا۔ اس نے میرا بازو تھام لیا۔

بے شک یہ رنگ رس بھری کہانی ہے۔ لیکن یہ ایسی کہانی ہے جسے صرف جیا جا سکتا ہے۔ لکھا نہیں جا سکتا۔ تو جینے میں کھو جائے گا۔ لکھنے کا ہوش نہیں رہے گا۔

شام پڑ چکی تھی۔ پتہ نہیں شام اتنی اداس کیوں ہے۔ مدہم اداسی' میٹھی اداسی ایسے لگتا ہے جیسے شام نے بال بکھیر رکھے ہوں۔ چہرہ ستا ہوا ہو۔ انتظار۔ مایوسی بھرا انتظار۔

راگ ودھیا والوں نے شام کے راگ میں آگ لگا رکھی ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ وہ تو بڑے سیانے ہیں پر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے شام آگ نہیں سلگن ہے۔ مدہم سلگن جیسے دیئے میں تیل نہ رہا ہو۔ سوکھی بتی سلگ رہی ہو۔

دکان میں اندھیرا گاڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک بتی سلگ رہی تھی۔ وہ تجوری کھولے بیٹھا گن رہا تھا۔

میرا ساتھی بولا۔ رک جاؤ۔ اس سیٹھ کو دیکھ رہے ہو نا۔

دیکھ رہا ہوں۔ میں نے کہا۔

تم نے اس پر کبھی کہانی نہیں لکھی۔

اس میں کوئی کہانی ہو تو لکھوں۔

سبھی لکھتے ہیں۔

ہاں لکھتے ہیں پر وہ کہانی نہیں ہوتی۔ غم و غصے کا اظہار کہانی نہیں ہوتی۔ کہانی نعرے نہیں لگاتی۔ اودھم نہیں مچاتی۔ اشتعال پر نہیں ابھارتی۔ مزاحمت کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتی۔ کہانی تو ایک چھوٹا سا چشمہ ہوتی ہے جو دھرتی سے ابلتا نہیں۔ رستا ہے، بوند بوند رستا ہے۔

ہمدردی کا چشمہ، دکھ بھرے لگاؤ کا چشمہ، بھیگ ہی بھیگ۔

جھوٹ بولتے ہو۔ اس نے مجھے ڈانٹا۔ تمہاری کسی کہانی میں بھیگ نہیں ہوتی۔ سوکھی کا نٹھ۔

سچ کہتے ہو۔ میں اپنی کسی کہانی میں جھیک پیدا نہ کر سکا۔ قاری کو بھگو نہ سکا۔ لاکھ کوششیں کیں پر بات نہ بنی۔ بیسیوں لکھیں پر کہانی نہ لکھ سکا۔

جھک مارتے رہے۔ وہ بولا۔

نہیں جھک نہیں ماری۔

تو پھر

چمکیلی باتیں کرتا رہا۔ دکھاوے کی باتیں۔ توجہ طلبی کی باتیں، پھلجھڑیاں چلاتا رہا۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔

اپنی ڈگڈگی بجاتا رہا۔ کہانی اپنی بات نہیں ہوتی۔ وہ بولا۔ دوجوں کی بات ہوتی ہے۔ کیا تم اپنی بات کرنے سے کبھی نہیں اکتاتے؟۔

کیا مطلب؟ میں نے غصے سے پوچھا۔

اب بھی تو کہانی کے پردے میں تم اپنی بات کر رہے ہو۔ سیٹھ کی بات کیوں نہیں کرتے۔

کیوں کہتے ہو کہ اس میں کوئی کہانی نہیں ہے۔

یہ دولت کا قیدی ہے۔ دولت نے اسے ہائی جیک کر رکھا ہے۔ اس بیچارے میں تو میں بھی نہیں رہی۔ دل کی جگہ پیسہ ٹک ٹک کر رہا ہے۔ دنیا سے بھی گیا۔ خود سے بھی گیا۔ بیچارہ مظلوم اس کی مظلومیت پر کہانی لکھو۔

نہ نہ نہ نہ

کیوں۔ کیا لکھ نہیں سکتے؟

لکھ سکتا ہوں۔ پھر لکھتے کیوں نہیں۔

ڈرتا ہوں۔

کس سے ڈرتے ہو؟

ان سے ڈرتا ہوں۔ جو اسے ظالم سمجھتے ہیں۔

کھڑاک سے دکان کا دروازہ بند ہو گیا۔

وہ دیکھو۔ وہ۔ وہ چلایا۔ تیرا موضوع۔

میں نے سر اٹھایا۔ سامنے دربار جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔

نہیں ہے۔ میں نے زیر لب کہا۔ یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ یہ داتا لوگ ہیں۔ بزرگ ہیں۔ اللہ والے ہیں۔ یہ چوتھی سمت میں جیتے ہیں۔ زیادہ دیکھتے ہیں۔ زیادہ سنتے ہیں زیادہ محسوس کرتے ہیں۔

زماں اور مکاں سے بے نیاز ہیں۔ ان کا میں احترام کرتا ہوں لیکن میں ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ ان کے بارے میں میں منہ کھولوں۔ نہ نہ نہ بھائی چھوٹا منہ بڑی بات۔

تم داتا کو کیوں دیکھتے ہیں۔ بزرگ کو کیوں دیکھتے ہو۔ وہ بولا۔ کرامتوں کو کیوں دیکھتے ہو۔ معجزوں کو کیوں دیکھتے ہو۔

تم اس بندے کو کیوں نہیں دیکھتے جو داتا کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ جو اتنا عظیم تھا کہ اس نے داتا کا مرتبہ پالیا۔

سب داتاؤں کی باتیں کرتے ہیں۔ سرکار قبلاؤں کی باتیں کرتے ہیں۔ باباؤں کی باتیں کرتے ہیں۔ کرامتوں کے چھنکنے چھنکاتے ہیں۔ اس عظیم بندے کی بات کوئی نہیں کرتا جس نے انہیں بابا بنادیا۔ سرکار قبلہ بنادیا۔ سلطان الہند بنادیا۔ داتا بنادیا۔ تو اس بندے کی بات کیوں نہیں کرتا۔ اس کی آواز میں غصہ کھول رہا تھا

ہم دونوں درگاہ میں داخل ہو چکے تھے۔

ہمیں دیکھ کر درگاہ کا متولی بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ وہ بندہ تو ایک ہی ہے۔ ایک ہی ہے جسے دو جہانوں کا مالک بنادیا گیا پر وہ بندہ بن کر۔ نہ بابا بنا نہ سرکار قبلہ بنا۔ نہ داتا بنا نہ کرامتیہ بنا نہ معجزاتی بنا۔ صرف بندہ۔ صرف بندہ، صرف بندہ، صرف بندہ۔ گنبد چلایا۔

صرف بندہ، صرف بندہ۔ باہر سے یوں آواز آئی جیسے آسمانوں میں گنبد کی آواز کی گونج تھرتھرا رہی ہو۔

ساری کائنات اس گونج سے بھری ہوئی تھی۔ صرف بندہ۔ صرف بندہ۔

۔☆۔

ممتاز مفتی اور تصوف؟
* علی پور کے "ایلی" کا تصوف سے کیا رشتہ؟
* انھیں متصوفانہ افسانے لکھنے کا حق کس نے دیا؟
* مانا کہ وہ ایک اعلیٰ افسانہ نگار ہیں، ان کی تحریروں میں ادبی چاشنی ہے، ان کا ڈکشن تازہ اور منفرد ہے، وہ کہانی بُننے کے فن سے آشنا ہیں، مگر تصوف؟
* زندگی بھر انھوں نے ایسا کیا کام کیا ہے کہ انھیں تصوف کا نام لینے کی اجازت دی جائے؟
* لیکن پھر یہ خیال آتا ہے کہ ان کے متعدد افسانے جس خیال کے گرد بُنے گئے ہیں اس میں:
* تصوف کی قدیم اور آفاقی اقدار کی جھلک کیوں ہے؟
* وحدت الوجودی تجربے کے اشارے کیوں ہیں؟
* میں اور تو کی رمز بیان کرنے کی آرزو کیوں ہے؟
* کسی پراسرار، ماورائی سمت کا بلاوا کیوں ہے؟
* جسم سے روح تک کے سفر کی کتھا کیوں ہے؟
* یہ کے کا بند حسن ہے، یا بند حسن کا ہے؟
الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب